بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا

الانسان فی القرآن

یعنی

قرآن مجید کی روشنی میں انسان کے مختلف حالات اور مقامات

از ارشادات

سراج السالکین شمس العارفین حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب قدس سرہ

ساکن حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

بحسن سعی

صاحبزادہ سید محمد باقر علی شاہ صاحب حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

سنہ ۱۳۷۲ھ

کتبہ عبدالرحمٰن کیلانی

فہرست عنوانات

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا

الانسان فی القرآن

یعنی

قرآن مجید کی روشنی میں انسان کے مختلف حالات اور مقامات

از ارشادات

سراج السالکین شمس العارفین حضرت سید نور الحسن شاہ صاحب قدس سرہ

ساکن حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

بسعی

صاحبزادہ سید محمد باقر علی شاہ صاحب حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

تمام تعریف اس ذات پاک ہی کے لیے ہے جس نے اپنی الوہیت و ربوبیت کے اظہار کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ابتدا فرمائی، اور ان کو علم لدنی سے عالم فرما کر انسان کی رہنمائی کا سبب بنایا۔ اس سلسلہ کا آغاز حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کر کے ایک لاکھ چوبیس ہزار کا شجر رسالت یکے بعد دیگرے حسب ضرورت علم و کتاب اور معجزات سے بہرہ ور فرما کر ہماری رہنمائی کے لیے مرسل کیا اور اختتام نبی کریم حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوا، اور آپ کو خاتم النبیین کا لقب عطا فرما کر سلسلۂ نبوت کو تکمیل تک اور شجر رسالت کو ثمر تک پہنچا دیا۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہو گئی اس لیے آپ کے بعد ولایت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آغاز ہوا اور عنایت الٰہی سے قیامت تک یہ سلسلہ قائم و دائم رہے گا۔ چنانچہ اس دورِ ظلمات میں بھی ایسے بزرگان دین پیدا فرمائے جنہوں نے حسب ضرورت ظاہری و باطنی تعلیم سے گم گشتگان راہ کے لیے مشعلِ ہدایت و رشد روشن فرمائی، اور آج جبکہ تفرقہ بازی اور کفر و الحاد اپنے شباب پر ہے، ہمارے حضور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت مبارک میں بمصداق:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً	کیا نہیں دیکھا تو نے کہ کس طرح بیان فرمائی اللہ تعالیٰ
طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ	نے مثال کلمہ طیبہ کی مانند درخت پاکیزہ کے جڑ اس کی
وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ	مضبوط ہے اور شاخیں اس کی آسمان میں۔ دیتا ہے وہ میوہ
حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ	اپنا ہر وقت اپنے رب کے اذن سے۔ اور بیان کرتا ہے
الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ	اللہ مثالیں واسطے لوگوں کے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

(پ ۱۳ - س ۱۶)

نسبت محمدی سے معمور ہو کر علم معرفت کے بیش بہا کلماتِ طیبہ اور عالم موجودات سے لے کر عالم معروفات تک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ
الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ اِیَّاکَ
نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ اِہۡدِنَا
الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ
اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۝ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ
عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝

ترجمہ:- سب تعریف پروردگار عالمین کے لیئے ہے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ دن انصاف کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور خاص تیری مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے ۔

تشریح:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ (سب تعریف پروردگار عالمین ہی کے لیے ہے) حقیقت تعریف تمام موجودات کی خلقت اور ربوبیت کی وجہ پر اس خالق موجودات اور پروردگار

عالمین کے لیے ہی خاص ہے، خواہ وہ عالم موجودات سے ہو یا عالم محسوسات، معلومات اور معروفات سے۔ بہرحال ربوبیت کی بساط پر ظہور اور نشان کا گلدستہ ہے۔ جو توحید فعلی کے مترادف ہے اور مطابق یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝ اور وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ سراسر تسبیح خواں قالی وجہ پر اور سراسر تعریف حال کی رو سے اظہر من الشمس ہے۔ معنی شناسوں یعنی عارفوں کے لیے مشاہدہ اور یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے ماتحت بے علموں کے لیے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ کا فرمان روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ربوبیت کا تعلق ہر کہ ومہ اور ہر چیز سے پرورش کی وجہ پر یکساں ہے خصوصاً انسان خواہ کافر ہو یا مسلم، منافق ہو یا مومن، فاسق ہو یا مشرک، ولی ہو یا پیغمبر سب کے سب اس میں شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مومن کو تو نور ایمانی سے اور منافق کو نفاق سے، فاسق کو فسق سے، کافر کو کفر سے اور جاہل کو جہالت سے نسبت ہے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی کی زبردست سنت کے مطابق ربوبیّت کا تصرّف ربّ العالمین کی طرف سے جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔ اور یہ دو نوع پر منقسم ہے جسمانی اور روحانی۔ کہ دونوں وجہ پر مولیٰ کریم کی طرف سے برابر ہے۔ بلکہ دُنیوی ترقی نافرمانوں اور کافروں کے لیے زیادہ ہوا کرتی ہے لیکن روحانیت کی بساط پر ایک نقطہ بھی ان کے نصیب میں نہیں ہو سکتا۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ — جو کوئی چاہتا ہے کھیتی آخرت کی زیادہ دیتے ہیں ہم
لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ — اس کو بیچ کھیتی اس کی کے اور جو کوئی چاہتا ہے کھیتی

الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ — دنیا کی دیتے ہیں ہم اس کو کچھ اس میں سے اور نہیں
مِنْ نَّصِیْبٍ ۝ (پ۲۵ - ع۴) — واسطے اس کے بیچ آخرت کے کچھ حصہ۔

تاہم یہ تقسیم من اللہ دو وجہ پر ہے۔ ایک عوام کے لیے جس میں مومن، منافق، کافر، فاسق، سب برابر ہیں۔ کمی بیشی عین حکمت اور انتظام کی بنا پر واقع ہے۔ فرمایا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا — اور اگر کشادہ کرتا اللہ رزق واسطے سب بندوں اپنے کے
فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا — البتہ سرکشی کرتے بیچ زمین کے۔ ولیکن اتارتا ہے ساتھ
یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌ بَصِیْرٌ ۝ — اندازے کے جو کچھ چاہتا ہے۔ تحقیق وہ ساتھ بندوں اپنے
(پ۲۵ - ع۴) — کے خبردار ہے دیکھنے والا۔

یہ تقسیم انتظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام مخلوق کے لیے ہے۔ پھر بھی کئی قسم کے فساد، زبردستیاں اور ظلم ظہور میں آ ہی رہے ہیں جو کسی قدر اختیارات انسانیہ کا ثمر ہے۔ مومن کے لیے یہ تقسیم روا نہیں ؎

ما کشیم دوست وما پروریم دشمن
کس را مجال نیست کہ چون وچرا کند

کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَزَّ وَجَلَّ:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی — نہیں ہے اللہ کہ چھوڑ دے ایمان والوں کو اوپر اس
مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ — حالت کے کہ ہو تم اوپر اس کے۔ یہاں تک کہ جدا کردے
مِنَ الطَّیِّبِ ؕ (پ۴ - ع۹) — ناپاک کو پاک سے۔

حدیث شریف میں ہے کہ دنیا خداوند کریم کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی

بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو مردار سے تشبیہ دی ہے۔ محققین نے اس کی اصلیت اور حقیقت کو گمراہ کنندہ اور ناپاکی وخباثت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنٌ وَّمَا فِیْھَا مَلْعُوْنٌ فرمایا ہے۔ فرمان ایزد متعال یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ اسی کی خباثت سے عبارت ہے جب مومن بفضلہٖ تعالیٰ اس سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کا قلب اطہر بالکل منزا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو اس قدر دیتے ہیں جس قدر وہ نہیں چاہتا کیونکہ پھر نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض ناعاقبت اندیش مسلمان ہونے کے باوجود اس حکمت کاملہ پر معترض ہو بیٹھتے ہیں۔ اور یہ شیطانی دغدغہ ہے۔ بعض اس کے جال میں ایسے پھنستے ہیں کہ دہریت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مومن بھی اس عظیم الشان بلا میں کچھ نہ کچھ غلطی کھا بیٹھتا ہے اسی لیے اس موقع پر

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا)

کے اسم مبارک لائے گئے ہیں۔ یعنی بڑا مہربان ہے اپنی مخلوق پر اور رحیم اس لیے کہ جو گناہ بھی کرتے ہیں اور توبہ بھی کرتے ہیں ان کے لیے رحیم کا اسم گرامی آیا ہے، مولیٰ کریم ایسوں پر بھی رحم فرماتے ہیں۔ رحمٰن کا لفظ عام ہے اور رحیم کا خاص۔ رؤف الرحیم فرماتے ہیں کہ:

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا — اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں

مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ (پ ۲۲) — نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا۔

لیکن رحمت کو اس نے اپنی ذات پر لازم کر رکھا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ۔ پ ۸)

یہ رحمت خاص مومنین کے لیے ہے، مشرکین، منافقین اور کافرین کے لیے نہیں۔ گو ایک لحاظ سے ان پر بھی رحمت ہے کہ دنیا میں ان کو فوراً پکڑا نہیں جاتا اور موت تک ان کے لیے

سے حصہ عطا فرما کر مشکور فرمایا،

اور دین الحق سے ہر طرح خبردار کیا۔

میں تیار ہوئی؛ احباب حلقہ ارادت تو اس سے

ناواقف حضرات کی آگاہی کے لیے مختصر عرض کرتا ہوں کہ دراصل یہ کتاب حضور رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات متبرکہ ملفوظاتِ مقدسہ، اور مکتوباتِ مطہرہ کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں بعض احباب کے استفسارات کے جواب میں صفحۂ قرطاس پر شہود میں آئے۔ اور جناب محترم سید منیر حسین صاحب تبرکاً ان کو قلمبند کر کے یہ نقلیں اپنے پاس جمع کر

شروع شروع میں ان مضامین کو کتابی شکل میں لانے کا حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کو خیال نہ تھا لیکن احبابِ ارادت کے اصرار پر آپ کچھ رضامند ہوئے۔ تاہم فرماتے کہ چونکہ ان مضامین کو کسی مستقل کتاب کے عنوان کے ماتحت تحریر نہیں کیا گیا اور نہ ہی مجھے یہ خیال تھا۔ دوسرے میری زبان بھی کچھ پرانی قسم کی ہے، لہٰذا کتابی شکل میں لانے کے لیے ان کو دوبارہ تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ کاٹ چھانٹ کر کے ان کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے اور تکرار وغیرہ ہٹا دیے جائیں۔ نیز عبارت کی قدامت کو بھی نئے اور شستہ الفاظ سے مزین کیا جائے۔ مگر قضا و قدر کے ارادہ ازلی میں ایسا ہی منظور تھا کہ آپ وجع المفاصل کی قسم کے دردوں سے صاحب فراش ہو گئے اور یہ ارادہ منسوخ ہو گیا۔ بلکہ جب کبھی برادران طریقت ان کی طباعت کے متعلق خیالات کی سلسلہ جنبانی کرتے، آپ یہی جواب فرماتے کہ ان مضامین کو نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا، مولیٰ کریم کو منظور ہوا تو ہو جائے گا ورنہ خیر۔ مرضئ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

ایک عرصہ کے بعد آپ نے عاجز کے استفسار پر اتنا فرمایا کہ اچھا! تم خود ہی (محترم) سید منیر حسین صاحب کی معیت میں ان کی نظر ثانی کر کے ان کو مربوط اور مسلسل کر لو ـــــ لیکن مجھ میں تو ان مضامین کو کماحقہ سمجھنے کی بھی اہلیت نہ تھی، چہ جائیکہ ان میں کسی قسم کی قطع و برید کرتا ـــــ بالآخر آپ نے اس مسلسل تکلیف کے دوران میں صرف یہ کیا کہ ایک دو مضامین کو سن کر چند ایک فقروں کو منسوخ کر کے چند ایک کا ایزاد فرمایا، اور اس مجموعہ کا نام "الانسان فی القرآن" تجویز فرمایا۔ کچھ مضامین کی ترتیب بھی سمجھا دی اور کتابت کی اجازت دے دی۔ ساتھ یہ ہدایت فرما دی کہ ہر ایک مضمون پہلے مجھے سنا لیا کرو اور پھر کتابت کر لیا کرو۔

آپ کا اس یکدم اجازت دینے سے مجھے خوشی بھی ہوئی لیکن یقین جانیے کہ دل میں ایک دھڑکن بھی

حجاب اٹھ جائے۔ لیکن نہیں معلوم تھا کہ ... مسطورہ کی تیاری میں مزید

دو مہینے گزر گئے اور آغاز کتابت ہی ...

بالآخر آپ کے جانشین صاحبزادہ حضرت سید باقر علی شاہ صاحب دام فیوضہم کے ایما

سے کتابت کو جاری کیا گیا، اور علاوہ کسی تحریری سہو کے تمام مضامین کو بغیر کسی ردّو بدل کے من و عن لکھ دیا گیا ہے

اور آپ کے الفاظ کو متبرک جانتے ہوئے اس حد تک پابندی کی گئی ہے کہ حتی الوسع عنوان بھی آپ کی عبارت ہی کے

الفاظ سے اخذ کیے گئے ہیں اور مضمون کے تسلسل کو توڑا نہیں گیا۔

انہی وجوہات کی بنا پر ایک عام ناظر اور قارئین کرام ... ر ...

لیکن یہ بھی ایک طرح سے قرآن حکیم ہی کی اقتدا ہے، تاکہ ہر ایک ... کے مضمون کی احتیاج

سے بے نیاز ہو۔

کتاب کا نفس مضمون تو میرے کسی تبصرے کا محتاج نہیں اور نہ ہی مجھ ایسے کم علم میں یہ اہلیت ہو سکتی ہے

کہ ایک کامل عارف باللہ کی تحریر پر اس سے بڑھ کر کوئی مزید روشنی ڈال سکے۔ کتاب اپنی تعریف خود اور اپنی نوعیت

میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور ہر ایک پڑھنے والا اپنی علمی وسعت کے مطابق مستفید ہوگا۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں

کہ حضور قدس سرہٗ نے انسان کی ابتدا سے انتہا تک کے مقاماتِ جسمانی اور مدارج روحانی اختصار کو ملحوظ رکھتے

ہوئے شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں، جو مقام اسرار، عالم ارواح اور اس کے علم، میدان دنیا اور اس کی حقیقت،

عالم برزخ اور اس کی کیفیت، یوم القیامۃ اور اس کے حالات اور دوزخ و جنت تک کے مقام پر مشتمل ہیں۔ اعتقاد

کے میدان میں، توحید و رسالت، ایمان و اسلام، قضا و قدر، علم غیب، علم الانسان و علم الرحمٰن اور وقوع امکان کذب

و خلف وعید وغیرہم پر پُر حقیقت اور بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے ہر وہ مسلمان جو اس دورِ فتن

میں راہ راست سے بھٹک رہا ہو، صراط المستقیم پر آسانی سے چل سکتا ہے۔ صرف عصبیت سے دور رہ کر جستجوئے

حق شرط ہے۔ لطف یہ ہے کہ تمام مضامین کو قرآن حکیم کے استدلال سے ثابت کیا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے

سوائے کلام پاک کے کبھی کوئی کتاب مطالعہ نہیں کی۔ البتہ ابتدائی ایام میں صرف کشف المحجوب دیکھی تھی۔ گویا یہ جو کچھ آپ نے

تحریر فرمایا ہے صرف علم لدنی سے عطائے الٰہی ہے جو آپ کے قول "عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا" کی تصدیق ہے

۲۵ رجب ۱۳۷۲ھ		محمد یوسف کاتب گیلانی، کان اللہ لہٗ

معافی حاصل کر لیتا ہے اور سوائے ندامت کے اس کے بطن پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے

شخص سے اگر کوئی غلطی ہو تو وہ طبیعت میں ایک کمی محسوس کرتا ہے۔ اور تیسرا اگر کسی خطا کا مرتکب ہو

لیکن یاد رہے کہ ان کی خطا عوام کی مثل نہیں ہوتی بلکہ عوام کا فعل اور ان کا خیال برابر ہوتا ہے

ذرا سی غلطی کی وجہ سے ان کی حالت سخت دگرگوں ہو جاتی ہے اور بیمار ہو جاتے ہیں بعض

اوقات تو جب تک حالت درست نہ ہو جائے ہوش و حواس بھی قائم نہیں رہتے۔ ان پر

غضب رحمت کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ مدارج احساس خداوند کریم کی توفیق اور مہربانی سے

ہوتے ہیں۔ سب سے سخت اور بدتر گناہ وہ ہوتا ہے جس کا احساس نہ ہو بلکہ عین غضب الٰہی کا باعث

ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں توبہ اور اصلاح ناممکن ہوتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝ (پ ۲۶ - ر ۱۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بلند کرو آوازیں اپنی کو اوپر آواز نبی کے اور مت آواز بلند کرو اوپر اس کے بیچ بولی کے جیسا بلند کرتے ہیں بعضے تمہارے واسطے بعضے کے۔ ایسا نہ ہو کہ کھوئے جائیں عمل تمہارے اور تم نہ سمجھتے ہو۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (مالک ہے روز جزا کا یعنی انصاف کا) مراد اس سے یوم القیامۃ

ہے جس دن حساب و کتاب، جزا و سزا اور عدل و انصاف بادشاہ حقیقی کے حکم سے ہوگا۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی عبارت محض ہماری تفہیم کے لیے ہے۔ جس دن کہ بھاگے گا ہر ایک

آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹے سے

معافی حاصل کر لیتا ہے اور سوائے ندامت کے اس کے بطن پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے شخص سے اگر کوئی غلطی ہو تو وہ طبیعت میں ایک کمی محسوس کرتا ہے۔ اور تیسرا اگر کسی خطا کا مرتکب ہو، لیکن یاد رہے کہ ان کی خطا عوام کی مثل نہیں ہوتی بلکہ عوام کا فعل اور ان خیال برابر ہوتا ہے ذراسی غلطی کی وجہ سے ان کی حالت سخت دگرگوں ہو جاتی ہے اور بیمار ہو جاتے ہیں بعض اوقات تو جب تک حالت درست نہ ہو جائے ہوش و حواس بھی قائم نہیں رہتے۔ ان پر غضب رحمت کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ مدارج احساس خداوند کریم کی توفیق اور مہربانی سے ہوتے ہیں۔ سب سے سخت اور بدتر گناہ وہ ہوتا ہے جس کا احساس نہ ہو بلکہ عین غضب الٰہی کا باعث ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں توبہ اور اصلاح ناممکن ہوتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بلند کرو آواز اپنی کو اُو
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ	آواز نبی کے اور مت آواز بلند کرو اوپر اس کے بیچ
بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ	بولی کے جیسا بلند کرتے ہیں بعضے تمہارے واسطے بعضے
تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝	کے۔ ایسا نہ ہو کہ کھوئے جائیں عمل تمہارے اور تم
(پ ۲۶ - س ۱۳)	نہ سمجھتے ہو۔

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (مالک ہے روز جزا کا یعنی انصاف کا) مراد اس سے یوم القیامۃ ہے جس دن حساب و کتاب، جزا و سزا اور عدل و انصاف بادشاہ حقیقی کے حکم سے ہوگا۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی عبارت محض ہماری تفہیم کے لیے ہے۔ جس دن کہ بھاگے گا ہر ایک آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹے سے

چنانچہ فرمایا ہے یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِۙ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِۙ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِؕ (پ ۳۰ - س ۶) اور نہیں پوچھے گا کوئی دوست دوست کو (لَا یَسْــٴَـلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا۝ پ ۲۹ - س ۷) بلکہ سب دوستیاں دشمنی میں بدل جائیں گی مگر متقیوں اور اللہ والوں کی دوستی۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۝ (پ ۲۵ - س ۱۳) اور اس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے ہنستے خوش وقت۔ اور کتنے منہ غبار آلودہ اور سیاہی مائل ہوں گے (وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ مُّسْفِرَةٌۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌۚ وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌؕ پ ۳۰ - س ۶) بہت سے چہرے تو اپنے رب کی طرف دیکھنے سے ترو تازہ ہوں گے اور بہت سے متفکر ہوں گے۔ گمان کریں گے کہ ان کی کمر کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ (وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ نَّاضِرَةٌۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌۚ وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍۭ بَاسِرَةٌۙ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌؕ پ ۲۹ - س ۱۷) تو چونکہ تمام تر اقتدار مالک الملک کے ہاتھ میں ہوگا اس لیے کسی قسم کی رشوت نہیں چلے گی حتیٰ کہ فرمایا ہے جن لوگوں نے دنیا میں کفر کیا اور کفر ہی پر مر گئے۔ اگر کوئی ان میں سے اپنے بچاؤ کے لیے زمین بھر سونا بھی زر فدیہ کے طور پر ادا کرے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے نہایت دردناک عذاب تیار ہے اور کوئی ان کا مددگار نہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۠ (پ ۳ - س ۱۷)

یہ دن سوائے ان لوگوں کے جو محو دیدار ہوں گے سب کے لیے کم و بیش سخت ہوگا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اسی لیے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ تاکہ اس کو تہ دل سے یاد

بھی رکھو اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے اسم مبارک سے پکارو۔ ورنہ اس تخصیص کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ابتدا سے انتہا تک کا مالک، حیوانات، نباتات، جمادات اور معدنیات بلکہ تمام موجودات سب کا مالک، نہ اس کے لیے ابتدا نہ انتہا۔ جو ہمارے علم میں آچکا ہے اور جو نہیں آیا، سب کا مالک ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب کوئی چیز نہ تھی، اس وقت مالک الملک کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ قبل از ظہور ہر ایک چیز ذات پاک کے علم میں متحقق تھی، جواب بھی ہے۔ جس کا ظہور ہو چکا ہے اور جس کا ابھی تک نہیں ہوا، متحقق ہونے میں برابر ہے جیسے ذات پاک علیم بھی ہیں اور عالم بھی۔ علیم اپنی ذات کے لیے ہیں جس میں غیر کا واسطہ نہیں، اور عالم غیر کے لیے۔ (قبل از ظہور اور بعد از ظہور) فرق یہی ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں)۔ قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم عزّوجلّ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ٥ (پ۲۷۔ ر۲) اظہر من الشمس ہے۔ ہماری تخلیق کا منشا ہی عبادت ہے۔ تاکہ اس معبودِ حقیقی کا (عبد ہونے کی حیثیت سے عبادت کے ذریعہ اس کی خوشنودی حاصل کر کے) عرف حاصل کریں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمان مبارک صادر ہو رہا ہے: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ٥ (پ۱۴۔ ر۲) یعنی اس حد تک اپنے رب کی عبادت کر کہ علم الیقین عین الیقین کو عبور کرتا ہوا حق الیقین کو حاصل کرے۔ جو اصل مقصود اور منشائے تخلیق ہے۔

مولیٰ کریم نے اپنے خاص فضل اور مہربانی سے انسان کے ہر عضو کو عبادت کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔ زبان کی عبادت بموجب فرمان وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا قرآن پاک

کا پڑھنا اور مطابق يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نیک کاموں پر حکم کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا یعنی وعظ و نصیحت اور ذکر ہے۔ کان کی عبادت کلام مجید اور خدا تعالیٰ کے نیک بندوں کی نصیحت کا سننا ہے۔ حقیقت میں ہدایت کی ابتدا سماعت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ہر وہ آواز جو کانوں تک پہنچتی ہے، دل میں جاگزیں ہو کر باعث ہدایت و رشد ہوتی ہے اس لیے ہدایت کا پہلا زینہ ہی کان ہے۔ آنکھ کی عبادت قرآن کریم کا دیکھنا موجودات کی تخلیق میں غور و تفکر کر کے آیات الٰہی کا معلوم کرنا اور تجلیات الٰہی کا پانا ہے۔ ہاتھ کی عبادت مولیٰ کریم کے دین کی حفاظت کے لیے اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا، سخاوت کرنا، اور طاقت بازو کا کسی کمزور بندۂ خدا کی مدد میں خرچ کرنا ہے۔ پاؤں کی عبادت قیام کرنا، نماز کے لیے مسجد میں جانا، حج بیت اللہ کے لیے سفر کرنا، مسجد نبوی اور مطابق فرمان حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من زار قبری وجبت له شفاعتی آپ کے روضہ مبارک کی زیارت کے لیے جانا اور اولیائے کرام و صلحائے عظام کی خدمت میں يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ کے لیے حاضر ہونا اور علیٰ ھٰذا القیاس زیارۃ القبور اور اولیاء اللہ کے مزارات پر پہنچ کر درس عبرت لینا اور مطابق فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً مولیٰ کریم کی عطا کردہ حیات طیبہ سے مستفیض ہونا، غرض ہر نیکی کے کام کے لیے چلنا ہے۔ اور دل کی عبادت مطابق فرمان فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ یاد الٰہی اور معرفت خداوندی ہے۔

اے عزیز! اسی طرح ہر ایک عضو کے لیے كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کے موافق مختلف عبادتیں مقرر ہیں۔ اپنے مقصدِ حیات و تخلیق کو مت بھول۔ غفلت میں پڑ کر کالانعام

بَلْ هُمْ اَضَلّ کا مصداق نہ بن اور یاد رکھ کہ کان، آنکھ اور دل، سب ہی اعضا سے یقیناً باز پرس ہونے والی ہے۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنَ (اور تجھ ہی سے استعانت یعنی مدد طلب کرتے ہیں ہم) ہر قسم کی نصرت و اعانت اس فاعل حقیقی ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ براہ راست کسی فعل کا صدور و ظہور روا نہیں بلکہ ہر ایک عالم میں اسی کے مطابق اسباب کا التزام فرمایا ہے، اور ہر ایک فعل کا ظہور اسباب سے معلق رکھا ہے۔ اسی سنت اللہ کے مطابق نصرت و اعانت میں بھی اسباب کو مؤثر اور ملازم کیا ہے جو حقیقت میں اس ذات پاک ہی کی طرف سے ہے۔ اسباب کا انکار مسبّب کا انکار ہے۔ جیسا کہ:

(۱) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبد المطلب کے وقت میں جب ابرہہ نے کعبۃ اللہ کے گرانے کا ناپاک عزم کیا اور حضرت عبد المطلب کے اونٹ ہنکا لے گیا۔ تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ ابرہہ نے کہا اونٹوں کی فکر کرتے ہو اور کعبہ کی فکر نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اُونٹ میری ذاتی ملکیت میں ہیں، ان کی حفاظت میرے ذمے ہے اور گھر (کعبہ) کی حفاظت اس کے مالک کے ذمے، وہ خود اس کو سنبھال لے گا۔ چنانچہ آپ اپنے اونٹ لے کر واپس چلے آئے۔

گو مولیٰ کریم کئی طرح سے بغیر اسباب کے ان کو تباہ کرنے پر قادر تھے، ویسے ہی ان کی رُوحیں قبض کر لی جاتیں، لیکن مطابق سنت، عالم اسباب میں ان کی تباہی کے لیے اسباب ہی کا التزام فرمایا اور مطابق فرمان:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (پ ۳۰۔ ع ۳۰)

کیا نہ دیکھا تو نے کیونکر کیا پروردگار تیرے ساتھ ہاتھیوں والوں کے۔ کیا نہ کر دیا مکران کا بیچ گمراہی کے، اور بھیجے اوپر ان کے پرند جانور جماعت جماعت۔ پھینکتے تھے ان پر پتھر کنکر سے۔ پس کر دیا ان کو مانند بھوسے کھائے ہوئے کے۔

چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو ارسال فرما کر فَعَلَ رَبُّكَ سے تعبیر فرمایا یعنی ابابیل کے فعل کو حقیقت میں اپنا فعل فرما کر ان کو كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ کر دیا۔ یہ ہے سنت اللہ۔ اب اگر کوئی اس ابابیل کے فعل کا انکار کرے تو اصل میں فَعَلَ رَبُّكَ کا انکار ہے، جو کفر سے کم نہیں ہے۔

(۲) ہر ایک انسان (مسلم اور غیر مسلم) نظام شمسی کا مُقر ہے۔ عالم موجودات میں ہر ذی رُوح بلکہ نباتات اور معدنیات تک کی نشو و نما اور حیاتی کا دار و مدار مولیٰ کریم نے سورج ہی پر رکھا ہے۔ اگر سورج کا فیض نہ ہو تو کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر نبات کو اُگنے اور پرورش پانے بلکہ باثمر ہونے تک شمس کی مدد کی ضرورت ہے جو مِنَ اللہ جاری ہے۔ ورنہ کوئی چیز اُگ ہی نہیں سکتی اور نہ بڑی ہو سکتی ہے۔ سردیوں میں بادل کی وجہ سے سورج کے چھپے رہنے اور بارش کے زیادہ ہونے کے سبب سے اگر نباتات پر سورج کی گرمی صحیح طور پر اثر انداز نہ ہو سکے تو بیج میں نقص واقع ہو جاتا ہے اور دانہ مثل زیرہ کے ہو کر خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک چیز کا حال ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ سورج کی امداد کے سوا کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا تو بالکل حق ہے، اور اس کا انکار فعل خداوندی کا انکار ہے۔

(۳) سایہ کے بڑھنے اور کم ہونے تک کو (جو سورج کے سامنے کسی اوٹ یا حجاب کے بغیر کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتا) مطابق فرمان: اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ○ پ ۱۹ - ۲ کے اپنے فعل سے تعبیر فرمایا۔ لیکن اس کا رہنما اور دلیل شمس کو ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ اس کی علت بظاہر سوائے سُورج کی گردش کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب اگر سورج کو اس کا رہنما نہ مانتے ہوئے اس کے خواص سے انکار ہو تو مولیٰ کریم کے فعل سے انکار ہے۔

(۴) اسی طرح گو تمام تر ہدایت من اللہ ہے، تاہم عمل کے میدان میں جب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لایا جائے، خواہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو، مطابق مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ کے مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے نبی! بیشک بھیجا ہے ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	دینے والا اور ڈرانے والا اور پکارنے والا طرف اللہ کی
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○ وَبَشِّرِ	ساتھ حکم اس کے کے اور سورج روشن، اور خوشخبری
الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا	دے ایمان والوں کو ساتھ اس کے کہ واسطے ان کے
كَبِيْرًا ○ (پ ۲۲ - ۳)	ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بڑا۔

کے فرمان کے مطابق حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان پانچ صفات سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے۔ اور ایمان کے بیج کی نشوونما کے لیے سِرَاجًا مُّنِيْرًا کو دلیل اور راہنما ٹھیرایا ہے۔ تو جب تک انسان آپ کے ان اوصاف کو دل سے مان کر سِرَاجًا مُّنِيْرًا

سے مستفیض نہ ہو اس وقت تک مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا کی بشارت سے خوشخبری حاصل نہیں کر سکتا اور وہ فیض جو من اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے مومنوں کے لیے جاری ہوا ہے اس سے محروم ہی رہتا ہے اور اس کا انکار اس فاعل حقیقی کے فعل کا انکار ہے۔ اور یہ فی سبیل اللہ استعانت ہے جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔ ہر استعانت من دون اللہ حرام ہے اور فی سبیل اللہ حلال۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ اور حواریوں نے جواب دیا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ[1]۔

گو اوپر قرآن مجید کے استدلال سے کچھ بیان ہو چکا ہے تاہم عوام کی تسلی کے لیے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سے تائیداً چند سطور درج ذیل ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"غیر سے اس قسم کی مدد چاہنا کہ اسی پر بھروسہ ہو اور اس کو خداوند تعالیٰ کی مدد کا مظہر نہ جانا جائے، حرام ہے اور اگر توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہے اور اس غیر کو مدد الٰہی کا مظہر جان کر اللہ تعالیٰ کے کارخانہ اور اسباب حکمت پر نظر کر کے غیر کے ساتھ استعانت کرے تو عرفان سے دور نہ ہوگا اور شرع میں جائز اور روا ہے اور انبیاء اور اولیاء نے غیر سے اس طرح کی مدد طلب کی ہے۔ اور درحقیقت یہ استعانت غیر سے نہیں بلکہ حضرت حق سبحانہٗ ہی سے استعانت ہے۔"

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ (چلا ہم کو سیدھی راہ پر) مطابق فرمان مولیٰ کریم فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۚ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے، اس کا

[1] اس مسئلہ کی مزید تفصیل و توضیح توحیدی کے بیان صفحہ نمبر پر کی گئی ہے، وہاں پر دیکھ لیں۔

سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کردے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے ناپاکی مسلط کر دیتا ہے۔ اور یہی تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے"۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ (پ۱۱۔ ع۶) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو پروردگار ان کے ایمان کے سبب سے ہدایت عنایت فرماتا ہے۔

مولیٰ کریم نے اپنے فضل و کرم سے انسان کی فطرت میں توفیق سرشتی عطا فرما کر فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا کی سمجھ عطا فرمائی اور کچھ تھوڑا سا اختیار دے کر میدان دنیا میں مقررہ میعاد کے لیے بھیجا۔ ہدایت کے اسباب یعنی نبوت و کتب اور اولیاء و صلحاء اس کی امداد کے لیے بھیجے اور گمراہی کے لیے شیطان لعین کو مقرر کیا۔ اب توفیق سرشتی کے موافق جس نے اسباب ہدایت پر ایمان لا کر رب کریم کی طرف رجوع کیا تو اس کے لیے فضل و کرم فرما کر نَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ کی سنت کو جاری کر دیا اور ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا کے مطابق صراط المستقیم کی طرف راہ نمائی فرمائی اور اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ (پ۲۳۔ ع۱) کا مصداق ٹھیرا۔ اور جس نے سنت اللہ کے اسباب ہدایت سے روگردانی کی اور وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ کا مرتکب ہوا نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَھُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ کی سنت اللہ کا اجرا اس کے لیے حق ہو گیا اور وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کا مستحق ہو کر گمراہ ہو گیا۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۃ (ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو نے انعام کیے ہیں) بمصداق فرمان مولیٰ کریم فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۝ ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ ۚ وَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیْمًا ۝ (پ۵۔ ع۶) "اور جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک لوگ — اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے اور خدا کافی جاننے والا ہے"۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے حق دار وہی لوگ ہیں جو ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ کے مستحق ہیں۔ دوسری جگہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات حسنہ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا کا بیان فرما کر مومنوں کے لیے مِنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا کا مژدہ سنایا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ حسب الحکم اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اتباع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کے نور سے منور ہو کر مِنَ اللّٰہِ فَضْلًا کَبِیْرًا کے انعام کا مستحق اور اس رفاقت حسنہ کا حق دار ہو سکتا ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ (سوائے ان کے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے) چنانچہ فرمایا ہے وَلَا تَطْغَوْا فِیْہِ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ ۚ وَمَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْہِ غَضَبِیْ فَقَدْ ھَوٰی ۝ (پ۱۶۔ ع۱۳) "اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہو گیا"۔ تو مولیٰ کریم نے اپنے فضل و کرم سے بذریعہ حضور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری نجات کے لیے شریعت غرا کے حدود مقرر فرما دیے۔ اب ان سے تجاوز کرنا ہر قسم کی گمراہی کا باعث ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۲۵ - س ۱۹) "بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہے) تو خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ تو خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے؟ بھلا تم نصیحت نہیں پکڑتے"؟ چونکہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کے مطابق مولیٰ کریم نے ہر ایک انسان کو نیکی اور برائی کی سمجھ عطا فرمائی ہے، اور اس کا ضمیر توفیق سرشتی کے طور پر اُس کی طرف سے عطا ہے۔ اب باوجود علم کے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا تو مولیٰ کریم نے از روئے غیرت اس کے کانوں اور دل پر مُہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ تو مطابق كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کا مستحق ہوا جو حقیقت غضب ہے۔ اور توفیق اضافیہ کے تصرف سے مغضوب ہو کر ضآلّین میں سے ہو گیا ــــــ اب جبکہ مولیٰ کریم نے از روئے غیرت اس کو مغضوب قرار دے کر گمراہ کر دیا، تو اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

تو اس ربّ العالمین اور رحمٰن و رحیم سے ہماری یہ دعا ہے کہ اے ربّ کریم! ہمیں اپنے غضب سے بچا کر اس گمراہی سے بچائے رکھیو ــــــ آمین +

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ۝

بابِ اوّل

علم الروح

رُوح و ماقبلِ رُوح

لُغت کے لحاظ سے رُوح کسی چیز کے عطر یا لطیف جوہر کو کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں انسان کے وجود کی حیاتی اور اصل سے عبارت ہے، جو تمام اثرات کا حامل، اپنی صفات میں کامل اور ابدی ہستی کا رکھنے والا ہے۔

اس کے بیان میں از حد اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ قدیم ہے۔ جس سے اُن کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور تغیّر و تبدّل، آمد و رفت، حرکات و سکنات، موت و حیات اور فنا و بقا کو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یعنی ظہور کے میدان میں ہر طرح کی شکل اور صورت کے لباس میں ذاتِ معلّٰی کو ملبوس سمجھتے ہیں۔ حدث اور قدم کو نہیں پہچانتے اور قدم سے حدث کو نہیں جانتے۔ جو شخص قدم سے حدث کو

نہیں پہچانتا وہ اپنی گفتار میں جاہل ہوتا ہے۔ اور یہ حلولیوں کا مذہب ہے جو سراسر باطل اور حقیقت سے کوسوں دُور ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ہر طرح کا تصرّف اُس فاعلِ حقیقی کے سوا نہیں کَمَا قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ:

اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (پ ۹)	یقیناً اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (پ ۶)	اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔

اور فرمایا:

مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ	کوئی چلنے پھرنے والی چیز ایسی نہیں جس کی
بِنَاصِیَتِہَا (پ ۱۲ - ۱۱ : ۵۶)	پیشانی کو اس نے پکڑ نہ رکھا ہو۔

فرق صرف یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے فعل سے ظہورِ تام ہے اور فعل تابع ارادہ تحت صفتِ مُریدؔ جو بالذّات ہے۔ گویا فعل کو امر سے اور امر کو صفت بالذّات سے اور صفت بالذّات کو ذات سے تعلّق ہے۔ اور ذات پاک کے لیے تحریک حرام ہے یعنی کسی قسم کا تغیّر و تبدّل روا نہیں ہے۔ عُروج و نُزول اور دُخول و خُروج سے مبرّا و منزّہ اور ہر قسم کے عوارضات سے پاک ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

ہر چند اس گروہ کی غلطی کے اسباب قوی ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ خطا منقولی اور معقولی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ رؤیت کے میدان کا شجر ہے۔ بعض نے رؤیت کو پایا اور حال کے غلبہ سے عالمِ امر کی کیفیت کے مشاہد ہوئے۔ اور ہر چیز خصوصاً متحرک ہستیوں

کی حرکات و سکنات کا معائنہ کرنے سے ہمہ اوست کے میدان میں قدم زن ہو کر اپنے زعم میں حقیقت کو پہنچ گئے اور مدّعی بن گئے۔ جاہلوں نے ان کی تقلید کی، حالانکہ حال کی تقلید حرام ہے۔

قاعدہ اور سُنّتِ اللہ ہے کہ جب انسان توفیقِ الٰہی سے سَعی کرتا ہوا مطابق ارشاد وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا مجاہد ہوتا ہے تو از راہِ فضل و کرم ایزد متعال اس کو راستہ دکھاتے ہیں اور وہ لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا کی سنّت کے موافق حصُول کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ کے راستہ پر عالمِ موجودات، محسُوسات اور معلومات سے گزرتا ہوا انبساط معرُوفات کا مشاہد ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کی نظر میں عالمِ امر کا مشاہدہ بلا حجاب ہوتا ہے اور مذکورہ بالا باقی عالموں کے حجاب سے خلاصی پانے والا۔ اس کی نظر میں تمام حرکات و سکنات رُوح سے تعبیر ہوتی ہیں، بلکہ اس کے مشاہدہ میں غیر نہیں رہتا۔ تب وہ ہمہ اوست کا نعرہ بلند کرتا ہے اور یہی ان کی غلطی کا اصل ہے۔

بمصداق "گو حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی" صحتِ حال کی رُو سے تصرّف اور ظہورِ ذاتِ باری تعالیٰ یعنی توحید فی الخلق فاعلِ حقیقی کے فعل کے سوا نہیں ہے۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ فعل کو امر سے اور امر کو صفت بالذّات سے اور صفت بالذّات کو ذات سے تعلّق ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ فعل مخلوق کے مانند نہیں ہے۔ بلکہ صفت بالفعل کو صفت بالذّات سے اور صفت بالذّات کو ذات سے ایسا اتحاد ہے جس کی مثال ناممکن اور جس میں تمیز محال ہے اور ان مدارج و معارج میں ایسی معیّتِ خداوندی ہے جس کے لیے بُعد و قُرب کی

عبارت لاحاصل ہے۔ اِسی وجہ سے حال کی رویت سے رُوح کو قدیم کہنے پر جرأت کی ہے اور یہ اُن کا قول باطل ہے۔ یہ سب کیفیاتِ حال عالمِ امر یعنی معائنۂ رُوح سے ہیں نہ عینِ ذات سے۔ اور وہ اس لیے کہ کسی قسم کی تحریک ذات کے لیے روا نہیں ہے اور مشاہدۂ ذات محویتِ تام سے عبارت ہے جس کے لیے میدانِ کلام میں زبان و بیان اور حُروف و الفاظ مفقود ہو جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ یعنی رُوحیں جمع کیے گئے لشکر ہیں جو بحکم خدا آتے اور جاتے رہتے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رُوح کی نسبت سوال ہُوا تو من اللہ وحی نازل ہوئی:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ	(اے میرے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا	آپ کہہ دیجیے کہ رُوح میرے رب کا امر ہے
قَلِیْلًا (۱۷-۸۵-پ۱۵-س۱۰)	اور تم علم سے بہت کم حصّہ دیے گئے ہو۔

بحث و تنقید کے میدان میں اَمْرِ رَبِّیْ کو غور و تعمق کے اوزان سے موازنہ کیا جائے تو کہنا ہی پڑے گا کہ مخلوق کا حکم اس کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اس لیے کہ مخلوق محدث ہے جو فَیَکُوْن کے ظہور کا نتیجہ ہے اور کُنْ امر جس سے فَیَکُوْن کا ظہور ہُوا۔ اور یہ صفت بالذّات یعنی مُرِیْد سے وابستہ ہے اور صفات بالذّات کو ذات سے ایسا اتّحاد ہے جو نہ کبھی منفک ہُوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔ اِس عبارت سے یہ مفاد حاصل ہُوا کہ نہ تو یہ قدیم ہے جس سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہو سکتی ہو، اور نہ ہی مخلوق جس پر حدث کا وجود ملبوس ہو۔ لیکن اِس جگہ رُوح

کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا سوال ہے جس کا حل قرآن حکیم کی رُو سے صاف عیاں ہے کہ خلق اَور چیز ہے اور امر اَور۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔

میرا مذہب اِس کتاب میں محض "اِنسان فی القرآن" ہے اس لیے اس مسئلہ میں آیات بیّنات کی تطبیق اور موافقت کے بغیر چارہ نہیں اور نصِ قطعی کے مقابلہ میں سب دلائل ہیچ ہیں۔ لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ کی بساط پر تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ کی وسعت اظہر من الشّمس ہے۔ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ کے مطابق ادراک و فہم کی توفیق سے غور و فکر کے ترازو میں تحقیق کا طالب ہونا ضروری ہے۔ انسان کی ابتدا و انتہا، منازل مدارج، عُروج و نزول، ذات و صفات اور علم و عُرف کے دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد کلامِ الٰہی کے ساحل پر استقامت حاصل کرنا چاہیے تاکہ تمام مشکلات کا حل آسانی سے ہو سکے اور انسانی شجر کی جڑ سے لے کر تنا، ٹہنیوں، برگوں اور پھول و پھل تک کا علم حاصل اور مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے ایک جزء سے عُرف حاصل ہو۔

عزیزا! جان، کہ انسان قبل از ظہور جبکہ عالمِ شہود بلکہ عالمِ امر سے یعنی عالمِ ارواح سے بھی کوئی نشان نہ تھا مطلق عدم تھا لیکن متحقق بالذّات اور علمِ الٰہی کے بے کنارہ دریا میں مستغرق تھا۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ	بے شک انسان پر زمانے میں سے ایک
مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا	وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ یہ کوئی چیز
مَّذْکُوْرًا (۷۶-۱-پ۲۹-س۱۷)	ذکر کے قابل نہ تھا۔

اس سے صاف عیاں ہے کہ انسان پر ایک وقت تھا جو ذکر قابل نہیں ہے۔ لیکن اثباتِ انسان میں کوئی کلام نہیں اور ہَلْ اس امر پر دال ہے کہ انسان تو تھا لیکن وہ حالتِ انسان تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقامِ عدم نہیں بلکہ مقامِ اثبات ہے۔ انسان تو درکنار ہر چیز متحقق بالذّات ہونے کی صُورت میں معدُوم نہیں ہو سکتی کیونکہ جب مولیٰ کریم نے ہر چیز خُصُوصًا انسان کے ظہُور کا ارادہ فرمایا اور کُنْ سے فَیَکُوْن کا لباس پہنا دیا، تو اس کیفیت کو یُوں بیان فرمایا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا	سوائے اس کے نہیں کہ حکم اس کا جب کسی چیز کو پیدا
اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (پ۲۳۔ ۵)	کرنا چاہتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

لَهٗ کی ضمیر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہر چیز علمِ خداوندی میں موجود تھی اور یہ امر کُنْ اُسی کی طرف ظہُور کے لیے صادر ہوا تو عالمِ ارواح میں ہویدا ہو گئے۔ یہ دُوسرا مقامِ انسان ہے۔ اب یہ ذکر کے قابل ہو گیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ	اور کیا ہے تمہیں کہ نہ ایمان لاؤ ساتھ اللہ کے
وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا	اور رسول پکارتا ہے تم کو تاکہ ایمان لاؤ ساتھ
بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ	رب اپنے کے اور یقیناً وہ عہد لے چکا ہے
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (پ۲۷۔ ۱۷)	تم سے، اگر تم باور کرنے والے ہو۔

دُوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	اور جب اللہ نے تمام انبیاء سے عہد لیا۔

الآیۃ (۳ - ۸۱ - پ۳ - ۱۷)

یہ میثاق عامۃ النّاس اور انبیاء علیہم السّلام دونوں کے لیے الگ الگ وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل اس جگہ مقصُود نہیں۔

اِس کے بعد عالمِ شہُود میں ظہُور کا وقت آیا تو فرمان ہُوا اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ۔ پھر اِس کے بعد آدم علیہ السّلام اور بنی آدم علیہ السّلام کے ناموں سے خطاب فرمایا۔ پھر رُوح سے اور کبھی ناس اور کبھی رَجُل وغیرہا اسماء سے موسوم کیا۔ غرض اس عبارت سے یہ ہے کہ قبل از ظہُور اور بعد از ظہُور یہ لفظ انسان منقطع نہیں ہُوا ہے۔ اس لیے کہنا ہی پڑے گا کہ انسان کا ذاتی نام انسان کے سوا نہیں۔ باقی سب اسماء صفاتی ہیں۔ متحقق بالذّات ہونے کی صُورت میں بھی اور عالمِ ارواح میں بھی انسان کے نام سے موسُوم ہُوا۔ اور بعض پاک ہستیوں کو اپنے فضل و کرم سے منتخب کر کے انبیاء و مرسلین کی صفت سے مزیّن فرما دیا۔ تو یہ امر اس پر دال ہے کہ پیغمبر اور مرسل ازلی ہیں۔ آج جیسا کہ ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ مجاہدہ سے یہ درجہ حاصل ہو سکتا ہے، کاذب ہیں۔

امّا بعد یہ حضرت انسان عالمِ شہُود یا میدانِ دنیا میں آ کر کئی صفات سے موصُوف ہُوا اور جس صفت میں مستغرق ہُوا اسی وصف سے نامزد ہو گیا۔ مثلاً مومن، مسلم، منافق، فاسق، کافر، مشرک، رَجُل، عبد، جاہل، عالم وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ سوائے انسان کے سب کے سب نام صفاتی ہیں اور تمام مدارج و منازل میں ذاتی اسم (انسان) لازم ہے۔ صرف رُوح میں اختلاف ہے اور وہ اس لیے کہ جب بُت یا بشر بے رُوح کے مقابلے میں

معاملہ درپیش ہؤا تو رُوح کے نام سے موسُوم کر دیا، اور موزون بھی یہی تھا۔ ورنہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کے سوا وجودِ انسانی خواہ نوری جامہ میں بیان کیا جاتا، عوام کو بے حد مشکل واقع ہوتی۔ اُس عزیز الحکیم نے اسی سبب سے رُوح ہی کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ اس صورت میں عوام کے نزدیک خواہ مسلم ہو یا کافر، بُت بے جان میں رُوح کے داخل ہونے اور بوقت انتقال خارج ہونے میں کوئی مشکل وارد نہیں ہوتی ہے۔

مقام غور و فکر ہے کہ قبل از ظہور یعنی عالمِ ارواح میں تو انسان ہی کے اسم سے موسوم ہے، لیکن بشریت یا بُتِ مُردہ کے مقابلہ میں رُوح، اور بعدۂ پھر انسان، تو اس سے کون سے معانی دریافت کے میدان میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ قبل از بُت بے رُوح اور بعد از ظہور تو انسان ہی کہلائے، اور اس موقع پر رُوح سے تبدیل ہو جائے ؟ تو کہنا ہی پڑے گا کہ صفات اور حالات کے تغیّر و تبدّل کی رُو سے یہ سب کے سب نام صفاتی ہیں۔

دیکھیے، جب حضرت عیسیٰ رُوح اللہ کا (جو معبُودِ حقیقی کے بندے ہیں) حضرت مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہونے کا موقع آیا، تو فرمایا وَ نَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ گویا حضرت عیسیٰ رُوح اللہ کو رُّوْحِنَا سے موسوم کیا۔ اور ان مدارج انسانیہ میں ابتدا سے انتہا تک انسان ہی ثابت ہو رہا ہے، اور انسان سراسر مخلوق ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ — بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو بیچ اچھی
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ — ترکیب کے۔ پھر پھیر دیا ہم نے اس کو نیچے
اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ٥ (پ ۳۰ ۔ س ۔ ۲) — سب نیچوں کے۔

تو بالکل عیاں ہے کہ اَحْسَنِ تَقْوِيْم اور اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ہر دو حالت میں خَلَقْنَا الْاِنْسَان یعنی خلقت کیا انسان کو ارشاد ہو رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ یعنی رُوح میرے امر سے ہے نہ کہ عین امر تو ان مدارج و منازل میں اس کا آنا اور واپس جانا خداوندِ کریم کے امر یعنی حکم سے ہے۔ ان سندات کے لحاظ سے انسان مخلوق ہے۔ اور رُوح صرف ایک اسمِ گرامی ہے جو بُت میں داخل ہونے کی موزونیت کے لحاظ سے نامزد ہؤا ہے، جس کی تصدیق و تطبیق کلامِ الٰہی سے ہو چکی ہے۔ اور یہ اختلاف محض اسی عارضہ کی وجہ پر ہے۔

سوال: اس میں کلام نہیں کہ انسان جس کی حدِ ظہور کے میدان تک ہے مخلوق کا حکم رکھتا ہے یعنی عالمِ شہُود اور عالمِ ارواح میں نصِ قطعی سے ثابت ہے۔ لیکن قبل ازیں متحقق بالذّات ہونے کی حالت میں جبکہ وجودِ خارجی تو در کنار، وجودِ رُوحی بلکہ وجودِ لفظی اور ذہنی سے بھی مبرّا و منزّہ تھا، محض علمِ خداوندی کے دریا میں ارادۂ ازلی کی لہروں کے سوا کوئی وجود نہ رکھتا تھا، بلکہ امرِ الٰہی بھی صفت بالذّات ھُوِیدا کے نہانی حجرہ میں پوشیدہ تھا اور ظہُور کا میدان سراسر خالی تھا۔ گویا حقیقتِ انسانی صفت بالذّات کے ارادہ اور امر کے ایما کی محتاج تھی، جس کے لیے ارشادِ ذوالجلال والاکرام ہے کہ وہ ذکر کے قابل نہ تھا۔ صرف نام تھا جس کی حقیقت سوائے علیمٌ حکیم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ جو کچھ تھا، قُدس کے پردوں میں پوشیدہ تھا۔ اب نورِ ایمانی کی قوّت سے معلوم کرنا چاہیے کہ جب وجُودِ لفظی اور ذہنی بھی نہ تھا۔ بلکہ امرِ الٰہی کا ظہُور بھی مشیّت ایزد متعال ذوالجلال والاکرام کا منتظر تھا۔ مطابق کلامِ الٰہی ذکر کس کا اور کہاں

اور کس طرح ؛ سوائے اس کے کہ یہ اسرارِ الٰہیہ سے ایک سِرّ انسان متحقق بالذّات ہونے کی صُورت میں پنہاں تھا تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے وقت میں انسان کو کس نام سے یا کس وصف سے جاننا چاہیے؟

جواب: اُوپر گزر چکا ہے کہ رُوح اور بشر وغیرہ وغیرہ سب نام انسان کے صفاتی اسماء ہیں۔ کلام الٰہی شاہد ہے کہ کبھی تو انسان کو رُوح کے نام سے اور کبھی بشر اور کسی جگہ عبداللہ یا عبادی اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مناسبت کے رُو سے بنی آدم کا خطاب صادر ہو رہا ہے، جو خالی از حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ علیم و بصیر کے مشاہدہ سے نشان ہے۔ اسی وجہ سے نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِيْ کا ارشاد ہوا یعنی پھونک دی اس میں اپنی رُوح۔ دُوسری جگہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کا فرمان اظہر من الشّمس ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولیٰ کریم نے اپنے امر سے رُوح کو بشر میں پھونک دیا۔ دراصل انسان جو اس صفتِ عظیمہ کا مرکز تھا، داخل کیا گیا۔ جس کی کسی قدر تفصیل اُوپر گزر چکی ہے جنہوں نے قدم کو حدث سے الگ دریافت نہ کیا اُنہوں نے رُوح سے مراد ذات باری تعالیٰ ہی لے لی اور امر و ذات میں فرق نہ کرنے کے سبب جاہل ہو گئے۔ حُلولیوں کی غلطی کے اسباب یہی ہیں جو سرتاپا بے اصل ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ امر کو صفت بالذّات سے اور صفت بالذّات کو ذات سے تعلق ہے۔ اور اُنہوں نے کئی وجہ سے عبارت کو بدلا ہے اور اپنی ضلالت کو کئی معنوں میں حُلول ذات سے تعبیر کیا ہے، جس میں بہت طول ہے جو اس جگہ مقصود نہیں ہے۔

جواب ان کا یہ ہے کہ اُس ذات باری تعالیٰ نے اپنے بندے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے ضمیر مبارک میں اپنے اذن کا اجرا رکھا ہے۔ گویا فاعلِ حقیقی نے اپنے فعل کو اعجاز کی بساط پر اپنے بندے کی طرف منسُوب فرمایا چنانچہ ارشاد ہے:

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ	یہ کہ پیدا کرتا ہوں میں تمہارے لیے مٹی سے
كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ	مانند صورت پرندے کے پھر پھونکتا ہوں میں
طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ	اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے۔
وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ	اور چنگا کرتا ہوں میں مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی
اللّٰهِ ۚ (۳: ۴۹۔ پ۳۔ ۱۳۴)	کو ساتھ اذن اللہ کے

یعنی مُردے کو زندہ کرنے، مادرزاد اندھے کو اچھا بھلا کرنے، کوڑھی کو تندرست بنا دینے اور مٹی کا جانور بنا کر اس میں رُوح کو پھونک دینے کی قدرت عنایت فرمائی۔ (ایک گروہ نے ان سب معجزات کی تاویل اپنی جہالت اور بیہودگی پر کی ہے لیکن مٹی کا پرندہ اور اس میں پھونک مارنے سے وہ بھی دم بخود اور مبہوت رہ گئے ہیں)۔

مقصُود اس جگہ صرف یہ ہے کہ اگر بُت میں رُوح پھونکنے سے حلول ثابت ہو سکتا، تو چاہیے تھا کہ ہر ایک جانور میں حضرت عیسٰی رُوح اللہ حلول کر جاتے۔ اور یہ محال ہے کیونکہ وہ اپنی جگہ قائم رہے اور جانوروں کو بدستور زندہ کرتے اور مُردہ میں زندگی کو ودیعت فرماتے رہے۔ صحتِ حال کی رُو سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہیے کہ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے اذن یعنی امر کو اپنے بندے حضرت عیسٰی رُوح اللہ کے ضمیر مبارک میں اجرا رکھ کر ہر فعل میں تکرارِ بِاِذْنِ اللّٰهِ یا بِاِذْنِیْ کو لازم رکھا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ رُوح

کا اجرا خواہ بہ مشیت ایزد متعال کسی بندے کے ضمیر سے ہو، یا بلا توسّل، یہ سب امر کے ماتحت ہی ہے۔ اور سوائے اس کے کوئی صورت کلام الٰہی سے ثابت نہیں ہو سکتی۔

حاصل اس کلام سے (مطابق کلام اللہ مدارج ومنازل انسان کے رُو سے) یہ ہوا کہ یہ حضرت انسان جس جگہ یا جس مقام پر مقیم ہو، مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ خواہ وہ سرّی وجود میں مخفی ہو، یا رُوحی لباس میں ملبوس، اور خواہ ظاہری وُجود میں عالمِ شہود کا شجر ہو، بہر حال نص قطعی سے مخلوق ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور صحت حال کی وجہ سے تحقیق کی بساط پر سوائے اس کے کوئی عبارت درست نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر حالت میں انسان کی نفی کہیں پائی نہیں جاتی جو سراسر حقیقتِ انسان پر دال ہے اور منازل ومراتب کی رُو سے ہر وصف میں موصوف اور اسی کے مطابق ہر اسم سے موسُوم ہے۔ جیسا اوپر گزر چکا ہے اور دوبارہ بیان لاحاصل ہے۔ صرف اتنا لازم ہے کہ اس علیم وحکیم نے اپنے کلام کی شان کے مطابق اُصُولِ نزُول کو ہمارے حال پر اور شانِ نزُول کو ہمارے افعال پر مبنی رکھا ہے۔ اسی لیے انسان کو کبھی اعلیٰ اور کبھی اسفل حالت سے بیان فرمایا ہے، مثلاً نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اور نَفَخْنَا رُوْحَنَا وَمِثْلُهَا انسان کے وُجُود رُوحی یا نوری سے عبارت ہے۔ اور دُوسری صورتِ حال میں بَشَرًا سَوِيًّا، بَشَرًا رَّسُوْلًا، اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ وغیرہم زمین کے میدان کا شجر ہے، جو سراسر اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ کے موافق ہے، اور اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ پہلی حالت کے مطابق، پس اس عبارت سے یہ مقصُود حاصل ہوا کہ یہ مدارج ومنازل انسان کی حالت کے رُو سے ہویدا ہیں اور ان دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رُوح جو ایک مقام کی حیثیت سے انسان کا

نام ہے، سراسر مخلوق ہے۔ رہا امر جو غیر مخلوق ہے وہ رُوح سے الگ ہے۔ کَمَا قال اللہ تعالیٰ:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ	پھر تندرست کیا اس کو اور پھونکا بیچ اس کے
رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ	روح اپنی سے۔ اور کیا واسطے تمہارے سُننا
الْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ؕ قَلِيْلًا	اور دیکھنا اور دل۔ تھوڑا ہے جو شکر
مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۳۲: ۹۔ پ ۲۱ ع ۱۴)	کرتے ہیں۔

صاف عیاں ہے کہ امر اور خلق دو چیزیں ہیں۔ امر ہرچند خلقت کیا گیا نہیں ہے۔ کیونکہ امر کی نسبت آمر سے وابستہ ہے اور تخلیق کے میدان میں مخلوق کی طرف ہے یعنی جب آمر کا ارادہ ہوا تو امر صادر فرما دیا اور کُنْ سے فَيَكُوْنُ کا ظہور ہو گیا۔ مخلوق کے لیے تغیر کا محل روا ہو سکتا ہے لیکن امر کے لیے کسی قسم کا تغیّر جائز نہیں ہے۔ اور ارواح کی نقل وحرکت، آمد ورفت اور عرُوج ونزول شواہدات عقلی ونقلی سے مسلّم ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اور اس مضمون کے شروع ہی میں ایک حدیث شریف بطور استشہاد درج ہو چکی ہے دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہنا ہی پڑے گا کہ رُوح مخلوق اور امر سراسر غیر مخلوق ہے۔ دیکھیے! دوسری جگہ کیا ہی مفصل ارشاد ہو رہا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (پ ۸ ع ۱۴) — خبردار! اسی کے لیے پیدا کرنا اور حکم کرنا

جاننا چاہیے کہ ہر دو حالتِ انسان میں خلقت کا لفظ مستعمل ہے۔ اوّل از خاک آخر از نطفہ۔ پھر رُوح کے داخل ہونے کا ارشاد ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مخلوق کا لفظ بشریّت

کے لیے صادر ہوا ہے اور رُوح کے لیے کہیں خلقت کا لفظ استعمال نہیں ہوا جس سے مخلوق کا حکم رُوح کے لیے روا نہیں ہو سکتا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ انسان کا نام رُوح بُت میں داخل ہونے کے وقت رکھا گیا ہے۔ ورنہ قبل ازیں انسان ہی کے اسمِ گرامی سے موسُوم ہے جس کی تفصیل اُوپر گزر چکی ہے۔ میثاق عوام اور خواص یعنی انبیاء کرام اظہر من الشّمس ہیں جو اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور صاف عیاں ہے کہ قبل از بشریّت یعنی ڈھانچہ بے رُوح قرآن شریف سے انسان مکمّل ثابت ہے اور بعدۂ عالمِ شہُود میں بھی انسان ہی ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ بُت میں داخل ہونے اور نُوری وجود کو خاکی پُتلا میں ودیعت فرمانے کے سوا کوئی عبارت اِن معانی میں درست ہو سکے، تو کہنا ہی پڑے گا کہ یہ حضرت انسان کا نام بُت کے مقابلہ میں رُوح سے موسوم کیا گیا ہے ورنہ رُوح اور انسان میں سوائے بشریّت کے کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔ یعنی با رُوح انسان، اور بے رُوح مُردہ۔

عزیزا! سمجھ، کہ نافہمی کی بنا پر رُوح میں اختلاف واقع ہوا ہے ورنہ معاملہ بالکل صاف ہے۔ محقّقین کے نزدیک انسان کے چار وُجُود ہیں: بشری، ملکی، رُوحی اور سرّی، بشری، موجودات، عالمِ دنیا۔ ملکی محسُوسات، عالمِ برزخ۔ رُوحی معلومات، عالمِ ارواح جس کا عُرف، عالمِ امر سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور سرّی معرُوفات سے ہے۔ ملکی اور رُوحی در اصل ایک ہی دریا کے حُباب ہیں لیکن سرّی میں نہ تحریر ہے نہ تقریر، نہ زبان ہے نہ کلام، سوائے اس کے کہ سرّ سے عبارت ہے جس کو خالقِ موجودات، مالکِ کائنات

نے مخفی رکھا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ حالت انسانیہ ذکر کے قابل نہیں، بمصداق هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا۔ تاہم انسان کی نفی نہیں ہوئی اور وہ اس لیے کہ عَلَى الْاِنْسَانِ ہی فرمایا ہے۔ اب اس کو روح کہیں یا سرّ، سوائے اس کے علم کے میدان میں کوئی کلام نہیں ہو سکتی۔ محض خداوندی علم کے پردوں میں راز مخفی ہے۔ عارف باللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔ تاہم اس کا اظہار جرم ہے، مطابق حدیث شریف اَلْاِنْسَانُ سِرِّىْ وَاَنَا سِرُّهٗ۔ اور فرمایا وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ٭

باب ۲

باب دوم

عالم الشہود

ابتدائے آفرینش

حمد

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝

حمد کس سے ہو سکے تیری خدا!

جبکہ تیری حمد ہے سب برملا

پھر حمد کس سے اور کون محمود، عبادت کس کی اور کون معبود، عُرف کس کا اور کون عارف، وصف کس سے اور کون موصوف، نہ اس کی حصر نہ اُس کی حد، اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ ایک خالق ایک مخلوق۔ حدث سے قدم کی تعریف محال، لم یزل و لایزال قلم، سیاہی، کاغذ، کاتب، کلام و زبان، سب حدث۔ نہ اس کی تعریف کے

لیے حرف نہ وجود، لامحدود، ہر جگہ موجود، نہ جوہر نہ عرض اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

تخلیقِ انسان

اُس ذات بیچون نے اپنی صفاتِ ذاتیہ سے اپنے ظہور کا ارادہ کیا، تو اپنے نورِ معلّیٰ سے حضرت **محمد** مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور عالم ارواح میں ظاہر فرمایا۔ گویا امر کُن سے فَیَکُوْن کے فعل کو صادر کیا اور اپنی صفت ربوبیت سے سید المرسلین خاتم النبیین آخر آمد بود فخر الاولین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کی صفت پر مبعوث کر کے خاص کیا، اور اس نعمت بے بہا کا خاک کے پردہ میں ظہور فرمایا جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	اور بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو بھتی ہوئی
مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ	مٹی سے۔ پھر پیدا کیا ہم نے اس کو ایک قطرہ
نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ	منی کا بیچ جگہ مضبوط کے۔ پھر پیدا کیا ہم نے
خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا	منی کو لہو جما ہوا۔ پس پیدا کیا ہم نے لہو
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ	جمے ہوئے کو بوٹی گوشت کی، پس پیدا کیا ہم نے
عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ	بوٹی کو ہڈیاں، پھر پہنا دیا ہم نے ہڈیوں کو
اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ	گوشت، پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش دوسری

اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ۝ (پ۱۸ - ع۱) — پس بہت برکت والا ہے اللہ بہتر پیدا کرنے والا۔

اُس خالقِ یکتا نے انسان کی تخلیق کو اوّل از خاک اور آخر از نطفہ اپنے کلامِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ تو جب خلقتِ اوّل کا ارادہ ہوا تو ارشاد کیا:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (پ۲۳ - ع۱۴)

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ بیشک میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پس جس وقت میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے لیے سجدے میں گر پڑو۔ تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

لُغت میں بشر کا ترجمہ ردّی الخلائق، چمڑا یا ڈھانچہ ہے۔ تو جب سڑی ہوئی مٹی سے حضرت آدم علیہ السّلام کا بُت تیار کیا گیا اور صحیح صُورت بنا کر اس میں اپنی رُوح پھونک دی تو حسبُ الحکم سب ملائکہ سجدے میں گر گئے مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ اور جُوں کا تُوں اکڑا بیٹھا رہا۔

قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ۝ (پ۲۳ - ع۱۴)

فرمایا اے ابلیس! تجھے سجدہ کرنے سے کس بات نے روکا ایسی چیز کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا، کیا تو نے تکبر کیا ہے یا تیرا مرتبہ بلند ہے؟

تو شیطان نے دلیل پیش کی:

قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ (پ۲۳ - ع۱۴)

بولا میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

افسوس! معلّم الملکوت نے جب اپنی طرف رعونت اور تکبّر کی نظر سے دیکھا تو ایک ہی قدم میں لعنت کے گڑھے میں گر گیا اور اس کی محدود نظر نے اسے عجیب دھوکا دیا۔ یعنی اس کی دانش جوہر کو چھوڑ کر محض عرض پر رہ گئی۔ ورنہ یہ اختلاف کیوں ہوتا؟

یہ لفظ انسان کسی حال میں اور کسی تغیر سے منقطع نہیں ہوتا۔ اس لیے انسان کے بیان اور عُرف میں بے حد اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک صفات حیوانیہ (جو انسان میں پائی جاتی ہیں) کا نام انسان ہے، تو یہ سب حیوانات میں موجود ہیں۔ رہا عقل و دانش کا فرق، تو بے وقوف اور اندھا، گونگا، بہرا ہونے سے بھی انسان کی نفی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ لفظ مُردہ انسان سے بھی نہیں اُٹھ سکتا۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ وُجود، انسان ایک جامۂ انسان ہے اور انسان ایک سِرِّ الٰہی ہے۔ گو کسی حد تک یہ قابلِ اعتنا ہے لیکن فاسق کافر، منافق اور جاہل بھی انسان ہیں جن میں سِر سے کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ انسان ہونے میں سب مشتمل ہیں۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ ابتدا سے انتہا تک تمام عُلُوم کے حصُول کا مرکز یہی وجود ہے۔ اور اس وجود میں انسان کے نُزُول فرمانے کا مقصُود و مدّعا یہی ہے کہ اوّل سے آخر تک کے علم سے عالم اور عارف ہو کر اپنے آپ کو پہچانے تاکہ اپنے پروردگار کا عُرف حاصل ہو،

اور معلوم کرے کہ اس رب العالمین نے مجھے پیدا کیا ہے اور کس لیے پیدا کیا ہے۔

انسان کا وجود تمام صفات حیوانیہ اور روحانیہ کا جامع ہے۔ صفات حیوانیہ اس کی نسل کو قائم رکھنے کے لیے اور صفات رُوحانیہ اس کے کامل ہونے کے لیے۔ جو انسان صرف صفات حیوانیہ پر رہ جاتے ہیں ان کو حیوان بلکہ اس سے بھی گمراہ فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ (پ ۹۔ ع ۱۲) کیونکہ وہ اصل مقصود سے دُور اور اپنے علم سے جاہل ہوتے ہیں۔ پس جو اپنے آپ سے جاہل ہو وہ اپنے غیر سے زیادہ اجہل ہوتا ہے۔

حقیقتِ رُوح

باب اوّل میں رُوح کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم اس کے جگر میں ہنوز تشنگی باقی ہے جس کو سیراب کرنا ازبس ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ انسان کی تمام حالتوں کا اصل رُوح ہی ہے۔ سب حیاتی اسی سے ہے اور تمام حالتوں کا مرجع اسی کی طرف ہے۔ یہ خارجی وجود موجودات سے ہے اور ذہنی وجود محسوسات سے۔ اس کا تعلق رُوح سے ہے اور یہ معلومات سے ہے۔ جیسے ایک پھل مثلاً بادام کو لیجیے۔ اس کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے۔ جب پختہ ہونے کے بعد درخت سے جھڑتا ہے یعنی مدت شجری ختم ہونے کے بعد اس سے الگ ہوتا ہے تو وہ چھلکا اُتر جاتا ہے۔ دُوسرا چھلکا اُتار کر مغز بادام نکالا جاتا ہے۔ پھر اس پر ایک باریک چھلکا ہوتا ہے جس کے اُتر جانے سے سفید دو کاشیں

ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کاشوں کے درمیان لطیف اور صغیر الوجود مغز بادام کی پیدائش کا سامان ہوتا ہے اور اس میں رُوح بادام ہوا کرتا ہے جو اصل اور حیاتی بادام ہے اور یہ ایک امرِ الٰہی اور شانِ ایزدی ہے جو معیتِ خداوندی سے متعلق ہے۔ اور ہر چیز کی پیدائش اس کے حکم سے ہے اور اس کا ثبات اور فنا خداوند کریم کا فعل ہے لیکن ہمارے امر و فعل کی طرح نہیں ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (پ ۵۔ ع ۴) اور خدا نے جو حکم فرمایا سو ہو چکا

دُوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ
اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (پ ۲۳۔ ع ۴) کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے۔

مولیٰ کریم کا ارادہ تو حقیقت میں کُنْ کا بھی محتاج نہیں، محض ہماری تفہیم کے لیے الفاظ کی قید رکھی گئی ہے۔ خداوند کریم مُرید ہیں، امر و فعل تابع ارادہ ہیں۔ تو جب ارادہ ہوا ہو گیا۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد اب اصل مضمون یعنی رُوح کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ (وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ) کیونکہ یہ ہستی اور حیاتی کا اصل ہے اور ہر طرح کے جسدی و عنصری وُجُود کا قیام و ثبات اسی کے ساتھ ہے۔ اس کا علم سوائے حال کے درست نہیں ہو سکتا اور حال کو قال میں لانا دُشوار ہے مگر بہت کم۔ اس لیے اگر رُوح کو مخلوق کہا جائے تو کس طرح اور قدیم کہا جائے تو کیسے؟ کیونکہ قدیم تو ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہے۔

جس طرح قرآن مجید کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے میں اختلاف واقع ہوا اور ناعاقبت اندیش عالموں نے اِس کو مخلوق کہہ کر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ سے مباحثے کیے اور حکّام وقت سے کوڑے لگوائے گئے، ایسا ہی یہ اشکال ہے۔ کیونکہ جیسے کلام ایک صفت بالذّات مولیٰ کریم ہے اسی طرح امر بھی ہے اور مخلوق کا جامہ اس پر درست نہیں آسکتا ہے۔ کیونکہ مخلوق وہ ہے جو کُنْ سے فَیَکُوْن کا لباس پہنے اور حدث کا وجود اس پر ثابت ہو جائے۔ اور یہ صفت بالفعل مولیٰ کریم ہے جو حکمِ خداوندی سے مفعول ہے۔

حضرت علی ہجویری لاہوری قدّس سرّہٗ کا فرمان مبارک کہ "رُوح مخلوق ہے اور یہ فعل خداوندی ہے" بجا و درست ہے۔ اور وہ اس طرح پر ہے کہ مخلوق میں رُوح کا تصرّف فعل خداوندی کے سوا نہیں ہے۔ اس امر یعنی کُن کا ظہور فَیَکُوْن کے مترادف ہے اس لیے مخلوق میں رُوح کا تصرف بحکمِ خدا اپنے محل و مقام کی رُو سے مخلوق کا حکم رکھتا ہے، اور متحقق بالذّات ہونے کی رُو سے غیر مخلوق۔ یعنی کُن صفت بالذّات اور فَیَکُوْن صفت بالفعل۔ اور امر ایک صفت ہے جو قدیم ہے۔ کیونکہ خواہ فعل امر صادر ہو یا نہ ہو، امر کی نفی نہیں ہو سکتی۔ جیسے حیّ، کلیم، سمیع، بصیر، علیم، مرید، قدیر۔

اور جو حضرت شیخ المشائخ علی ہجویری قدس سرّہٗ نے رُوحیوں اور حلولیوں کے قول کو باطل کہا ہے، بہت درست فرمایا ہے۔ کیوں کہ اُنھوں نے رُوح کو قدیم کہا ہے۔ جس سے اُن کی مراد خود ذات مولیٰ کریم ہے اور حکم اُن کا اسی پر ہے کہ یہ حرکات و سکنات

سب اسی کا ہے۔ اگر کہا جائے کہ "اُسی کے حکم یعنی امر سے ہے"، تو اختلاف اُٹھ جاتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ہر انسان کی چوٹی ید قدرت میں ہے (مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا (پ ۱۲-ع ۵) اور جانور پر پھیلائے ہوئے کو ذات باری تعالیٰ ہی تھامے ہوئے ہیں (اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (۶۷-۱۹-پ ۲۹-ع ۲)

علمائے ظاہر اس بات پر ہیں کہ "احاطہ اور فعل اور حفاظت یہ سب کچھ علم سے ہے" اور یہ خطا ہے، کیونکہ علم سے احاطہ بالذّات روا ہو سکتا ہے لیکن علم کا احاطہ بدوں ذات محال ہے۔ اور یہ معیّتِ خداوندی ہے جس کے علم اور معرفت کی مثال اندھوں کے ہاتھی کی سی ہے۔ اس لیے ہر ایک نے اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق بیان کیا ہے اور وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے حق پر ہے لیکن محققین کے کلام اصح اور جامع ہیں جن کو فضل ایزدی نے علم لدُن سے نوازا ہے۔ یہاں عقل و دانش عام کا تو کچھ کام ہی نہیں ؎

عاجز قیاس ہے یہاں وہم و خیال سے
نسبت کیا ہے ہمسری پتھر کو لعل سے

خداوند تعالیٰ نے انسان کو اپنی سرشت پر یعنی اپنی صفت پر پیدا کیا ہے اور اس محدث وجود کو اپنی صفت کا محل بنایا ہے۔ گو یہ محال ہے کہ محدث قدیم کا محل ہو، لیکن یہ اس امر کا منافی نہیں ہے کہ اس کی تعریف اور صفت نہ ہو۔ بلکہ کل مخلوق خالق کی صفت اور تعریف ہے اور سب کی ہستی مولیٰ کریم ہی سے ہے اور انسان کو اس صفت سے خاص کیا

ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ذات قدیم کے لیے نہ کوئی محل ہے نہ مکان، اس لیے محال ہے کہ محدث اس کا محل ہو۔ لیکن خالقیت کی تعریف کے ضمن میں کُل مخلوق صفت خالق کا ظہور ہے جو صفت بالفعل کے مترادف ہے۔ ذوالجلال والاکرام نے اپنے امر سے جس کو رُوح سے موسُوم کیا ہے اور تحقیق کے میدان میں نص قطعی سے کُنْ یعنی امر ہونے کی صورت میں نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کا اطلاق غیر مخلوق پر دال ہے، مشیت ایزد متعال نے اپنی سرشت پر رُوح کو بشریت کے پردے میں ودیعت فرمایا ہے اور انسان کو اس صفت میں خاص کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ	اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے لوگوں
عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ	کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی میں تغیر و تبدل
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ مُنِيْبِيْنَ	لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف رجوع کیے
اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	رہو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز پڑھتے
وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝	رہو اور مشرکوں میں سے مت ہو جیو۔

(پ ۲۱ - س روم ۳۰ : ۳۰ - ۳۱)

انسان کو مولیٰ کریم نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، نہ تبدیل ہو گی کبھی یہ سرشت۔ (مفسرین اس بات پر ہیں کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اسلام پر یعنی ہر بنی آدم کی فطرتِ انسانیہ اسلام پر ہوئی، خواہ بعد میں ماں باپ اسے یہودی بنالیں یا نصاریٰ یا مجوسی لیکن

اس صورت میں لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ کا مفہُوم غلط ثابت ہوتا ہے۔ حدیث شریف کا ثبوُت دیا ہے جو اپنے محل پر صحیح اور درست ہے اور حدیث شریف میں بھی فطرت ہی کا لفظ آیا ہے۔ مفہومی غلطی کی وجہ سے فطرت کا ترجمہ اسلام کر دیا ہے)۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ	اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔

خداوند قدوس صورتوں اور شکلوں سے پاک ہیں اس لیے اس سے مراد محض صفت اور سرشت ہی ہے اور مولیٰ کریم کی صفات ذاتیہ سات ہیں: قادر[۱]، حیّ[۲]، مرید[۳]، سمیع[۴]، علیم[۵]، بصیر[۶]، کلیم[۷]۔ تو ان ہی صفات سے انسان کو مزیّن فرمایا ہے اور اسی کو قیم اور سیدھا راستہ بتلایا ہے، کیونکہ اس کے بغیر راستہ نہیں پا سکتے چنانچہ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدّس سرّہ فرماتے ہیں کہ "اگر تو چاہے کہ مولیٰ کریم کا رستہ پائے تو زمین و آسمان میں نہ ملے گا اپنے دل کے گرد پھر، پالے گا۔" اگر منظور خدا ہوا تو اپنے موقع پر مفصل ہو گا۔ اب اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں تاکہ طوالت باعث ملالت نہ ہو۔

تو اب دیکھنا ہے کہ امر صفت مولیٰ کریم ہے جس کا مبدا ارادہ ہے اور مرید ہونا ربّ العالمین کی ایک صفت صفات ذاتیہ میں سے ہے۔ اور ہر صفتِ مولیٰ کریم اپنی صفت کی مقیّد بھی نہیں بلکہ ہر وصف ذاتیہ واصف کل لامحدُود ہے۔ تو پھر امر مخلوق امر خالق کے مانند کیسے ہوں؟ امرِ الٰہی تو ایک شان و نشانِ ایزدی ہے۔ دیکھیے! قرآن شریف میں کیا ارشاد ہو رہا ہے:

لطیف قول ہے جو امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، کیونکہ ربّ کو ربّ کے غیر سے پہچاننا محال ہے، اور یہ حال کے سوا نہیں ہے۔

ارشاد مولیٰ کریم ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ — یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں،

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (پ ۲۶۔ ع ۱۸) — اور تمہارے اپنے نفسوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں؟

اور حدیث شریف میں وارد ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ — جس نے پہچانا اپنے نفس کو بیشک اس نے پہچانا اپنے رب کو

فَہِمَ مَنْ فَہِمَ؟

انسان پر عرفِ الٰہی میں جو مشکل پیدا ہوئی ہے کسی اور مسئلہ کے لیے واقع نہیں ہوئی۔ بدیں وجہ جو کسی کی سمجھ میں آیا وہی ٹھان لیا۔ چشم بصیرت سے اندھے، حقیقت سے بے خبر، اپنے ظن کے ٹٹو پر سوار، میدان توحید میں اپنے زعم سے گیند عرف کو انتہائے مقصود پر لے گئے ہیں، اور اپنے جہل کو کمالِ معراج سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ عقل و قیاس کا راستہ ہی نہیں۔ بقول بزرگے "عقل بڑی چیز ہے لیکن جس ترازو سے سونے چاندی کو وزن کیا جائے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہاڑ کو بھی تول سکیں"۔ عقل کا احاطہ موجودات اور محسوسات تک ہے، اور یہ میدان اس سے وراء الورا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ علم یعنی خبر صادق قرآن حکیم سے سنا یا پڑھا، اس کے مفہوم کو اپنے ہی قیاس و خیال کے سانچہ میں ڈھال لیا۔ مثلاً:

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (پ ۸۔ ع ۱۴) کی تفسیر میں کہا کہ "خداوند تعالیٰ برتر سب آسمانوں کے عرش پر بیٹھا ہے، اور جب کرسی پر بیٹھتا ہے تو وہ چیختی ہے"۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) اور نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (پ ۲۶۔ ع ۱۶۔ ہم اس کی طرف شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (پ ۱۴۔ ع ۱) ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) و مثلہا آیات کے متعلق کہا کہ "یہ فعل فرشتوں کا ہے، چونکہ وہ ذات معلیٰ آمر ہے اس لیے اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے"۔

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ — اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہیں، تم

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (پ ۱۔ ع ۱۴) — جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ متوجہ ہے۔

میں وَجْہُ اللّٰہ کو صاف جہت قرار دیا ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ۚ وَھُوَ — نہیں ہے مانند و مثل اس کے کوئی چیز اور

السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ (۴۲ : ۱۱۔ پ ۲۵۔ ع ۲) — وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

کو اپنی ہی مانند خیال کیا ہے۔

فرمان مولیٰ کریم ہے:

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (پ ۲۶۔ ع ۹) — بیعت رضوان والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ — جس دن کہ کھولا جائے گا پنڈلی سے اور سجدے

یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ۝ (پ ۲۹۔ ع ۳) — کے لیے بلائے جائیں گے تو نہ کر سکیں گے (۶۸ : ۴۲)

اب اگر ہاتھ اور پنڈلی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی مخلوق کے ہاتھ اور پنڈلی کی مانند خیال کیا جائے تو سخت فتور لاحق ہوگا، اور پھر بُت پرستی اور خدا پرستی میں کچھ فرق نہ رہے گا۔

عزیزا! یہ عقل کی ردّو کد کا مقام نہیں، عقلِ کُل اس جگہ درکار ہے، جو محض فضلِ ایزد متعال ذوالجلال والاکرام ہے۔ اور یہ عقل تو موجودات کے سمجھنے میں بھی عاجز ہے۔ مولیٰ کریم تجھے اپنے علم کی سمجھ عطا فرمائے، غور کر! کہ ہوا ایک لطیف وجود عناصرِ موجودات میں سے ہے۔ سوائے فعل ہوا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ جس کے بعد جب حکمِ خدا سے متحرک ہوتی ہے تو سب بے ساختہ بول اُٹھتے ہیں کہ آہا! ہوا آگئی، حالانکہ کرۂ ہوا میں خلا ممکن ہی نہیں۔ سوائے حرکت و سکون کے فعل کے آنا اور جانا روا نہیں ہو سکتا۔ تو مولیٰ کریم کے نزول و عرُوج سے کیا علم ہو سکتا ہے؟

ہوا جب تیز چلتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ہوا بڑی تیز چل رہی ہے۔ حالانکہ چلنا یا دوڑنا پاؤں کے عمل سے ہوا کرتا ہے۔ اور کسی چیز کو اکھاڑ کر پھینکنا ہاتھ کی نسبت سے ہوا کرتا ہے۔ اور یہ ہوا کا فعل ہے کہ بڑے سے بڑے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اب ہوا کے ہاتھ اور پاؤں میں عقل سے تمیز ہونی چاہیے، جو محال ہے۔ تو خالقِ موجودات میں اس قسم کا نشان دینا یا سمجھنا سوائے جہالت کے اور کیا ہو سکتا ہے؛ جو عالمِ موجودات تو کیا تمام عالموں سے بالاتر اور لطیف تر ہے۔

حضرت امیر کبیر سیّد علی ہمدانی صاحب قدّس سرّہ العزیز نے اپنے مکتوبات شریف میں تحریر فرمایا ہے کہ عالمِ موجودات یعنی عالمِ ناسُوت سے عالمِ جبروت لطیف

اور عالمِ جبروت سے عالمِ ملکوت لطیف تر ہے۔ اور عالمِ ملکوت سے عالمِ لاہوت لطیفِ لطیف ہے۔ اور عالمِ لاہوت سے عالمِ ہاہوت لطیف در لطیف تر ہے، اور ذاتِ معلیٰ خالقِ کُل ان سب عالموں سے بالاتر لطیف در لطیف در لطیف ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ	نہیں پا سکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پاتا ہے
يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ	سب آنکھوں کو اور وہی ہے باریک بین
الْخَبِيْرُ ٥ (۶: ۱۰۴ - پ ۷ - ع ۱۹)	خبردار۔

اس لیے اس آنکھ سے دیدارِ الٰہی کا ہونا محال اور ناممکن ہے۔ لیکن یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ بس دیدارِ الٰہی نہ کسی کو ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ بلکہ دیکھو فرمانِ ایزدی کس کڑوفر سے وعید کر رہا ہے کہ:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى	اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت
فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ	میں بھی اندھا ہے، اور راہ راست سے
سَبِيْلًا ٥ (۱۷: ۷۲ - پ ۱۵ - ع ۸)	بہت ہی بھٹکا ہوا ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ! یہ کلام پاک اپنی آپ ہی تفصیل اور تفسیر ہے۔ کیسا ہی عمدہ اور برتر فیصلہ کیا ہے۔ فرمایا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ	ہاں تو وہ اصلیت یہ ہے کہ یہ آنکھیں اندھی
وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي	نہیں ہوتیں ولیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں
الصُّدُوْرِ ٥ (۲۲: ۴۶ - پ ۱۷ - ع ۱۳)	جو سینوں کے اندر ہیں۔

گو بصارت قلبی کا راستہ بھی یہی آنکھیں ہیں لیکن اس آلہ کی محتاج نہیں۔ خواہ یہ بگڑ گیا ہو اور بظاہر بند بھی ہو گیا ہو۔ بموجب ارشاد ذاتِ معلیٰ بظاہر جوارح اس کی معرفت سے عاجز ہیں تاہم ذکر میں یہی آنکھیں فرمائی ہیں۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے:

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ	اور اس دن ہم جہنم کو ایسے کافروں کے روبرو
لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًاۨ ۙ الَّذِيْنَ	پیش کریں گے جنکی آنکھیں میرے ذکر سے
كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ	پردے میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت
ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	نہیں رکھتے تھے۔
سَمْعًا ۝ (۱۸: ۱۰۰-۱۰۱- پ ۱۶ -ع ۲)	(سورۂ کہف ۱۸، آیت نمبر ۱۰۰-۱۰۱)

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر ایک اعضاء کا فعل ہی اس عضو کی عبادت یا ذکر ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر زبان کا ذکر قرآن مجید کی تلاوت یا اسمائے الٰہی کا ذکر، یا درود شریف کا ورد اور وعظ و پند، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دین کی تعلیم ہے۔ اسی طرح کان کا ذکر ان چیزوں کا سننا اور ہاتھ کا ذکر طاقت کا دین کے کاموں میں خرچ کرنا ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس پاؤں کا ذکر چلنا ہوا کرتا ہے، خواہ جہاد کے لیے یا حج ادا کرنے کے واسطے۔ اسی طرح آنکھ کا ذکر سوائے دیکھنے کے نہیں ہو سکتا ہے، جو محض دیدارِ الٰہی ہے۔ کیونکہ سوائے اس کے آنکھوں کا کوئی ذکر درست نہیں ہو سکتا ہے۔ قرآن شریف کے حروف کو پڑھنے کے لیے دیکھنا گو آنکھوں کی عبادت تو ہے لیکن اُمّی شخص جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو، کافر نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ نیک کردار اور صالح ہو۔ اور یہاں پر جن کی

آنکھیں یادِ الٰہی سے پردے میں تھیں انہیں کافر کہا گیا ہے۔

اگر معرفتِ الٰہی کو تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو ایک الگ کتاب چاہیے۔ اس لیے اختصار کے پیش نظر اسی قدر پر اکتفا کیا گیا ہے ٭

معیّتِ خداوندی

عُرف یا معیّت خداوندی کا علم و عُرف جس کا اصل ایک ہی ہے، ظاہر سے مطلقاً نسبت نہیں رکھتا۔ جیسے اُوپر گزر چکا ہے کہ عالم ناسوت سے عالم جبروت لطیف ہے اور عالم جبروت سے عالم ملکوت لطیف تر ہے۔ اور عالم ملکوت سے عالم لاہُوت لطیف در لطیف ہے، اور عالم لاہوت سے عالم ہاہوت لطیف در لطیف در لطیف ہے گو اس ہر عالمِ کثیف کو عالمِ لطیف سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن یہ ایک دُوسرے سے منفک اور ایک دوسرے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ ہر ایک لطیف عالم کو اپنے قریب کے عالمِ کثیف سے تعلق ہے۔ مثلاً ہاہوت کو لاہوت سے، اور لاہوت کو ملکوت سے، اور ملکوت کو جَبرُوت سے، اور جَبرُوت کو ناسُوت سے ایسا ہی تعلّق ہے جیسا روشنی کو روغن سے، اور روغن کو مغز سے، اور مغز کو وُجُود سے، اور وُجُود کو اپنے شجر سے، اور شجر کو اپنی جڑھ سے یا عناصرِ ارضی سے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ	نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس

اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ	میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے
كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ	اور قندیل گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔ اس میں
شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ	ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے۔ وہ
وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ	درخت زیتون ہے کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ
وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ	مغرب کی طرف۔ اس کا تیل جلنے کو تیار ہے خواہ
عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ	اسے آگ نہ بھی چھوئے۔ روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔
مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ	خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ
الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ	دکھاتا ہے اور لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا
شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ (۲۴ : ۳۵۔ پ۱۸)	ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ارشاد ایزد متعال ذوالجلال والاکرام اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے جس نور کی مثال کَمِشْکٰوۃ بیان فرمائی ہے۔ اب اگر اس مثال کو کسی خاص شخص پر منسوب کیا جائے، جیسا کہ بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے تو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا فائدہ نہیں رہتا۔ اس لیے کہنا ہی پڑے گا کہ کل موجودات فی السموات والارض مثل روشندان کے ہے۔ اور زجاج عالم محسوسات سے اور چراغ مانند معلومات کے ہے۔ اور روشنی مانند معروفات کے ہے۔ فرمان حضرت عمر خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ یعنی پہچانا میں نے اپنے رب کو رب کے نور سے، مطابق فرمان مولیٰ کریم یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ہے۔ یعنی اللہ جل شانہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے، ہدایت

دیتا ہے۔

عزیزا! مولیٰ کریم تیرے لیے آسان کرے، سمجھ! عالم موجودات سے عالم محسوسات کا احاطہ وسیع ہے، اور عالم محسوسات سے عالم معلومات کا احاطہ وسیع تر ہے، اور عالم معلومات سے عالم معروفات کا احاطہ بہت ہی وسیع ہے۔ اس سے ورا عالم امر ہے، جو ان سب سے بالاتر ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ ان سب عالموں سے بدرجہا بالاتر ہے۔ عالم موجودات وہ ہے جو موجود ہے۔ جس کے لیے آنکھ سے دیکھنا یا ہاتھ سے ٹٹولنا روا ہے۔ اور یہ لطیف ہو یا کثیف، مادیات سے ہے۔ اور عالم محسوسات اثرات سے متعلق ہے جس کا ماخذ حواس خمسہ ہی ہیں، خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ مثلاً گرمی سردی کا لگنا، درد کا ہونا، بخار کا چڑھنا اترنا، اور رنج و راحت سے متاثر یا کسی اثر سے رنجیدہ، غمناک اور خوش ہونا ہوتا ہے۔ اور عالم معلومات علم سے علاقہ رکھتا ہے۔ جو کسی چیز کے عرف سے جاننا اور پہچاننا ہوتا ہے، جو قوت حافظہ کے سپرد ہو کر دماغ میں قرار پکڑتا ہے اور یہ ظن اور گمان کے سوا نہیں ہے۔ عالم معروفات علم عرف سے متحقق ہوتا ہے، اور یہ بصیرت قلبی سے ہے۔

علم اصول کے لحاظ سے ظنّ اور گمان سے نسبت ہے، اور عرف حکم۔ مثال اس کی اس طرح پر ہے کہ ایک گھڑا پانی سے بھرا ہوا سامنے پڑا ہے۔ جس کی تراوت کو دیکھنے سے یہ گمان اور ظنّ غالب ہے کہ اس میں پانی ہے، اور یہ علم الیقین ہے جب چپنی اٹھا کر پانی کو آنکھ سے دیکھ لیا تو عین الیقین حاصل ہو گیا۔ اور اگر اس کو چکھ کر پی کر

اس کی کیفیت سے شناسا ہوا تو حق الیقین حاصل ہو گیا۔ تب ظن یا گمان باقی نہ رہا، تو حسب الحکم اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (پ۱۱۔ ۸)۔ یقیناً ظن حقیقت سے کچھ بھی کفایت نہیں کرتا) عُرف حاصل ہو گیا۔ کیونکہ جب روئت حاصل ہوتی ہے تو ظن باقی نہیں رہتا۔ اس سے بالاتر عالم امر ہے جو شان ایزدی اور صفات ذاتیہ مولیٰ کریم سے ہے۔ اور وہ عالم ارواح سے متعلق ہے۔ جس کے لیے ارشاد ہوتا ہے: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔

عالم امر یا حکم سے بدرجہا بالاتر وہ احکم الحاکمین کی ذات معلیٰ ہے جس کے عُرف یا معیّت کا علم محض فضل ایزدی سے وابستہ ہے۔ ان سب عوالم کو ایک دوسرے سے لطافت اور مدارج کے لحاظ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن تعلق یا واسطہ کے لحاظ سے ہر ایک عالم اپنے قریب کے عالم سے رشتہ دار ہے۔ یعنی احکم الحاکمین کو اپنے حکم سے یا آمر کو اپنے امر سے، اور امر کو میدان عُرف سے، اور عُرف کو علم سے اور علم کو حواس خمسہ سے، اور حواس خمسہ کو جسمانیّت یعنی عالم موجودات سے رشتہ ہے۔ لیکن احکم الحاکمین یا اس کے امر سے (جو سب علم اور عُرف کا اصل ہے) علم بغیر عُرف کے ہونا محال ہے۔ اور عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔

تو جب ایزد متعال ذوالجلال والاکرام نے اپنی قدرت کاملہ سے نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کی نعمت بے بہا کو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاکی پتلا میں ودیعت فرمایا۔ یعنی حیاتی کو وجود کا، روح کو بُت کا، انسان کو بشریّت کا، اصل کو فرع کا، مجمل کو مفصّل کا، اور سِرّ کو ظہور کا لباس پہنا دیا۔ تو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

کے ارادہ پہ کلام کرنے والے ملائکہ کو اپنی شان لازوال کے تصرف اور علم لدُنّی کے القا اور ظہور سے متنبہ کرتے ہوئے اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ کا حضرت آدم علیہ السلام کو ارشاد ہوا۔ تب خلیفۃ اللہ عالم امر کی مقدس حقیقت کو قلب اطہر کے ظرف میں لیتے ہوئے میدان عُرف کی طرف قدم زن ہوئے، اور علم کُل سے عالم ہو کر احاطۂ احساس کی راہ موجودات کے نام بتا دیے۔ تب ملائکہ کی طرف مخاطب ہو کر خالق موجودات نے فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٭

نفس

لغت کے لحاظ سے نفس کسی شئے کی ذات کا نام ہے۔ اس میں بھی بہت اقوال ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک نفس کے معنی جسم ہیں۔ بعض نفس سے سانس اور بعض خون مراد لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام نے اس کے معنی خصائل ردیہ، اخلاق کمینہ، عادات سفلیہ اور خواہشات رذیلہ کے لیے ہیں، اور وہ کسی حد تک درست ہیں۔ بارشاد حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش صاحبؒ یہ سب صفات نفسیہ ہیں۔ ضرور ہے کہ صفات کے لیے عین ہو جس میں یہ صفات پائے جائیں۔ اور اس کے تین درجے ہیں:

ایک بموجب ارشاد اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ بُرائی کی طرف حکم کرنے والا ہے۔

دوسرا درجہ نفس لوّامہ ہے جس کے متعلق لَاۤ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۙ وَ لَاۤ اُقْسِمُ

بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ میں اشارہ ہے اور اس کے دو رُخ ہوتے ہیں، کبھی ہدایت کی طرف اور کبھی غفلت کی جانب۔

تیسرا نفس مطمئنہ، ذات معلیٰ سے استقامت رکھنے والا۔ قرآن حکیم میں ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔

تو معلوم ہوا کہ نفس کے صفات بدلتے رہتے ہیں اور مجاہدہ سے یہ پاک اور نیک بلکہ خداوند تعالیٰ کا مقرب اور مطمئن ہو سکتا ہے، اِلّا ماشاء اللہ۔ تو نفس عین ہوا نہ کہ صفت۔ اور وجود یا خون یا سانس کے معنی درست نہیں ہو سکتے کیونکہ جب جسم بے رُوح ہو جاتا ہے تو یہ سب معنی فوت ہو جاتے ہیں۔

ہر چند نفس اور انسان میں سندات کے لحاظ سے یعنی قرآن شریف کی آیات سے کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے، اور اصل یہی ہے کیونکہ رُوح اور وجود کے سوا تیسری چیز اگر کوئی ممکن ہو تو بغیر رُوح کے اس کا اثبات ہونا چاہیے، اور یہ محال ہے۔

چونکہ میرا اسلوب بیان اس کتاب میں "انسان فی القرآن" ہے، اس لیے مجبور ہوں اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ رُوح اور وجود کے اختلاط سے نفس پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ابھی ظہورِ انسان نہ تھا یعنی خاکی جسم سے مبرّا تھا اور ذکر کے قابل نہ تھا۔ ذکرِ انسان کی ابتدا (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) اس خاکی پُتلا میں رُوح پھونکنے سے پہلے نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اس کے لیے ارشاد ہوتا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ یعنی انسان پر ایک وقت تھا کہ وہ ذکر کے قابل نہ تھا۔ گویا

وہ ایسی چیز تھا جو ذکر کے قابل نہیں۔ گو عالمِ ارواح یا عالمِ امر کا ذکر فی القرآن ہے لیکن اس کے علم اور حال سے واقف ہونا سوائے اس وجود کے نہیں ہے۔ ہاں انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے لیے یہ قید نہیں جس کا ذکر ان شاء اللہ اپنے موقع و محل پر ہوگا۔

مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "یہ وُجود ذہنی اور لفظی کی نفی ہے اتحادی وجود کی نفی نہیں" پھر نفس کا تو ذکر ہی کیا۔ حضرت آدم علیہ السّلام کا ذکر اگر قبل از پیدائش خارجی ہوا تو وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے سوا نہیں ہے جو محض ارادہ الٰہی کا اظہار ہے۔ بعد میں فرمایا فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ یعنی جب میں اسے درست کر کے اس میں اپنی رُوح سے پھونک دوں تو اے گروہ ملائکہ! تم اس کے لیے سجدے میں گر جانا۔ پھر جنّت میں لبانا اور لغزش کی وجہ سے اِهْبِطُوْا مقام میں مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ کی قید لگا کر میدان دنیا میں ٹھیرانا وغیرہ واقعات ظہور میں آئے۔ لیکن یہاں بھی رُوح اور مٹی کے بُت کے سوا تیسری چیز کا نام نہیں۔ کئی مقام پر قرآن کریم میں "نفس" کا لفظ ہی انسان پر بولا گیا ہے۔ اب ناممکن ہے کہ نفس بغیر رُوح خواہشات اور صفات سیّئہ سے متّصف وجود میں کوئی تیسری چیز ہو، تاکہ اس کو عین کہیں۔ سو یہ سب صفات حضرتِ انسان ہی میں پائے جاتے ہیں، جو مظہر کُل ہیں۔

حضرت علی ہجویری قدّس سرّہٗ نے لکھا ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ اَیْ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ

عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ وَیُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالذُّلِّ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْعِزَّةِ وَیُقَالُ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْعُبُوْدِیَّةِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالرُّبُوْبِیَّةِ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا یعنی جس نے اپنے نفس کو فانی سمجھا اس نے اپنے رب کو باقی سمجھ لیا۔ اور کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو ذلت سے پہچانا اس نے پہچانا اپنے رب کو عزّت سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو عبُودیت سے پہچانا اُس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچانا۔ پس جو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ سب معرفت سے محجوب رہتا ہے۔ اور اس سبب مراد اس جگہ انسان کی معرفت ہے۔ اور لوگوں کا اختلاف اس میں آپس میں معارضہ کے سبب ہے۔

کیا ہی خوب اور درست کہا ہے۔ مولیٰ کریم ان کا بھید زیادہ سے زیادہ پاک کرے۔ الحمد للہ رب العٰلمین۔ آخر انسان یا انسان کی بہیمیت ہی کو نفس کہنا پڑے گا۔ کیونکہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کو ہر طرح کی خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ ماں سے انس اور خوراک کے لیے دودھ کی ضرورت، رفتہ رفتہ خوراک ولباس، دوست و دشمن کا احساس، بڑا ہو کر حرص وشہوات کا بندہ اور تفاخر و عزّت کا شیدا ہو جاتا ہے جو سراسر مایۂ نفس ہے۔ روحانیت کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ تعلیم اور علم کے بغیر نہ خدا کا پتہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرف۔ خورش و پوشش اور خواہشات حیوانیہ کے سوا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ انہی صفات کی بنا پر مولیٰ کریم نے ارشاد فرمایا:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ	ایسے لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (پ۹۔ ۱۴)	بھی زیادہ گمراہ۔ اور یہی غافل لوگ ہیں۔

اپنی صفت اور حال میں تو حیوانوں کی مانند ہیں، اور اشرفُ المخلوقات انسان ہو کر حیوانی صفات میں رہنا ان سے زیادہ گمراہ ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی صفات حیوانیہ اور صفات رُوحانیہ یعنی طاقت وہمت، فکر وعقل، سعی اور ارادے جو سب روح سے وابستہ ہیں، دُنیوی زندگی کے فوائد اور بدنی تعیّش کے حصُول کے لیے محنت اور تکلیف اُٹھاتے ہوئے خرچ ہوتے جاتے ہیں۔ سوائے موت کے کوئی بھی چیز نہیں جو ان کو حیران پریشان اور مرنے کے بعد کی فکر کے لیے مجبُور کرے اور وہ بھی شاذ۔ ہر ایک انسان ایسی غفلت میں مستغرق ہو رہا ہے کہ لمحہ بھر کے لیے بھی ادھر متوجہ ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک تو یہ ایک حادثِ زمانہ سمجھی جاتی ہے کہ "ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو نظام دنیوی کیسے رہ سکتا ہے؟ بوڑھے زیادہ عمر میں خوار ہو جائیں" وغیرہ وغیرہ۔ نہ یہ علم ہے کہ انسان کیا چیز ہے، کہاں سے آیا، اور کہاں گیا، اور اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ بعض اسی سبب سے دہریہ بن گئے اور کافر ہو گئے۔ آخرت پر ایمان لانا ان کے لیے ایک خام خیالی اور من گھڑت باتیں متصوّر ہوئیں جیسا کہ قرآن شریف میں تصریح کے ساتھ فرمان ایزدی بآواز بلند پکار کر غفلت کی نیند سے جگا رہا ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	اور انہوں نے کہا کہ بس یہ ہماری دنیا کی زندگانی
نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا	ہی ہے کہ ہم مرتے جیتے ہیں اور ہم کو زمانہ ہی
الدَّهْرُ (۴۵: ۲۴۔ پ۲۵۔ ۱۹)	ہلاک کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا	اور انہوں نے کہا کہ بس یہی ہماری دنیا کی زندگی
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓی	ہی ہے اور ہم (مرنے کے بعد) پھر زندہ نہیں
اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ	کیے جائیں گے۔ تم تعجب کرو گے جب ان کو
هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ	دیکھو گے کہ پروردگار کے سامنے کھڑے کیے
قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ	جائیں گے اور وہ کہے گا کیا یہ (دوبارہ زندہ ہونا)
تَكْفُرُوْنَ ۝ (۶: ۲۹-۳۰۔ پ ۔۹)	برحق نہیں؟ تو جواب دیں گے کیوں نہیں، پروردگار

کی قسم (بالکل برحق ہے) خداوند کریم فرمائیں گے تو جو کفر کرتے رہے ہو اس کے بدلے عذاب کے مزے چکھو۔

کاش! کہ آج اس وقت کو جانتے جب کافر افسوس کے ہاتھ مل کر کہے گا:

یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (پ۳۰۔ ۲) اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔

یعنی انسان (جس کی حیات ابدی ہے) نہ ہوتا، تاکہ عذاب سے بچ جاتا۔ آخرت کی ہستی کے انکار کی وجہ سے ایمان اور عمل سے بے بہرہ رہتا رہا۔ وہ یقین جو مر کر نہ اُٹھنے پر تھا، جاتا رہا اور آخرت کی حیاتی جو ہمیشہ کی حیاتی ہے، اس پر یقین آگیا۔ تب یٰلَیْتَنِیْ کی صدا بلند ہوئی اور اپنے کیے پر نادم اور گناہ کا اقرار اور بے نہایت وغایت نقصان سے علم ہوگیا۔ اب اگر خواہش ہوئی تو یہ کہ ایک دفعہ دنیا میں جانا نصیب ہو۔ بفرمانِ الٰہی:

اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَی الْعَذَابَ	یا جب عذاب دیکھ لے گا تو کہنے لگے گا کہ اگر
لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ	مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہو تو میں

الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (پ۲۴۔ ۳) نیکوکاروں میں ہو جاؤں۔

مگر بے سود، کہاں لوٹنا اور کیسا واپس جانا۔

اب یہ جو کچھ بھی ہوا، ہر چند اسباب مختلف ہیں لیکن اصل سبب اور عام صورتوں میں بہیمیت یعنی نفس کا حجاب ہی سدِ راہ ہوگیا۔ ورنہ نجات کا خیال ہر بشر کو لگا ہوا ہے۔ موت کے بعد جی اُٹھنے کے لیے عمل صالح، خشوع وخضوع، عجز ونیاز، خوف ورجا، فکر، قلق، سعی ومحنت وغیرہ جن کی ضرورت تھی، نفس پر شاق اور گراں گزرے اور بظاہر حیاتی اور حظوظ نفسانی پر فریفتہ ہو کر انکار کرنا آسان معلوم ہوا۔ سچ ہے کہ "جاہل کے لیے دو رکعت نماز باخلاص پڑھنا دوزخ میں داخل ہونے سے زیادہ دشوار ہے"۔

چونکہ یہ دنیا میدان آزمائش اور یہ وجود آزمائش کا اصل ہے اس لیے اس کے اسباب نہایت قوی ہیں کیونکہ رُوح کے توسل سے عناصر اربعہ کی گھڑت میں جو قوتیں پیدا ہوئیں جن کو حواس خمسہ کہنا بجا ہے، ان سے ہر طرح کا احساس پیدا ہوا۔ آنکھ نے جو دیکھا کانوں نے سنا، زبان چکھنے سے آشنا ہوئی اور باقی جوارح کو مس سے تاثیر ہوئی۔ ان سب کی تاثیر کا اثر دماغ میں پہنچا اور قوت حافظہ کے سپرد ہو کر قلب پر ہویدا ہوگیا۔ اس تاثیر کے جذب سے ہزارہا کیفیات کا پیدا ہونا شروع سے ثابت ہے۔ مثلاً آنکھ جب کسی خوبصورت چیز کو اخذ کرتی ہے تو دل فوراً اس کی مزید طلب کے لیے بے تحاشا للچانے لگتا ہے گویا یہ دو زہر آلودہ تیر بلا ارادہ دل کو ڈس لیتے ہیں۔ طرفہ ماجرا یہ کہ جو اثر بد یا نیک دل پہ ہوتا ہے وہ اسی اثر کو زیادہ چاہنے لگتا ہے، حتیٰ کہ رات دن اسی تصور

کی تصویرِ حیرت بن جاتا ہے۔ آخر اس کی محبت دل میں گھر کر لیتی ہے اور عشق تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ جان بھی قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل کام نہیں کرتی، تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ نفع و نقصان کی سمجھ دماغ سے اُٹھ جاتی ہے اور ایک دُھن میں سیدھا قوّتِ ارادی سے بلا کے گڑھے میں گرا جاتا ہے۔

دراصل اس ساری کارگاہِ حیات میں نفس یا انسان کی ان تینوں صفات یعنی نفس امّارۃٌ بالسّوء، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنّہ ہی کا ظہور ہے جن کی تفصیل آئندہ اوراق میں پھیلی ہوئی ہے۔

امانتِ الٰہی کا حامل

کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ جذباتِ نفس (امّارۃ بالسّوء) جن کا مختصر بیان اوپر کیا گیا ہے مولیٰ کریم کی طرف بڑھتے اور جس مقصود کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے، حاصل کرتا۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تمیز سے اس کا دماغ درست ہو جاتا اور یہ اپنے صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کو پہچان لیتا۔ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ سے عالم ہو کر حیاتِ ابدی سے عارف ہو جاتا۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کی حقیقت اس پر روشن ہو جاتی، تب اس امانت کا حق ادا ہوتا جس کو زمین و آسمان اُٹھانے کی تاب نہ لا سکے، پہاڑ اس کی بار آوری سے دم بخود ہو کر رہ گئے اور مشیّتِ ایزدی نے

اپنی خاص حکمت سے اس کو اُٹھانے کی جرأت دی اور وہ بے بہا نعمت اس کے قلب میں ودیعت فرما کر اس کو امین کے اسم سے موسوم فرما دیا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	ہم نے بارِ امانت کو زمین آسمان اور پہاڑوں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	پر پیش کیا تو انہوں نے اس کو اُٹھانے سے
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ	انکار کیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے
حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا	اس کو اٹھایا۔ بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا تاکہ
جَهُوْلًا ۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ	عذاب کرے اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ	اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اور مہربانی
وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	کرے اللہ مومن مردوں پر۔ اور اللہ بخشنے والا
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (پ۲۲ - ع۹)	مہربان ہے۔

ہر چند امانت پر مفسّرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک امر نہی اور عبادت الٰہی ہے، اور اکثریت اسی پر ہے۔ اور بعض نے اس کو محبت کہا ہے لیکن سوائے محبت کے امانت کے وجود پر کوئی دوسرا لباس درست نہیں بیٹھتا۔ کیونکہ امانت اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بطور ودیعت کسی کے سپرد کی جائے۔ اور امر و نہی کا جمع کرنا انسانی فعل کا مقتضی ہے۔ اگر یہ ہی کہا جائے کہ امر و نہی اور اطاعت و عبادت بارِ امانت ہے اور یہ اس کا اُٹھانے والا ہے تو زمین و آسمان کی کوئی چیز اس سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد کلام پاک ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ	جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں، سب
مَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ	خدا کی تسبیح کرتی ہے، جو بادشاہ حقیقی، پاک
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (۶۲ : ۱۔ پ ۲۸۔ ع ۱۱)	ذات، زبردست، حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (پ ۲۷۔ ع ۱۱)	بوٹیاں اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کوئی آسمانوں میں اور
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ	زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور
كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۝	جانور پر پھیلائے ہوئے بھی سب اپنی نماز اور
(۲۴ : ۴۱۔ پ ۱۸۔ ع ۱۳)	تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں۔

اس مضمون کی بہت سی آیات کلام مجید میں وارد ہیں اور ہر چیز امر کی خوشی سے تابع ہے تو پھر اَبَيْنَ اور اَشْفَقْنَ کا فائدہ نہیں رہتا۔ بار امانت کی علت تو آزمائش ہے۔ تاکہ آزمائیں ہم منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مُشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو امانت میں خیانت کی رُو سے، اور مومن مرد عورتوں پر مہربانی کریں۔

حامل امانت ہونے میں مومن مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب انسان شامل ہیں۔ لیکن مومن کو اس خیانت کے ظلم اور شرک میں ملبوس ہونے سے مستثنیٰ فرمایا ہے اور مشرک اور منافق کو بوجہ شرک اور نفاق کے عذاب کی وعید سنا کر ڈرایا ہے۔ ہر چند انسان میں

دونوں جہان سے نشان ہیں۔ یہ شرف و بزرگی اسی وجہ سے ہے کہ اس کا معاملہ مولیٰ کریم سے محبت کا ہے اور یہ اس کا حامل ہونے میں مخصوص ہے۔ باقی صفات حیوانیہ تو کُل حیوانات میں پائی جاتی ہیں لیکن محبت کا جامہ سوائے انسانی وجود کے کسی دوسرے پر درست نہیں آسکتا۔ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (پ ۶۔ ع ۱۲) کی دولت اس خاکسار ہی کے نصیب میں آئی ہے۔ لیکن فرمان ایزدی کے مطابق یہ محبت کے عُرف سے بھی جاہل ہے اور اس کے غیر محل پر صَرف کرنے کی بنا پر ظالم اور مشرک۔

یاد رہے کہ محبت اور چیز ہے اور ضرورت اور رغبت اور چیز۔ ہر ایک انسان اور حیوان کو خوراک کی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے جب خواہش کی گئی چیز اس کو نہیں ملتی تو اس کی طلب میں بے قرار ہوتا ہے، مل جانے پر بڑا خوش ہوتا ہے۔ لیکن سیر ہو کر کھا لینے کے بعد جب ضرورت نہیں رہتی تو اسی چیز کو جس کی طلب میں پہلے بے قرار تھا، دوبارہ کھانے سے کراہیت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ تو محبت اور کراہیت میں کیا نسبت، دُوسری رغبت، سو ہر جنس کو اپنی جنس سے رغبت ہے۔ گو یہ محبت کے قریب ہے مگر اس میں بھی کچھ نہ کچھ غرض پائی جاتی ہے جو محبت کی ضد ہے۔ خالص محبت میں غرض کا پایا جانا عیب ہے۔ محبت محض محبوب کے لیے ہی خاص ہوا کرتی ہے غرض وجود کی کسی حاجت روائی کا نام ہے اور محبت میں وجود بلکہ جان بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس لیے اگر مِنْ دُوْنِ اللّٰہ سے محبت ضرورت اور رغبت کی راہ سے ہو تو اس کو محبت کہنا روا نہ ہوگا۔ اور اگر ایسی محبت ہو جیسی مولیٰ کریم سے ہونی چاہیے، جو حقیقت ایمان

ہے تو وہ شرک ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ
كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲: ۱۶۵۔ پ ۲۔ ع ۴)

اور بعض آدمیوں میں سے شریک پکڑتے ہیں سوائے
اللہ کے کہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت
اللہ جل شانہٗ سے کرنی چاہیے، اور جو لوگ صاحب
ایمان ہیں وہ اشد یعنی سخت محبت اللہ ہی سے کرتے ہیں۔

مومن خاص کو بھی قوت لایموت سے چارہ نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہر بشر (مومن، ولی، پیغمبر، سب) کو لازم ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس سامان کے ہونے سے ان کو محبت اور نہ ہونے سے طلب نہیں ہوتی ہے۔ ان کا جینا، مرنا، تمام افعال و حرکات مولیٰ کریم ہی کے لیے ہوتے ہیں اور ہر حال میں وہ اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہوتے ہیں۔ محبت کے میدان میں رضا کی بساط پر ورد کے سایہ میں پرورش پا رہے ہیں اور طلب کے راستہ پر اسی کی توفیق سے چل رہے ہیں اور فرمان ایزدی :

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ
عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ
الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (پ ۴۔ ع ۹)

جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ
کر دے گا، مومنوں کو اس حال پر جس پر تم ہو ہرگز
نہیں رہنے دے گا۔

کے تصرف سے تغیر و تبدل کی کروٹیں بدل رہے ہیں۔ گو بشریت الٰہی بلا ہے کہ علائق متعلقہ فکرمند کر ہی دیتے ہیں لیکن ایسے شخصوں کو نسیان مِنْ دُوْنِ اللّٰہ لازم ہوتا ہے اور اپنے حال میں فرصت ہی نہیں پاتے، جس کو حفاظت من اللہ کہنا روا ہے۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کی آنکھ میں کانٹا لگ گیا۔ کئی دن کے بعد کسی نے عرض کی کہ حضور! کانٹا تو نکال لیا ہوتا؟ فرمایا فرصت ہی نہیں ملی۔ اور بظاہر کوئی کام تھا ہی نہیں جس میں مشغول ہوتے۔ اسی لیے مردانِ خدا کا قول ہے کہ جس نے ہمارے ظاہر کو دیکھا وہ گمراہ ہو گیا، اور جس نے ہمارے باطن کو پایا برسرِ راہ ہوا ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
ہچوں باشد در نوشتن شیر و شیر

حضرت آدمؑ کی جنّت میں سکونت

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ
عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ
وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ؕ

اور ہم نے کہا اے آدم! تو اور تیری بی بی
دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے بافراغت
جہاں سے چاہو کھاؤ۔ لیکن اس ایک
درخت کے نزدیک مت جانا، ورنہ ظالموں
میں سے ہو جاؤ گے۔ پس شیطان نے ان کو اس سے
پھسلا دیا اور جس مقام میں وہ تھے وہاں سے
نکال دیا۔ ہم نے کہا اتر جاؤ! تم ایک دوسرے
کے دشمن ہو۔

مفسرین کے اس میں مختلف اقوال ہیں۔ ہر ایک نے اپنے معلومات اور استعداد

کے مطابق ارشادات فرمائے ہیں جو تحقیق کے میدان میں کسی حد تک صحیح ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ جنت اپنے اصلی مقام یعنی ساتوں آسمانوں کے اُوپر ہے جہاں حضرت آدم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوّا رضی اللہ تعالیٰ عنہا داخل کیے گئے اور ابلیس لعین کے دھوکا دینے اور شجرِ ممنُوعہ سے کھا لینے کی وجہ سے جنت سے اُتارے گئے اور سرانڈیپ وغیرہ میں گر پڑے اور نادم ہوئے، وغیرہ وغیرہ

دُوسرے گروہ کے نزدیک یہ عقل کے برعکس اور قرآن شریف کے خلاف ہے اور وہ اس دلیل پر ہیں کہ حضرت آدم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے پیدا کرنے سے پہلے ارشاد باری تعالیٰ بالکل عیاں ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً یعنی میں زمین میں اپنا ایک نائب (خلیفہ) بنانے والا ہوں۔ جس کا ظہور اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ کے موافق میدانِ دنیا ہی میں ثابت ہو رہا ہے۔ رہا جنّت، سو وہ ایک خوشگوار قلاں مقام (عدن) میں ایک باغ تھا۔ اور "جنت" عربی زبان میں باغ کو کہا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید میں وارد ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا	اور بیان کر ان کے لیے مثال دو مردوں کی کہ کیے
لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ (پ۱۵ - ع۱۷)	ہم نے واسطے ایک کے ان میں سے دو باغ۔

اور اِهْبِطُوْا سے مراد باغ سے نکال دینا ہے۔ نہ یہ کہ جنت آسمانوں پہ تھا، اور نہ ہی قبل از موت حضرت آدم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو جنت میں داخل کرنے کیلیے آسمانوں پر اُٹھالیے گئے۔

یہ سب کم فہمیدگی کی وجہ سے تاویلات ہیں جو قرینِ قیاس نہیں ہیں۔ کیوں کہ جنت اور اس میں داخلہ آسمانوں پہ مان لیا جائے تو کئی اشکال پیدا ہوتے ہیں جن کا

حل ناممکن ہے۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا فائدہ نہیں رہتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ "یہ مشیّت ایزدِ متعال ذُوالجلال والاکرام کے اسرار میں سے ہے جو عام فہم نہیں ہے۔ جنت میں داخل کرنا اور بوجہ لغزش زمین پر گرا دینے میں حکمت کاملہ ہے"۔ اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو حضرت آدم علیہ السّلام کی دُعائے مغفرت (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الآیہ) لایعنی ثابت ہوتی ہے اور سراسر الزام باری تعالیٰ پر عائد ہوتا ہے جو قطعًا حرام ہے، اور اس کا امکان محال۔ اس لیے ماننا ہی پڑے گا کہ یہ جنت نہایت آرام کی جگہ اور تمام نعمات کا سرمایہ دنیا میں کا ایک باغ تھا جس میں بلا طلب و محنت داخل کیے گئے اور لغزش کی وجہ سے نکال دیے گئے۔

اُصُول کے رُو سے مفسّرین میں اس قدر ہی اختلاف ہے۔ فروعی صورت میں کئی ایک وجہ پر جو اختلافات ہیں ان کا یہاں درج کرنا لاحاصل ہے۔ اب مَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ صحتِ حال کے رُو سے حسبِ استعداد کچھ تحریر کیا جاتا ہے جو مَا شَآءَ اللّٰہ تحقیق کے میدان میں غور و تعمق کے اَوزان سے موازنہ کرنے سے بعید از تصدیق نہ ہوگا کہ پہلے گروہ کی تحقیق معانی کی بساط پر کسی حد تک بجا و درست ہے اور سراسر حقیقت کے میدان کا شجر کہا جا سکتا ہے مگر عام فہم نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ لقمہ عوام کے معدہ کے لائق نہیں ہے۔ ہر چند عالمِ موجودات میں یہ مشکل واقع ہوتی ہے لیکن اس سے گزر کر عالمِ محسُوسات، معلومات اور معروفات میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ دوسرا گروہ جو سراسر خطا پہ ہے اس کی غلطی کا سبب بھی یہی ہے۔ عالمِ شہود یعنی موجودات ہی کے بساط پر رہ جانے کی وجہ سے ایسا

تحریر کیا ہے۔ جو اصل معانی کے خلاف واقع ہوا ہے۔ کیونکہ اگر جنت کو ایک باغ دنیا ہی تصور کیا جائے تو پھر مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا	پھر جب ان دونوں نے اس درخت سے چکھ لیا
سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا	تو ان کے ستر اُن پر ظاہر ہو گئے اور دونوں نے
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (۷: ۲۲، پ ۸)	بہشت کے پتوں سے ان کو ڈھانکنا شروع کر دیا

کپڑوں کا اُترنا اور بہشت کے پتوں سے ستر کا ڈھانکنا کس وجہ پر درست ہو سکتا ہے؟ اور معاً یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اگر جنت دنیا ہی کا باغ تھا تو آج کافروں اور مشرکوں، دہریوں اور نافرمانوں کے نہایت عمدہ اور خوشگوار باغ موجود ہیں، تو پھر نعمات عظمیٰ اور باغ دنیا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ تو کہنا ہی پڑے گا کہ یہ سراسر نادانی اور ایسی تاویل ہے جس کے سوائے کچھ چارہ نہ ہو سکا۔ ورنہ اس تفسیر کی معنوی بساط پر کچھ وقعت نہیں ہے۔

عزیزا! جان، کہ یہ برزخ انسانیہ ہے جس کے بغیر کوئی حقیقت و انکشاف درست نہیں ہو سکتا، اور اس کی حد و حصر کا اندازہ بے انتہا ہے۔

منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ اپنے لخت جگر حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گود میں لیے بہت پیار کر رہے تھے اور جذبات پدری از حد موجزن تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "ابا جان! آپ کو مجھ سے محبت ہے"؟ فرمایا "ہاں" فرمایا "تو بھائی حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے"؟ ارشاد ہوا "ان سے بھی"۔ فرمایا "تو میری والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے"؟ ارشاد ہوا "اُن سے بھی"۔ پھر فرمایا کہ "نانا جان سے"؟ فرمایا "اُن سے بھی"۔ پھر سوال کیا "ابا جان! اللہ تعالیٰ سے"؟ ارشاد ہوا "سب سے بڑھ کر"۔ بولے کہ "ابا جان! آپ کا دل ہے یا سرائے"؟ سبحان اللہ! خورد سالی میں یہ سمجھ۔ قصہ مختصر حضرت علی المرتضیٰ شاہ ولایت کو جوش محبت الٰہی اس قدر غالب ہوا کہ فرزند ارجمند کو صدر مبارک سے لگا لیا اور نسبت حق سے برزخ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سیراب کر دیا۔ اور فرمایا:

يَا وَلَدِيْ فِكْرُكَ فِيْكَ يَكْفِيْكَ دَاءُكَ وَدَوَاءُكَ فِيْكَ لَيْسَ شَيْءٌ خَارِجًا مِّنْكَ اَنْتَ اُمُّ الْكِتَابِ[1] بیٹا! تو اپنے جسم کو چھوٹا سا خیال نہ کر۔ دونوں جہان تیرے ضمیر کی وسعت میں ایسے ہیں جیسے طشت میں دانہ

یہ ہے حقیقتِ انسان، جس کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہوا۔ لیکن عوام کے معدے اس لقمے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ کے سمجھانے کے لیے اس مشکل کو حل کرنے اور اس حقیقت کے انکشاف کے لیے اس علیم حکیم نے انسان کے برزخ کی رؤیت کا انحصار خواب پر رکھا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا	اللہ تعالیٰ جانوں کو موت کے وقت قبض کر
وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ	لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کو نیند میں، پھر
الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ	جن کی موت مقرر ہو چکی ہے ان کو روک لیتا
الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ	ہے اور اوروں کو ایک وقت مقرر تک
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	کے لیے بھیج دیتا ہے۔ اس میں تفکر کرنے وال
(۳۹: ۴۲، پ ۲۴، ع ۲)	کے لیے نشانیاں ہیں۔

معلوم کیا چاہیے کہ برزخ دو وجہ پر ہے۔ ایک قبل از پیدائش اور دوسرا بعد از انتقال

[1] اس سے آگے کے الفاظ یہ ہیں: يَا وَلَدِيْ اَنْتَ جِسْمٌ صَغِيْرٌ وَّفِيْكَ عَالَمٌ كَبِيْرٌ ۱۲

اور یہ سب کے لیے یکساں ہے خواہ انسان کس درجہ میں ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ عوام النّاس کو اس کا علم سوائے خبر کے نہیں لیکن انبیا و مرسلین علیہم السلام کے لیے یہ برزخ ہماری مانند نہیں ہے۔ یا دُوسرے معنوں میں ان کے لیے ہر دو برزخ نہیں ہُوا کرتے۔ بمصداق فرمان محققین کہ "عام مومن جو کچھ دیکھتا ہے خواب میں دیکھتا ہے، اور ولی نوم یعنی اُونگھ میں دیکھتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے اولیاء اللہ بالکل خفیف نوم میں جو قریب بہ بیداری ہُوا کرتی ہے۔ لیکن پیغمبر اور مرسل کے لیے یہ نوم نہیں ہُوا کرتی بلکہ بالکل بظاہر ہُوا کرتا ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے عصا اور یدِ بیضا ظاہر میں پایا اور عوام کے رُوبرو پیش کر دیا۔

مقصُود اس عبارت سے یہ ہے کہ ہر کیفیت برزخ مملکت انسانیہ کا آئینہ ہے خواہ محجُوب ہو یا مکشُوف۔ فرق صرف یہ ہے کہ مومن اِس وجود عنصری سے جو سب حجابات کا آلہ ہے، نیند میں خلاصی پانے والا ہوتا ہے، اور ولی تھوڑی سی نوم میں اس بلا سے نجات حاصل کرنے والا، اور مرسل اس بلا سے بحکم خدا منزہ ہُوا کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کافر حَیٰوۃِ الدُّنیا میں مَعِیْشَةً ضَنْكًا کے مطابق نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (پ۱۶ - ۱۴) کا مُرتکب ہو جاتا ہے اور مومن یَشْرَحْ صَدْرَهٗ کے مطابق حیات اَبدی اور طاقت و تصرّف کا مختار کر دیا جاتا ہے:

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا — بھلا ایک شخص کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو

لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ — زندہ کر دیا اور اس کو نور دیا کہ اس کے ساتھ لوگوں

مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ — میں چلتا پھرتا ہے اُس شخص کے برابر ہے جو اندھیروں

مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا — میں پڑا ہے اور وہاں سے نکل نہیں سکتا، اسی طرح

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶ : ۱۲۳، پ ۸) — بھلا دکھایا ہے کافروں کو جو وہ کر رہے ہیں۔

اور مرسلین کا حال جس سے کما حقہٗ واقف ہونا ہمارے حصّہ میں نہیں ہے، عجیب و غریب ہُوا کرتا ہے۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ولی بعید میں رویت کو پاتا ہے، جیسے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرّہٗ کا ارشاد ہے کہ جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عروج ہوا ہے فقیر کو بحکم خدا رویت نصیب ہوئی ہے۔ مدینۃ الاولیاء کا نشان اپنے حال سے حضرت شیخ ابن عربی قدس سرّہٗ نے بھی فرمایا ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالکل بظاہر نماز خسوف میں کھڑے محراب کی طرف یدِ مبارک کو بڑھایا مگر مصلحت اور سِر کو مستور رکھنے کی بنا پر ہٹا لیا اور صحابہ کے استفسار پر فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور اس میں سے ایک انگور کا خوشہ توڑنا چاہا۔ اور اگر میں توڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اس میں سے کھاتے رہتے۔

یہ ایک لمبی حدیث شریف مسلم و بخاری شریف دونوں میں مذکور ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اسے صلوٰۃ الخسُوف کے باب میں نقل کیا ہے۔ مفصّل وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ اس حصہ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْنَاكَ — صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! ہم نے آپ کو

تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِيْ مَقَامِكَ هٰذَا — دیکھا کہ آپ یہاں کھڑے کوئی چیز لینے کا قصد

ثُمَّ رَاَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّيْ — فرما رہے تھے پھر ہم نے آپ کو پیچھے ہٹتے دیکھا

رَاَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا — آپ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور اس میں سے

وَلَوْاَخَذْتُهُ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا ...... ۔

ایک خوشہ انگور کا لینا چاہا اور اگر میں لے لیتا تو تم دنیا کے باقی رہنے تک کھاتے رہتے۔

تو اب کہنا ہی پڑے گا کہ یہ جنت میدان دنیا ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عیاں تھی جس کو برزخ سے تعبیر کرنا ہمارے حال کے موافق بجا اور درست ہوگا۔ ورنہ اوپر گزر چکا ہے کہ مرسلین کے لیے برزخ مطلق روا نہیں ہے، یا ان کا برزخ اور ہے اور ہمارا اور۔ ان پاک ہستیوں کا برزخ اسرار الٰہیہ میں سے ہے جس کے علم سے ہم کو حصہ نہیں ہے اور مطابق فرمان الٰہی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ یہ جنت حیات دنیا ہی میں میدان دنیا سے بالاتر اور مملکت انسانیہ کی بساط پر موافق ارشاد لم یزل مُلْکًا کَبِیْرًا ہے جو بلا محنت و مشقت بلکہ بلا طلب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عنایت فرمایا گیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ۝ (۷۶: ۲۰۔ پ ۲۹۔ ع ۱۹)

اور جب دیکھے گا تو اس جگہ دیکھے گا تو بہت نعمت اور مملکت بہت بڑی۔

لیکن ساتھ ہی آزمائش کا شجر کھڑا کر دیا اور فرمایا:

لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲: ۳۵۔ پ ۱۔ ع ۴)

اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

آخر کار ابلیس لعین نے سمجھا کہ آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے لیے یہ نعمت عظمیٰ ودیعت فرمائی گئی ہے۔ ہر چند کوشش کی اور اپنے قاعدے کے مطابق جس چیز کی طمع حضرت آدم علیہ السلام کے ضمیر میں پائی رغبت دلائی اور جھوٹی قسم کھا کر دھوکا دیا۔ لغزش کھانے کی وجہ سے جنت سے اتار دیے گئے، کما قال اللہ تعالیٰ:

وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ (۷: ۲۰۔ ۲۱۔ پ ۸۔ ع ۹)

اور شیطان نے کہا تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ، یا یہاں پر ہمیشہ رہنے والے نہ ہو جاؤ۔ اور ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

اب غور و فکر سے معلوم کرنا چاہیے کہ اس پروردگار نے حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے اور لباس کے اتارے جانے کا قصہ تنبیہاً ارشاد فرمایا ہے کہ دیکھنا کہیں تم کو اسی طرح جس طرح تمہارے باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوا دیا تھا، تم کو بھی دھوکا نہ دے۔ فرمایا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اے آدم کے بیٹو! نہ بہکائے تمہیں شیطان جیسے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو جنت سے اتار لیا تھا ان سے لباس ان کا تو کہ دکھلائے ان کو شرمگاہیں ان کی۔ بیشک وہ دیکھتا ہے تم کو وہ اور اس کا کنبہ اس طرح سے کہ نہیں دیکھتے تم ان کو۔ تحقیق کیا ہم نے شیطان کو دوست واسطے اُن

(۷ : ۲۷ - پ ۸ - ع ۱)	لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے۔

اب معلوم ہونا چاہیے کہ بنی آدم کونسی جنت میں داخل ہیں جس سے نکلنے کا احتمال اور شیطان رجیم کے فریب دینے کا خطرہ ہو، جس کے لیے تنبیہ خاص مِنَ اللہ نازل ہوئی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ تنبیہ کسی اور نعمت کے لیے ہو جس کی مثال حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جنت یعنی نعمت عظمیٰ سے فرمائی ہو۔ لیکن اس سے پہلی آیت:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا	اے آدم کے بیٹو! بیشک اتارا ہے ہم نے تمہارے
يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ	لیے لباس کہ ڈھانکتا ہے شرمگاہیں تمہاری اور
التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ	باعث زینت ہے۔ اور ایک لباس التقویٰ ہے،
اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ (پ ۸ ع ۱)	یہ بہتر ہے اور یہ اللہ کی آیات (نشانات) میں سے
(۷ : ۲۶)	ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

میں دونوں لباس کی تصریح ہے اور اس میں تمام بنی آدم شامل ہیں۔ لباس يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ تو سب پر روشن ہے، مگر لِبَاسُ التَّقْوٰى عالم مثال کا شجر ہے جس کا علم خواص کے سوا عوام الناس کو نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ وہ اپنے برزخ فی الوجود یعنی خواب میں کبھی اپنے آپ کو برہنہ اور کبھی لباس سے مزین دیکھتا ہے۔ علم اور جہل کو نظر انداز کرتے ہوئے صحت حال کے رُو سے حضرت آدم علیہ السلام اور بنی آدم ہر دو لباس (ظاہری و باطنی) کے حصول میں یکساں ہیں اور یہ مسلمہ امر ہے کہ لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ جنتی لباس ہے جو جنت سے خارج ہونے کی صورت میں اتر گیا۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لباس جنت کے سوا نہیں ہے، اور جنت اس لباس کے سوا نہیں ہے،

ہر دو لازم ملزوم ہیں۔ یہ لباس (رِیْشًا) کسی لغزش یا گناہ سے اترنے والا نہیں۔ تو جب آدم علیہ السلام اور بنی آدم اس لباس میں مشترک ہیں اور کسی گناہ عظیم سے بھی یہ لباس نہیں اترتا۔ اور لباس التقویٰ سے ایک چیتھڑا بھی باقی نہیں رہتا، تو نور ایمانی کے ترازو میں غور و فکر سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ جس طرح یہ لباس عوام کے لیے مخفی ہے اسی طرح جنت بھی پوشیدہ ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ جنت یا دوزخ موت کے بعد ہی ہوگی۔ جنت ایمان اور اعمال صالحہ کا اور دوزخ کفر اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ یہ میدان دنیا میں کا ایک شجر ہے جس کی جگہ انسانی ضمیر کے سوا نہیں ہے۔ اصل اور فرع کا سا حال ہے۔ نور ایمانی کے تحت میں اعمال اصل کی مانند ہیں، اور فرع ان کی تفصیل اور نمود فی الآخرۃ ہے۔ کَمَا قَالَ اللہ:

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي	جو کوئی یہاں (اس دنیا میں) اندھا ہے، وہی
الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝	آخرت میں بھی اندھا ہے۔ اور راستے سے
(۱۷ : ۷۲ - پ ۱۵ - ع ۸)	بہت ہی بھٹکا ہوا ہے۔

اور اس کی تفسیر یوں ارشاد فرمائی ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى	اور وہ (اندھا پن) یہ آنکھیں اندھی نہیں ہیں،
الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (پ ۱۷ ع ۱۳)	بلکہ دل اندھے ہیں جو کہ سینوں کے اندر ہیں۔

دوسری جگہ سورۃ یٰسٓ میں فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا	اور ہم نے اُن کے آگے ایک دیوار کر دی اور اُن کے

وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ
پیچھے بھی ایک دیوار کر دی اور (اوپر سے) ان کو

فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ٥ (۳۶ : ۹ - پ ۲۲ - ۱۸)
(اس طریقہ سے) ڈھانک دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے

اور تیسری جگہ مومن اور کافر کے ضمیر اور وسعت کے مطابق فرمایا :

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا
کیا جو شخص کہ مُردہ تھا پس ہم نے اس کو زندہ کیا

لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ
اور اسے نور عنایت کیا کہ اس کے ساتھ لوگوں میں

مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا
چلتا پھرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو ایسے اندھیروں

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا
میں ہے جن سے وہ نکل نہیں سکتا، اسی طرح سے

يَعْمَلُوْنَ ٥ (۶ : ۱۲۳ - پ ۸ - ۲)
زینت دیا گیا ہے واسطے کافروں کے جو وہ کرتے تھے۔

یہ ہر دو حالتِ انسان فی الدنیا اور فی الآخرہ اظہر من الشمس ہیں جو اس کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے انسان کو عین دین پر پیدا کیا ہے۔ فرمان مولیٰ کریم ہے :

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا
فطرت خدا کی کہ بنایا اوپر اس کے آدمیوں کو

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
نہیں بدلنا واسطے پیدائش خدا کی کے۔ یہ ہے

الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
دین درست اور لیکن اکثر لوگ نہیں

يَعْلَمُوْنَ ٥ (۳۰ : ۳۰ - پ ۲۱ - ۶)
جانتے ہیں۔

محض حجاب جو دوزخ کا اصل اور موجب عذاب ہے، انسان کی ضلالت کی وجہ سے ہے ورنہ دین القیم جو خلقت انسانیہ سے وابستہ ہے سب نعمات اس کے غلام ہیں۔ لَا تَبْدِيْلَ

لِخَلْقِ اللّٰهِ اس امر پر شاہد ہے کہ کوئی عارف ہو یا محجوب، مقبول ہو یا مردود، اس کی فطرت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ محض بُعد و قُرب، اعمیٰ و بصیر سے عبارت ہے۔ مطابق :

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَ
اور نہیں ہیں برابر اندھا اور دیکھنے والا۔ اور نہ

لَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ
ہی اندھیرا اور روشنی، اور نہ ہی سایہ اور

وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ
دھوپ، اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو

وَلَا الْاَمْوَاتُ ٥ پ ۲۲ (۳۵ : ۱۹ - ۲۲)
سکتے ہیں۔

اور یہ سب ہمارے ہی عارضہ کی وجہ سے ہے جو حال کے مترادف ہے، ورنہ اس رحیم الودود کی طرف سے وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (پ ۲ - ۲) اس امر پر دال ہے کہ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے ہم پر تمام نعمتیں پوری کردی ہیں۔ اور یہ تمام نعمتیں مطابق لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اصل کے موافق ہیں اور فرع ہمارے کسب کے لحاظ سے ہے۔ لیکن اصل میں تغیر روا نہیں ہے۔ محض میدان آزمائش میں آکر ہوا و ہوس کا شکار ہو گئے۔ صرف اس سے زکیٰ حاصل کرنا ہی اتم کامیابی ہے اور اس میں رہ جانا خاک میں ذلیل و خوار یعنی اسفل سافلین کا مقیم ہونا ہے، جو تمام مصیبتوں کا گھر اور نامرادی کی جڑ ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَقَدْ خَابَ
بیشک مراد کو پہنچا جس نے پاک کیا اس کو، اور

مَنْ دَسّٰهَا ٥ (۹۱ : ۹ - ۱۰ - پ ۳۰ - ۱۶)
یقیناً نامراد ہوا جس نے گاڑ دیا اس کو۔

اب نور ایمانی سے معلوم کرنا چاہیے کہ مطابق ارشاد ذوالجلال والاکرام زکیٰ حاصل کرنا فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا کے مترادف ہے، اور یہی مقصود اور حصول ہے۔ اور خاک میں

ملنا یعنی اس مقام سے ملبوس ہونا سراسر محرومی اور نامرادی ہے۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ فطرت اللہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مالک حقیقی نے اس کے تغیّر و تبدّل کو روا نہیں رکھا ہے، یہ اس سے مبرّا و منزّہ ہے۔ بلکہ منازل و مدارج، عروج و نزول، بُعد و قُرب، کفر و اسلام، شرک و ایمان سب اس کے نشیب و فراز کا نتیجہ ہے۔ انسان کے لیے یہی صراط المستقیم ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ اسی کی آمدورفت سے عبارت ہے۔ فطرت کی رُو سے انسان احسن تقویم اور آخری منازل یعنی عالم شہود مطابق مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ کی وجہ سے اسفل سافلین، ہوائے نفس کا گرفتار۔ ہاں جس نے فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ میں سعی کی اور توفیق الٰہی اس کے شامل حال ہوئی، اس مقام سے بفضلہٖ تعالیٰ خلاصی پانے والا ہوا۔ زکی کے معمول کو پائے ہوئے، طلب غیر کو دل سے ہٹائے ہوئے، قلبِ سلیم کو پہلو میں سجائے ہوئے لقاو مشاہدۂ الٰہی لامتناہی کی رویت سے منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے جنت راستہ کا ایک مقام ہوتا ہے۔ مومن اپنے ضمیر میں مطابق عَرَّفَهَا لَهُمْ اس کے عرف سے عارف ہو جاتا ہے۔ لیکن مرسلین کو بالکل بظاہر رویت حاصل ہوتی ہے، عوام کی دانش اس سے عاجز ہے۔ ولی کو بہتر یعنی بھید میں یہ معنی حاصل ہوتے ہیں، لیکن پیغمبران عوارضات سے مبرّا و منزہ ہوتا ہے۔

مدعا اس عبارت سے یہ ہے کہ برزخ کسی آڑ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی ان مقامات یا حالات کو جو پوشیدہ ہیں، عالم موجودات، محسوسات، معلومات، معروفات۔ عالم موجودات کی رویت تو بالکل ہر کہ و مہ پر روشن ہے۔ عالم محسوسات ہر قسم کے احساس کم و بیش سے

متأثر ہوتا ہے اور احساس کی راہ سے ظاہری و باطنی علم کا حصول عالم معلومات سے ہے۔ لیکن عالم معروفات سوائے رویت کے درست نہیں ہو سکتا۔ اس عزیز الحکیم نے یہ سب انسان کے ضمیر میں ودیعت فرمائے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ان سب کا حامل بنایا ہے۔ سرشتی توفیق سے اس کی خلقت کو مکمل بنا کر اپنی فطرت پر آفرینش کیا ہے۔ جو میدان آزمائش میں کسی قدر اختیار دے کر اس طرح ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا	بیشک جو لوگ کہ گمراہی کرتے ہیں ہماری نشانیوں
یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ	میں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کیا پس جو کوئی
خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ	کہ آگ میں ڈالا جائے وہ اچھا ہے یا وہ کہ قیامت
اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کے دن امن سے آئے، پس تم جو چاہو کرو یقیناً
بَصِیْرٌ ۝ (۴۱ : ۴۰ ، پ۲۴ - ۱۹)	وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

عمل کے میدان میں انسان چار حالت سے خالی نہیں ہے: کافر، فاسق، مومن اور ولی۔ کافر اپنی فطرت کو محجوب کر لینے والا، فاسق باوجود یقین رکھنے کے عمل میں قاصر ہونے کی وجہ سے محروم، مومن خدا کے فضل سے اُمیدوار اور کوشاں، اور ولی باری تعالیٰ کی توفیق سے زکیٰ حاصل کرنے اور اپنی فطرت تک پہنچنے والا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ فطرت کی کسی حالت میں نفی نہیں ہے جس کی تفصیل میں بہت طول ہے۔ مراد صرف یہ ہے کہ فطرت اور مملکت انسانیہ دو چیز نہیں۔ یہ وُسعت فطرتِ انسانیہ کی ہے۔ جب اسفل سے نجات حاصل کرتا ہے تو اس کے لیے عوالم بالاتر سے معاً رویت ہو جاتی ہے۔ اس جگہ الگ مثال کی ضرورت

نہیں، صرف حالات حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کافی ہیں کہ لغزش کی وجہ سے ان مدارج عروج سے ہبُوط ہوا تو فوراً لباس بھی اُترا اور حال کے رُو سے گر گئے۔ تمام کیفیات اور اپنے مقام اور اس کی رویت سے برطرف ہو گئے۔ چونکہ اس معاملہ میں آدم علیہ السلام اور بنی آدم یکساں ہیں، آج حجاب کے دُور ہوتے ہی ان مدارج پر عروج ہونا سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری و ساری رہے گی

اوپر گزر چکا ہے کہ میدان دنیا یا انسانی ضمیر میں یہ مدارج و معارج مثل اصل کے ہیں، جو تحت ایمان ہے، اور عمل کے میدان میں مانند فرع، اور کما حقہٗ نمُود بعد از انتقال فی الآخرۃ ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس عزیز الحکیم نے فطرتِ انسان کو اپنی فطرت پر اور عین حکمت پر مبنی رکھا ہے جس کے منازل و مدارج میں عجیب کیفیات کی وُسعت ہے۔ یعنی عالم موجودات میں اسباب ظاہری خورش و پوشش اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقام میں جسے ذات پاک نے اسفل سافلین فرمایا ہے، گویا احسن تقویم بنا کر اس مقام کا مطابق مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ مقیم بنایا ہے، یہ عاجز انسان محل و مقام کے رُو سے اسی کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس میدان میں آزمائش اور علم و دانش کے حصُول اور ظہور تام کے لیے بھیجا گیا ہے، لیکن یہ قید انسان عین حجاب اور سراسر غفلت اور گمراہی کا سرمایہ ہے۔ سرتاپا اس بلا میں مبتلا، اپنی کشتی کا ناخدا اور اپنی خواہشات کا شیدا ہوتا ہے۔ تاہم فطرت انسانیہ اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اپنے اصلی مقام پر پہنچے۔ خواہ اثرات اجسادی جو عوارضات ارضیہ کے

مترادف ہیں، مانع بھی ہوں اور ہمیشہ کے لیے محجوب موجب عذاب اور دوزخ کا ایندھن ہی کیوں نہ ہوں، مولیٰ کریم کی رضا کے خلاف ہے۔ اور وہ اس لیے کہ مشیت ایزد متعال اس کے برعکس ہے اور فطرت انسانیہ کا ارادہ ازلی کے خلاف ہونا محال ہے۔ محض سرشتی توفیق کے اختیارات جو سراسر آزمائش کے میدان کا شجر ہے، یہ اس کا ثمر ہے۔ جو نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کی زبردست سنت کا نتیجہ ہے کَمَا قَالَ اللہُ تَعَالٰی:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ
اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ
فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى
الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ
يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ
مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (۷: ۱۷۵-۱۷۶۔ پ ۹۔ ع ۱۲)

اور پڑھ اوپر ان کے قصہ اس شخص کا کہ دیں ہم نے
اس کو نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس
پیچھے لگایا اس کو شیطان نے پس ہو گیا گمراہوں
اور اگر چاہتے ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان کے
یعنی نشانیوں کے ولیکن وہ لگ گیا طرف زمین کی
اور پیروی کی خواہش اپنی کی پس مثال اس کی مانند
مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے تو اوپر اس کے زبان
لٹکائے یا چھوڑ دے اس کو زبان لٹکائے۔ یہ ہے
مثال اس قوم کی کہ جھٹلایا نشانیوں ہماری کو پس
بیان کر قصے تا کہ وہ فکر کریں۔

مقصُود اس عبارت سے یہ ہے کہ وہ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ کا مرتکب ہوا یعنی مقامات اسفل پر ہمیشگی چاہی اور اسی کو پسند کیا، اس لیے اس حجاب میں قَوْمًا عَمِيْنَ کی طرح غٰوِيْن

میں سے ہوگیا۔ اپنی اصلی فطرت کو ہمیشہ کے لیے دوزخ کا مقیم بنا دیا، یَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوْبُوْنَ کے ابدی حجاب میں گرفتار ہوگیا، کل نعمات سے محروم ہوگیا۔ گو فطرت میں کسی قسم کا تغیر واقع نہ ہوا لیکن حجاب در حجاب میں ابدی محجوب ہوگیا۔ هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطٰنِيَهْ کے مطابق مُلْكًا كَبِيْرًا سے بے نصیب ہوگیا۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ کے رُو سے کتوں کے زنجیر میں جکڑا گیا۔ یہ ہے مقامات انسانیہ کا آخری مقام یعنی اسفل سافلین کی حقیقت اور حصول۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انسان کا پہلا مقام سِرّی ہے یعنی هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (انسان پر زمانے میں سے ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ یہ کوئی ذکر کی گئی چیز نہ تھا۔ الدہر) جس کا ذکر کرنا منع اور مخفی ہے۔ دوسرا مقام عالم ارواح جس کا ذکر عوام اور خواص کے لیے اظہر من الشمس ہے۔ تیسرا مقام عالم شہود یعنی میدان دنیا جو جسدی وجود کے موافق اور مترادف ہے، ذکر ہو چکا ہے۔ اب دوسرے مقام کی نسبت بیان کرنا لازمی ہے جو عالم معروفات سے ہے۔ عالم ارواح سے عالم اجساد یعنی موجودات تک نزول انسان ہے۔ لیکن واپسی پر مطابق کلام الٰہی ایک اور میعاد بھی مقرر ہو چکی ہے جس کو عالم برزخ سے تعبیر کرنا درست ہے، كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ	وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے۔ پھر
قَضٰۤى اَجَلًا ۗ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ	مقرر کی اجل اور ایک اور اجل مقرر کی ہوئی ہے
ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (۶: ۲۔ پ۷)	نزدیک اس کے۔ پھر تم شک کرتے ہو۔

اس کا زیادہ تر تعلق عالم دنیا سے ہوا کرتا ہے، گویا یہ بھی میدان دنیا ہی سے ہے۔ ہاں حدیث

شریف سے ثابت ہے کہ قبر میں یا تو ایک کھڑکی جنت سے یا دوزخ کی طرف سے کھل جاتی ہے۔ یا تو باغ رضوان ہو جاتی ہے یا دوزخ یعنی نار کا حفرہ۔ ہر ایک انسان کے لیے اس کا حال منکشف ہو جاتا ہے۔ عالم دنیا جس سے مراد ضمیر فی الوجود ہے، اصل میں ویسا ہی تھا جیسا انکشاف ہوا، نص قطعی سے ثابت ہے چنانچہ اوپر گزر چکا ہے کہ جو دنیا میں مُردہ ہے آخرت میں بھی مُردہ ہے، جو دنیا میں اندھا ہے آخرت کو بھی اندھا ہوگا، اور یہ اندھاپن اور مردہ ہونا فی الضمیر ہے، نہ بظاہر یعنی اس کا مُردہ ہونا اور اندھا رہنا روحانیت کی بساط سے ہے نہ بظاہر بشریت سے، بلکہ جامۂ بشریت میں پوشیدہ ہے۔ تو ثابت ہوا کہ کافر نافرمان کے لیے فطرت موجب عذاب اور مومن کے لیے راحت اور تمام نعمتوں کی حامل اور صراط المستقیم ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہر مقام و محل کے رو سے اسباب بھی اسی کے موافق ہوا کرتے ہیں۔ بشری یا اجسادی وجود کے لیے دنیا و مافیہا کے اسباب خورش و پوشش اور مکان وغیرہ اور عالم روحانیت میں یہ سب کچھ اسی کے مطابق نوری وجود سے جس کو جنت کہنا روا ہے۔ اسی لیے کافر کو سوائے حجاب کے برزخ یا فی الآخرۃ میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن مومن کے لیے وجود یا وجود کے موافق روحانی باغ اور مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ کے مطابق ہر قسم کی نعمت جس کو جنت کہنا روا ہے، حاصل ہوگی۔ دنیا میں مومن خاص یعنی ولی اللہ کو یہ حجاب نہیں رہتا تو وہ سر میں جنت کو پالیتا ہے، اور گاہے اس میں مقیم بھی ہوتا رہتا ہے۔ جس کو مدینۃ الاولیاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ انبیاء و مرسلین کے لیے من اللہ یہ حجاب نہیں

ہوتا اس لیے وہ بالکل بظاہر جنت کو پاتے ہیں۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داخل ہونے اور نکلنے کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے۔ بہتر سے کوئی نشان نہیں ہے۔ بالکل ظاہر پر کلمات مبارکہ ہیں جو حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ کافرین حجاب ابدی میں گرفتار ہیں۔ باوجود مملکت رکھنے کے ظلمات کے گڑھے کے مقید، خسر الدنیا والآخرۃ۔ اور مومن اپنی مملکت پر حاوی، اپنی سلطنت کا شہنشاہ، جنت و ما فیہا کو آغوش میں لیے ہوئے، اس کی نعمات کو عمل کے نور سے سجائے ہوئے اگاہے عالم خواب میں اپنے مقام کو دیکھتا ہے۔ اور ولی رستہ میں ان سب کیفیات سے عارف ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر کے لیے بالکل عیاں صورت ہوتی ہے کیوں کہ وہ اس وجودی بلا سے ازلی خلاصی پائے ہوئے ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی فطرت یعنی سرشت پر مکمل بنا کر بلا طلب جنت میں داخل کر دیا اور شجرۃ النفس سے جس کو مادۂ ارضیت یا بشریت کہنا روا ہے، منع فرما دیا۔ ہر چند لغزش کی وجہ سے اھبطوا کے مرتکب ہوئے لیکن سوائے حجاب کے فطرت اللہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی، توبہ کے بعد پھر جگہ ملی۔

آج عام بنی آدم کے لیے بھی فطرت انسانیہ میں کسی قسم کی کمی نہیں اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللہ کے مطابق کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اسی سنت کے موافق بنی آدم کے لیے اس اپنے مقام پر پہنچنے کی علت اس جامۂ بشریت سے خلاصی پانے اور حجاب من اللہ دور ہونے کے سوا اپنی مملکت یعنی جنت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اور یہ امر مسلمہ اور متفق علیہ ہے کہ مرنے سے پہلے جنت میں داخل ہونا روا نہیں۔ لیکن قرآن حکیم سے ثابت ہو چکا ہے کہ جنتی اور

دوزخی اسی عالم شہود ہی میں بن کر جائے گا جس کی تفصیل اُوپر گزر چکی ہے ؀

نسبت انسان

نسبت ایسے تعلق کو کہا جاتا ہے جس میں اتحاد تام ہو۔ اور اس کے کئی اقسام ہیں مثلاً ذاتی، صفاتی، کسبی۔

ذاتی نسبت تو انسان کو انسان کے ساتھ ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں ہیں۔

صفاتی نسبت، نوعیت و جنسیت کے لحاظ سے صفت بالذات کے مترادف ہے جس میں کمی بیشی عوارضات کی وجہ پر ہے۔ یعنی ایک کمزور ہے دوسرا توانا، ایک لنگڑا دوسرا درست، ایک اندھا ہے اور دوسرا بصیر، علیٰ ھٰذا القیاس۔ لیکن اس نسبت کا تعلق جو ذات کے ساتھ ہے اس میں مطلق فرق نہیں ہوا کرتا خواہ بظاہر جوارح کسی عارضہ کی وجہ سے بگڑ ہی گئے ہوں کیونکہ بظاہر جسمانیت کے تغیر و تبدل سے رُوح یا اصل انسان کی فطرت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہونا روا نہیں، مطابق فرمان مولیٰ کریم فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ (پ۲۱-ع۴) بناوٹ اللہ کی ہے کہ بنایا اوپر اس کے انسانوں کو۔ نہیں بدلنا واسطے پیدائش خدا کی کے)۔

رہا کسبی، سو یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک صنعتی اور دُوسرا عملی۔ صنعت و حرفت کا تعلق تو فی الدنیا ہے جس کا اثر ضمیر پر بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن عملی کا نتیجہ ہر چند فی الآخرۃ ہے جس پر مدارج و منازل عروج و نزول، عذاب و ثواب، گرفت و نجات اور قبض و بسط کا انحصار ہے۔ گو فطرت

میں کسی قسم کا فرق لاحق نہیں ہوتا لیکن راستہ کا حجاب جو سراسر موجب عذاب اور دوزخ کا اصل ہے اور مقصود و حصول جو سراسر حجاب کے دور ہونے سے عبارت ہے، افعال و اعمال کے اثرات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

عزیزا! جان، کہ انسان کی نسبت اس ذات پاک سے بتر کے میدان میں متحقق بالذات ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ نسبت انسان اس ذوالجلال والاکرام کے ساتھ واقعہ ہے، اور جوار و قرب باری تعالیٰ کے سوا یہ کسی مقام و محل کی مقید نہیں۔ عروج و نزول سے منزہ، مدارج منازل سے مبرا۔ اس کے بیان کے لیے زبان، نہ وہم نہ گمان، سب عوارضات سے ورا با خدا۔

جب اس خالق موجودات نے ارادۂ ظہور فرمایا تو عالم ارواح کی طرف کُن کا ارشاد فرمایا اور فیکون کی بساط پر تمام ارواح کا ظہور ہو گیا۔ تب عالم ارواح سے انسان کو مناسبت پیدا ہو گئی۔ گفت و شنید، سوال و جواب، ذکر و فکر، علم و عرف کا حامل بنا دیا گیا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی میثاق عوام و انبیاء اس پر شاہد ہیں۔ اب وقت آ گیا کہ انسان کو عالم شہود کی طرف مبذول فرمایا جائے تو ملائکہ کی طرف یوں خطاب فرمایا:

اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (پ ۲۳ - ۱۴)

میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں جب میں اسے درست کر کے اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر جانا

سب ملائکہ نے سر تسلیم جھکا دیا لیکن ابلیس اکڑ بیٹھا۔ فرمان ایزد متعال ہوا کہ:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (پ ۸) — تجھے کس چیز نے روکا ہے کہ میرے حکم پر سجدہ نہیں کیا

تو جواب دیا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (میں اس سے اچھا ہوں) اور ساتھ ہی یہ دلیل پیش کی کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ○ (مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے)۔ در اصل معلم الملکوت نے جو دھوکا کھایا وہ اظہر من الشمس ہے یعنی یہ کہ اس کی نظر جوہر کے سوا عرض پر رہ گئی، ورنہ یہ اختلاف نہ ہوتا۔

حاصل کلام، بحکم خداوند کریم عزّ و جلّ انسان کو بشر کے اسم سے نامزد کیا گیا اور اس کو اس بشریت سے مناسبت اور اس خاکی وجود سے مطابقت پیدا ہو گئی۔ یہ قاعدہ ہے کہ انسان جس مقام و محل میں جاگزیں ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے اس لیے اب انسان بشر کے جامہ میں ملبوس ہو کر اسی کا حکم رکھنے والا ہوا اور مولیٰ کریم نے از راہِ عنایت تمام دینی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز کر دیا، جیسے کہ فرمایا:

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ (۲ : ۱۵۰ - پ ۲ - ۲)

اور تاکہ پوری کر دوں میں نعمت اپنی تم پر اور تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

اور ابلیس لعین کو حکم دیا کہ:

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (پ ۹) — فرمایا کہ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا

شیطان نے سوال کیا:

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ○ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ○ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ

کہا اے پروردگار میرے پس ڈھیل دے مجھ کو اس دن تک کہ زندہ کیے جائیں گے۔ کہا پس تحقیق تو ڈھیل دیے گیوں سے ہے دن وقت معلوم تک

اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ	کہا اے رب میرے بسبب اس کے کہ گمراہ کیا تو نے
وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (پ۱۴ ۔ ع۳)	مجھ کو البتہ زینت دوں گا میں ان کے لیے زمین میں
(۱۵: ۳۶ - ۳۹)	اور البتہ گمراہ کروں گا میں ان سب کو

یہ میدان مجادلہ ابتدا ہی سے پیدا ہو گیا۔ بعض کے نزدیک یہ مشیت ایزد متعال ہی سے رنگ آمیزی ہوئی ہے لیکن یہ قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے۔ یہ رضا الٰہی ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ غضبی صورت ہے، نہ رحمی۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی کی زبردست سنت اللہ جل شانہ کے مطابق یہ صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ فرمایا:

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ	فرمایا جا پس جو کوئی ان میں سے تیری پیروی
فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً	کرے گا تو یقیناً جہنم تمہاری جزا پورا بدلہ ہے۔
مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ	اور جس کو تو بہکا سکتا ہے بہکا لے اپنے آواز
اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ	سے اور کھینچ بلا ان پر اپنے سواروں کو اور
عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ	اپنے پیادوں کو اور شریک ہو ان کا ان کے
فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ	مالوں میں اور ان کی اولاد میں اور وعدہ دے
وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝	ان کو اور نہیں وعدہ دیتا ان کو شیطان مگر فریب کا۔
اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ	یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تجھے غلبہ نہیں ہے
وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (پ۱۵ ۔ ع۷)	اور کفایت ہے تیرا رب کارساز۔

پس ان ہر دو نسبتوں کے ماتحت دو فریق ایک دوسرے کے مخالف پیدا ہو گئے،

یکے رحمانی اور یکے شیطانی۔ ایک کے سردار انبیائے کرام اور سید المرسلین، آخر آمد بود فخر الاولین رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مطابق:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	وہی (اللہ ہے) جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ	اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سارے
كُلِّهٖ ۝ (۴۸: ۲۸ ۔ پ۲۶ ۔ ع۱۲)	دینوں پر غالب کرے۔

اور دوسرے گروہ کا سردار ابلیس لعین، مطابق:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ	وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ
لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ	تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔ ہم شیطان کو انہی لوگوں کا
اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (پ۸ ۔ ع۱۰)	رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔

ان ہر دو نسبتوں کا جہان میں شور برپا ہے۔ ہر ایک اپنے حال کے رُو سے كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ کے سایہ میں خوش ہو رہا ہے۔ اور یہ ایسا اندھیرا ہے جس کے لیے کوئی چراغ نہیں، اور ایسی غرقابی ہے جس کے لیے کوئی ساحل ہی نہیں۔ کیونکہ ہر ایک شخص جس حال یا نسبت میں سرشار ہوتا ہے اسی کو راستہ سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اعمال کی وجہ سے كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک کے راستہ کی مشعل نور سے ہے اور دوسرے کی نار سے۔ ایک آہستہ آہستہ خدا و رسول کے قریب ہوتا جاتا ہے اور دوسرا رفتہ رفتہ دور ہوا جاتا ہے۔ ایک کی نسبت اعلیٰ کے ساتھ اور دوسرے گروہ کی نسبت اسفل کی طرف مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سرتاپا مستغرق اور اپنے

رنگ میں موافق صِبْغَةَ اللّٰهِ کے رنگا جاتا ہے، اور دوسرا گروہ سرتاپا شیطانی تصرف کا ہمہ تن شکار ہو کر اسی کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے اور ارشادِ ربانی کے مطابق مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ میں گرفتار ہوتا ہوا ہمیشہ کے لیے دوزخ کا ایندھن بن جاتا ہے۔

معلوم کرنا چاہیے کہ قبل از میدانِ دنیا یہ مخالفت اور منافقت کالعدم تھی۔ یہ سراسر بشریت سے تعلق رکھتی ہے۔ گو حضرتِ انسان میں دونوں جہان سے نشان ہیں، لیکن یہ مقام اسفل سافلین تمام بلاؤں کا گھر، ہر آزمائش کا مبدأ، ہر نیک و بد کے اثرات سے متأثر اور انسان عادت کیے جانے کے رو سے مناسبت کا حامل ہے۔ اس کے بیان میں کئی اقسام ہیں جن کی تفصیل میں بہت طول ہے۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند وجوہات خیر و شر میں اس ذوالجلال والاکرام کی توفیق سے کچھ تحریر کیا جاتا ہے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان جس مقام میں مقیم ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے۔ چونکہ یہاں بشریت کا مقید ہے جو اربعہ عناصر کی اضداد سے مرکب اور متحد واقع ہوئی ہے اس لیے اسی کا بندہ ہے۔ روحانیت سے بشریت کی طرف مبذول ہوا ہے اور ہر طرح کے اثرات تخمی، صحبتی، ملکی کا حامل ہے۔ اولاً خورش و پوشش کا بندہ، بعدہٗ تفاخر و رعونت کا قبہ اور انانیت کا شیدا ہوتا ہے، ابلیس لعین کو سوائے رغبت کے زیادہ مکلف نہیں ہونا پڑتا، کیونکہ دنیا و مافیہا کے ساز و سامان سراسر گمراہی اور غفلت پر مبنی ہیں، تاہم انانیت کی نسبت شیطانِ رجیم و لعین سے منتسب ہے اور اس کا تعلق ارضیت سے وابستہ ہے۔ وہ اس طرح پر کہ انسانی ضمیر کا تعلق جسمانیت سے اور جسم کا عناصر اربعہ سے اور عناصر اربعہ کا واسطہ ارضیت سے ہے۔ گو یہ تعلق عارضی اور چند روزہ ہے

لیکن اس کا اثر جو سراسر حجاب بلکہ سراپا عذاب ہے، رُوح یا کھلے لفظوں میں انسان اور اس کے ضمیر سے وابستہ ہے۔ اور وہ اس لیے کہ بعد از انتقال اس کا حامل انسان ہی ہوگا۔ كَمَا قَالَ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ	اور پڑھ اوپر ان کے قصہ اس شخص کا کہ دیں ہم
اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ	اس کو نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس پیچھے
فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ	لگا یا اس کو شیطان نے پس ہو گیا گمراہوں سے اور اگر
بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ	چاہتے ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان نشانیوں
اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ	کے و لیکن وہ لگ گیا طرف زمین کی اور پیروی کی
اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ	خواہش اپنی کی پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے
يَلْهَثْ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ	اگر بوجھ رکھے تو اوپر اس کے زبان لٹکائے یا چھوڑ دے
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ	اس کو زبان لٹکائے۔ یہ ہے مثال اس قوم کی کہ جھٹلایا
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۹ - س ۱۲)	نشانیوں ہماری کو۔ پس بیان کر قصے تو کہ وہ فکر کریں۔

تو صاف ظاہر ہے کہ بلعام بن بعور کی ہمیشگی دنیا میں تو ممکن نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہمیشگی یعنی اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ نہ کسی کو ہوئی اور نہ ہوگی۔ معانی آیاتِ مبارک اس پر دال ہیں کہ اس نے اس مقام پر اپنے سب مدارج و معارج کو فروخت کر دیا اور مطابق ارشادِ باری تعالیٰ وہ اسفل کی طرف گرا اور آیات کے کپڑوں کو پھاڑ کر دنیا و مافیہا کا شیدا ہو گیا۔ گویا اس نسبتِ ارضیت سے قدم نہ اٹھا سکا، ورنہ فرمانِ مبارک صاف عیاں ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انہی آیات سے اس کے درجے بلند کرتے لیکن وہ خود لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے ماتحت خواہشاتِ رذیلہ کی طرف جھک

گیا اور اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ کو ہی بہتر سمجھا اور ہمیشہ کے لیے کتوں کی زنجیر میں جکڑا گیا۔ یہ ہے نسبت عالم شہود۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا اس کے لیے اظہر من الشمس ہے کہ جو اس مقام سے، اس نسبت رذیلہ سے پاک ہوا، فلاح پانے والا ہوا۔ اور جو اس جگہ میں رہ گیا وہ خاک میں مل گیا، جس سے مراد اس مقام میں مستغرق ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ حدیث شریف کے حکم سے ایسا شخص مثل چوپاؤں کے ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ یعنی چوپاؤں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ۔ کیونکہ چارپایہ اپنی تخلیق میں کامل ہے، اور حکم خدا اور ذکر خدا سے غافل نہیں۔ لیکن انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے چوپایہ کی طرح ہو تو زیادہ گمراہ ہے۔ ایسا شخص خواہ نماز بھی پڑھے عبادت و ریاضت بھی کرتا ہو تاہم رجوع الی الدنیا اس امر کا مقتضی ہوتا ہے کہ اس کے اصل مقصود و حصول فی الآخرہ کو مفقود کر دے، اور اپنی التجاؤں اور دعاؤں کی انتہا حاجات الدنیا ہی میں مقید رکھے، کما قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید و فرقان الحمید

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ	جو کوئی ارادہ کرتا ہے زندگانی دنیا کا اور اس
زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ	کی زینت کا پورا دیں گے ہم طرف ان کی عمل ان کے
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝	بیچ اس کے اور وہ بیچ اس کے کمی نہ کیے جائیں گے
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	یہی ہیں وہ لوگ کہ نہیں ہے واسطے ان کے آخرت
اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا	میں مگر آگ اور کھویا گیا جو کچھ کیا تھا انہوں نے بیچ
وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (پ۱۲-ع۲)	اس کے اور جھوٹا ہوا جو کچھ کہ کرتے تھے۔

ایسے شخص سے وہ انسان بدرجہا بہتر ہے جو محض فریضہ کو ادا کرتا ہو، باقی وقت خواہ وہ اپنی ضروریاتِ معیشت کے ماتحت کاروبار میں صرف کرتا ہو مگر دنیا و مافیہا سے نفور اور آخرت کی دھن میں متفکر و گرفتار۔ اس کے علائق متعلقہ فی الدنیا کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ اس کی نسبت فی الآخرۃ آہستہ آہستہ مستحکم اور مضبوط ہوتی جائے گی اور نسبت ارضیہ جس کو نفسیہ کہنا روا ہے، رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جائے گی۔ گویا جسمانیت پر روحانیت غالب ہوتی جاتی ہے، پھر اس کو عقل سلیم سے حصہ و نصیب کی اُمید ہو جاتی ہے جس سے وہ علم حال کا مسبوق اور خیر و شر کا متمیز ہو جاتا ہے۔ انسانی ضمیر یعنی مملکت انسانیہ میں جنگ و جدال شروع ہو جاتا ہے۔ انسان ان ہر دو لشکروں میں بمنزلہ خلیفہ کے مجاہد ہوتا ہے۔ اس کی سعی اور ہمت باطنی سے ہر دو فریق تقویت حاصل کرنے والے ہوتے ہیں، اور ہر دو کا اثر اسی کے ضمیر پر ہوا کرتا ہے۔ اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جو نسا اثر قلب انسانی پر مؤثر ہوتا ہے اسی کو یہ چاہنے والا اور اسی کے رنگ میں رنگا جانے والا بن جاتا ہے۔ یہی نسبت کا اصل اور مناسبت کا اتحاد ہے۔ اور یہ:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (۲۱: ۳۵)	اور آزماتے ہیں ہم تم کو ساتھ برائی اور بھلائی کے آزمائش کو

(پ۱۷-ع۳/۳۵) اور

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (پ۳۰-ع۱۶)	پس جی میں ڈالی اس کے بدکاری اس کی اور پرہیزگاری اس کی

سے عبارت ہے۔ اس مقام میں ہر دو نسبتوں کا معائنہ کرتا ہوا تغیر و تبدل سے عالم اور اپنے حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شر کی نسبت کا سردار ابلیس علیہ اللعنۃ اور خیر کی نسبت کے شہنشاہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ابتدا انسان کے عمل خیر اور شر سے ہوتی ہے اور انتہا نسبت

کامل سے مکمل ہوجاتی ہے۔ فرماں برداری اور نافرمانی اس کے ضمیر میں تخم کی مانند ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (۴۲: ۲۰) پ ۲۵ - ع ۴

جو کوئی ارادہ کرتا ہے کھیتی آخرت کا زیادہ دیتے ہیں ہم اس کو بیچ کھیتی اس کی کے اور جو کوئی چاہتا ہے کھیتی دنیا کی دیتے ہیں ہم اس کو کچھ اس میں سے اور آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں۔

اور اس کی نشوونما ہر دو صورت میں سے مطابقت پر مبنی ہے یعنی رحمی اور غضبی۔ ایک کی امداد کے لیے تنزلِ ملائکہ، مطابق:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (پ ۲۴ - ع ۱۸)

بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں یہ کہ مت خوف کرو اور نہ غم کرو اور خوشخبری سنو اس جنت کی کہ تھے تم وعدہ دیے جاتے۔

اور دوسرے کی تنزلِ شیاطین، مطابق:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ (پ ۱۹ - ع ۱۵)

کیا بتاؤں میں تم کو کہ کس پر اترتے ہیں شیطان، وہ اترتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے گنہ گار پر رکھتے ہیں شیطان کان اپنے اور اکثر ان کے جھوٹے ہیں۔

کا ارشاد اظہر من الشمس ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی امداد من اللہ و رسول کی جاتی ہے

اور دوسرے کی امداد محض غضب و قہر اور مردودیت کے سوا نہیں ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ (۴۳: ۳۶) پ ۲۵ - ع ۱۰

اور جو کوئی شب کوری کرے یاد خدا کی سے مقرر کرتے ہیں ہم واسطے اس کے ایک شیطان پس وہ واسطے اس کے ہمنشین ہوتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کی زبردست سنت بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے رُو سے ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کسی معصیت کا مرتکب نہ ہو مطابق ارشاد مولیٰ کریم شیطان تصرف نہیں کرسکتا۔ اور یہ کئی وجہ پر منقسم ہے۔ اوّل: رغبت اور خواہشات کے ضمن میں زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ کے مصداق ان کے اعمال کو زینت دینا، هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کے رو سے دماغ میں خلل ڈالنا، اس پر آمادہ بلکہ مستقل کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی خاص تصرف نہیں ہوتا جب انسان نیکی کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان لعین کے خرمن کو آگ لگتی ہے، نامطابقت کی وجہ سے کمزور ہوجاتا ہے، دردِ کمر بڑھنے لگتا ہے، باوجود اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا کے دھوکا، فریب اور حیلے کرنے لگتا ہے۔ عبادت میں ریاکاری، آسائش میں بزرگی، تقویت میں رعونت اور تکبر، محبت الٰہی میں شریعت غرا اور فرماں برداری سے آزادی، توکل کے نشیب و فراز میں فکرمندی اور مایوسی، قبولیت خلق کو باعث زینت اور اس کی ہوس، بڑائی اور امارت کا سبق دیتا ہے۔ ماسوائے ان ہزلیات کے صاحب کشف و حال کو عجیب و غریب کیفیات میں ملبوس کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ملہم حقیقی کے الہام میں گڑبڑ مچاتا ہے۔ تخیلات اور استغراق تنا میں خلل اندازی کرتا ہے، کَمَا قَالَ اللّٰہُ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ
وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ
فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي
الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ لِّيَجْعَلَ مَا
يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۙ وَّ
لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
(۲۲: ۵۲-۵۴) پ۱۷ - رکوع ۱۴

اور نہیں بھیجا ہم نے پہلے تجھ سے کوئی رسول اور نہ نبی
مگر جس وقت کہ آرزو کرتا تھا ڈال دیتا تھا شیطان
بیچ آرزو اس کی کے پس موقوف کر دیتا ہے اللہ جو ڈالتا
ہے شیطان پھر محکم کرتا ہے اللہ نشانیوں اپنی کو اور
اللہ جاننے والا ہے حکمت والا۔ تو کہ کرے اس چیز کو
کہ ڈالتا ہے شیطان آزمائش واسطے ان لوگوں کے کہ
بیچ دلوں ان کے کے مرض ہے اور جو کہ سخت ہیں دل
ان کے اور تحقیق ظالم البتہ بیچ خلاف دور کے ہیں اور
تاکہ جانیں وہ لوگ کہ دیے گئے ہیں علم یہ کہ وہ حق ہے
رب تیرے کی طرف سے پس ایمان لائیں ساتھ اس کے پس
عاجزی کریں واسطے اس کے دل ان کے اور تحقیق اللہ
راہ دکھانے والا ہے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے
طرف راہ سیدھی کے۔

لیکن ان آیات بیّنات سے یہ بھی صاف عیاں ہے کہ انبیائے کرام از راہ عنایت الٰہی اس بلا سے معصوم ہیں۔ قبل از حائل اس القا سے منزہ ہیں۔ اور مومن اولوا الالباب اس میں تمیز کرنے والا ہوتا ہے۔ اور جن کے دل میں مرض ہے ان کے لیے آزمائش ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے: ایک مناسبت اور مطابقت پر، اور دوسری مخالفت اور ناموافقت پر۔ در اصل یہ مطابقت

مخالفت سے اور مخالفت مطابقت سے ملی جلی ہوتی ہے جن کا اصل ایک ہے۔ مخالفت نامناسبت کی وجہ پر موافقت اور مخالف نسبت سے دھوکا دے کر برطرف کرتا ہے اور مناسبت اپنے ساتھ ملانے اور موافقت کرنے پر ہے جو عین مخالفت ہے۔ اس مشکل کے حل کرنے کو ارشاد مولیٰ کریم اظہر من الشمس ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ
اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝ (۲: ۲۵۷ - پ۳ - ر۲)

اللہ دوستدار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے
نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے طرف روشنی کے
اور جو لوگ کہ کافر ہوئے دوست ان کے شیطان
ہیں نکالتے ہیں ان کو روشنی سے طرف اندھیروں کے
یہ لوگ ہیں رہنے والے آگ کے، وہ بیچ اس کے
ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اب نور ایمانی سے معلوم ہوگا کہ نور سے ظلمات کی طرف نور سے مخالفت اور نار سے موافقت اور مناسبت ہے۔ اور نار سے نور کی طرف نار کی مخالفت اور نور سے موافقت اور مناسبت ہے۔ اس مقام پر انسان کی حالت نفس لوّامہ کے مترادف ہو جاتی ہے۔ طالبانِ صادق کے لیے سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور اسی فکر میں مستغرق رہنا۔ اس غفور الرحیم سے مدد طلب کرنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اور مریض قلب اور معصیت کی طرف جھک جانے والوں کے لیے تو معاملہ ہی صاف ہو جاتا ہے اور شیاطین سے موافقت اور مناسبت کی رو سے نسبت کامل کا حامل ہو جاتا ہے۔ ماخوذ فی الضمیر کے آئینہ سے صراط المستقیم کا معائنہ

کرنے والا، تمام مدارج اور معارج کا بادشاہ، اپنے زعم میں مکمل اکمل ہو بیٹھتا ہے اور بحکم خدا مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ درحقیقت مِنْكَ اور مِمَّنْ تَبِعَكَ میں کوئی خاص فرق نہیں، صرف جنسیت کے لحاظ سے کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن نسبت کے رُو سے کوئی تفاوت نہیں ہوا کرتا، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے، قَبِيْلُهٗ کی بساط پر سب یکساں ہیں۔ ظاہر و باطن میں ایک دوسرے سے متفق اور ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ظاہراً مطابقت کی وجہ سے اور باطناً نسبت تنزیل شیاطین کے رُو سے۔

یاد رہے کہ یہ مناسبت حالی خود بخود تعاون کے میدان میں استقلال اور تصرف کی مقتضی ہے اور نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف، بلا وجوہ و اسباب عداوت اور نامطابقت ہے۔ نور اور نار کا سا حال ہے۔ یہ گروہ نور سے پرورش پانے والا ہے اور وہ نار سے۔ اور عجب یہ ہے کہ سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے والا اور خصوصاً نسبت اور حال رکھنے والا عملی جامہ میں یا حالی بساط سے سہواً سر مو بھی تجاوز کرے تو فوراً نسبتِ مخالف کے تصرف کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اور صاحب حال تو اس کی کیفیات سے معاً مطلع ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب سے بڑا دھوکا ہے۔ اللہ کے بندے مِن اللہ حفاظت کی برکت سے محفوظ ہوتے ہیں۔ کیفیات و سرور، قبض و بسط وغیرہ دونوں طرف نمایاں ہوتے ہیں۔ گو گرمی سردی کا سا حال ہے، کفر و اسلام کا معاملہ ہے، تاہم اس میں کئی وجہ پر دھوکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً توحید میں انکارِ رسالت، محبت اہل بیت میں بساطِ اطاعت اور متابعت سے برطرف، اور زہد میں سنت کے خلاف ترکِ دنیا، بمصداق ؎

ما مقیماں بکوئے دلداریم　　رُخ بہ دنیا و دیں نخے آریم

لیکن اس امر کا فیصلہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے چند لفظوں میں ایسا واضح کر دیا ہے کہ کسی کلام کی گنجائش باقی نہیں رہی:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ　　کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری
یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳:۳۱۔ پ۳۔ ر۱۲)　　اتباع کرو، محبت کرے گا تم سے اللہ تعالیٰ۔

عجب یہ ہے کہ سنت نبوی کا گروہ محض دعوت دینے اور ہمدردی اور خیر خواہی اور صراط المستقیم کی طرف بُلانے والا ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا فریب نہیں ہے۔ لیکن ان سب امور کے باوجود دوسرے گروہ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ لیکن اُن کا اثر متبعین سنت پر بہت جلد اور زبردست ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ اس مثال سے واضح ہو گی کہ اندھیرا دور کرنے اور چراغ روشن کرنے کے لیے بہت سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر اس کی حفاظت بھی ازبس ضروری ہے۔ لیکن ذرا سی مخالف ہوا سے چراغ کے گُل ہو جانے سے اندھیرا خود بخود ہو جاتا ہے۔ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے انسان کی سرشتی حالت کو اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ سے منسُوب فرمایا ہے۔ سوائے تاثیرات کے حامل ہونے کے کسی تعلیم کی حاجت نہیں ہے۔ اسفل سافلین کا مقام یعنی دنیا و مافیہا یا صحت حال کی رُو سے بشریت خود بخود استاد ہے۔

سب سے خطرناک اور لطیف تر اسلام اور دین الحق میں تصرف جو وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآىِٕرٌ (۱۶:۹۔ پ۱۴۔ ر۸۔ اور اوپر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعض ان میں سے ٹیڑھی ہیں) کے مترادف ہے، توحید الٰہی اور محبت لامتناہی میں ہوا کرتا ہے۔ اور اس کا انحصار سراسر سعادت، عبادت، ریاضت، ترکِ دنیا، رضائے الٰہی اور اخلاص پر مبنی ہے۔ اور وہ اس طرح

پر ہے کہ اس عزیز الحکیم نے اپنی توحید اور محبت کو ایک ہی ظرف میں لبریز کر دیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اور بعضے لوگوں میں سے وہ ہے کہ پکڑتا ہے
اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ	سوائے اللہ کے شریک محبت کرتے ہیں ان سے
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ	جیسا کہ محبت خدا کی اور جو لوگ کہ ایمان لائے
(۲:۱۶۵- پ۲ - رکوع ۴)	ہیں بہت سخت ہیں محبت میں واسطے اللہ کے۔

جاننا چاہیے کہ شرک دو وجہ پر ہے۔ ایک جلی اور دوسرا خفی۔ جلی تو سوائے باری تعالیٰ کے کسی چیز کو معبود ٹھیرانا یا مددگار بنانا ہے۔ لیکن خفی جیسا ان آیات سے ظاہر ہو رہا ہے، محض محبت ہے۔ تو ان معانی سے کسی نبی، رسول، مومن، ولی سے محبت کرنا یا مدد مانگنا صریح شرک ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ اور وہ اس لیے کہ یہ سب مِن دُون اللہ میں شامل ہیں۔ لیکن دوسری جگہ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۵:۵۵۔ پ۶، ر۱۲) اس کے خلاف ہے۔ مان لیا کہ عوام الناس کی محبت مِن دُون اللہ شرک اور کفر ہے لیکن جن ہستیوں کی تعریف اس خالق موجودات نے مخصوص فرمائی ہے وہ ہمارے دوست ہیں، ان کے لیے شرک کا گمان بھی کفر ہے۔ تو اس تضاد کی تطبیق کے لیے ماننا ہی پڑے گا کہ من دون اللہ سب کی محبت شرک ہے اگر فی سبیل اللہ سزا یا جائز بلکہ ذریعہ حصول اور مقصود ہے۔ اور سبیل کا انکار سنت کا انکار اور اسباب سے اعراض ہے۔ اور اسباب کا انکار مسبب سے روگردانی ہے، اور یہ کفر ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

تک اعتقاد کے میدان میں توحید ہی صراط المستقیم ہے۔ تمام سلسلہ نبوت و رسالت کے حامل توحید ہی لے کر آئے، یہی تعلیم دی۔ ظاہری، باطنی، قالی، افعالی، حالی وجہ پر اقرار اور رویت سب کا سب اسی شجر کا ثمر ہے۔ اطاعت و فرماں برداری، صبر و استقامت اسی شجر کی پرورش اور حفاظت کا ذریعۂ نیک ہے۔ اسلام و ایمان کا انحصار اسی پر ہے۔ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس کے بغیر بے سود ہے۔ لیکن ایک گروہ اسلام نے جو اصل توحید سے بے خبر ہیں، اسے ایسا گہ کے پکڑا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہو گئے ہیں اور ان کے سر پر زعمی توحید کا ایسا بھوت سوار ہوا ہے جس نے عقل سلیم کو بالکل ڈھانپ لیا ہے۔ حق و ناحق دونوں کا انکار کر رکھا ہے، طریقت کو بدعت اور سبیل کو شرک خیال کرتے ہیں۔ گمان فاسد کے غبارہ کو اس انتہائی اوج فلک پر لے گئے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ توحید ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ساتھ پڑھنا شرک ہے۔ نعوذ باللہ۔ ایسے کلمات سن کر کہنا ہی پڑے گا کہ بدون نور رسالت ایسی توحید توحید ابلیس کے مترادف ہے اور اس کی نسبت سے عین مناسبت ہے۔ کیونکہ اس کا انکار غیر کو سجدہ کرنے کے رو سے تھا۔ لعنت کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا لیکن غیر کو سجدہ نہ کیا۔ موحد حنیف اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جس نے غیر کی عظمت کو تسلیم نہ کیا اور مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا کا تاج سر پر رکھے ہوئے مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ کے ہمراہ دوزخ کا ایندھن ہو گیا۔

دراصل ابلیس علیہ اللعنۃ نے امر خداوندی کا انکار کیا اور امر کا انکار آمر کا انکار ہوا کرتا ہے اور یہی کفر اور اس کا اصل ہے۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر مقام و محل میں اسی کے مطابق عمل ہوا کرتا ہے اور یہ سنت اللہ یعنی طریقہ احکم الحاکمین ہے۔ مطابق ارشاد لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا

نہ کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ نادرات کے سوا کوئی حصول بھی سنت اللہ کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا۔ (آپ خدا کے دستور کو کبھی پھرا ہوا نہ پائیں گے) دیکھیے! فرمان ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ	کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھیوں
الْفِيْلِ ۞ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ	والوں کے ساتھ کیا کیا؛ کیا ان کے مکر کو سرتاپا
تَضْلِيْلٍ ۞ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا	غلط نہ کر دیا؛ ان پر غول کے غول (ابابیل) پرندے
اَبَابِيْلَ ۞ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ	بھیجے جو ان لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے
سِجِّيْلٍ ۞ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ	سو (اس طرح سے) ان کو کھائے ہوئے بھوسے
مَّاْكُوْلٍ ۞ (۱۰۵:۱-۵) پ۳۰۔ ر۳۰	کی طرح کر دیا۔

فَعَلَ رَبُّكَ کی نسبت محض فاعلِ حقیقی کی طرف عیاں ہے لیکن ظہور و عمل کے میدان میں ابابیل کا فعل مظہر ہے۔ عالمِ اسباب میں اسباب کی سنت کو کس قدر لازم رکھا ہے۔ دوسری جگہ اسی مترادف فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ	کیا تو نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ سایہ کو
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا	کیونکر پھیلایا ہے؛ اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا ہوا کر دیتا
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۞ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ	پھر اس پر سورج کو علامت (دلیل) مقرر کیا۔ پھر
اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۞ (۲۵:۴۵-۴۶۔ پ۱۹)	ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا۔

کیا ہی واضح فرمایا ہے کہ سایہ کا بڑھانا اور گھٹانا پھر اس کو اپنی طرف قبض کر لینا میرا فعل ہے

لیکن اس فعل کے لیے شمس کو دلیل ٹھیرایا ہے۔ تو معلوم کیا چاہیے کہ اس فاعلِ حقیقی نے اپنے فعل کے ظہور کے لیے سُورج کو رہنما بنایا ہے۔ عمل کے میدان میں مشاہدہ ہر کہ و مہ پر روشن ہے کہ ارض و سما میں نظامِ شمسی معین فرمایا ہے۔ ظِل و حرور، لیل و نہار، حرارت و برودت، سب اسی کے نشیب و فراز، قُرب و بُعد اور کشف و حجاب کا نتیجہ ہے۔ کل موجودات کا خالق اس لم یزل و لایزال کے سوا کسی کو سمجھنا کفر اور شرک ہے۔ لیکن موجودات یعنی نباتات اور معدنیات میں تصرفِ شمس کا انکار بھی اس سے کم نہیں۔

اب غور و فکر سے فرمان ایزد متعال کا مطالعہ باعثِ رشد و ہدایت ہو گا کہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِيْرًا یعنی منور کر دینے والا چراغ یا آفتاب فرمایا ہے اور مومنوں کی مثال كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ یعنی نبات سے تشبیہ فرمائی ہے جس طرح عالمِ دنیا میں جسمانیت کا رہبر شمس کو مقرر کیا ہے اسی طرح عالمِ روحانیت میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سراجًا منیرًا سے نامزد کیا ہے۔ ہر چند یہ دونوں شمس مخلوق کے سردار اور فیاض ہیں اور تا قیامت ان کا تصرف جاری و ساری رہے گا۔

گو حضور کو شمس سے اور شمس کو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مثال دینا سراسر بے ادبی ہے مگر فہمائش کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں۔ ورنہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"۔ شمسین بفضلہ تعالیٰ تا قیامت فیاض و با تصرف رہیں گے لیکن آفتابِ نبوت قیامت کے بعد بھی رحمۃ للعالمین اور اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ کے ضمن میں ابدی برسات سے قلبوں کو ٹھنڈا کرتے رہیں گے خواہ خطاف کی مانند بمصداق ؎

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

کور چشموں اور دل کے اندھوں کو سجھائی نہ دے۔

اس کور چشمی کو ہٹانے اور بصارت قلبی کے سجھانے کے لیے کیا ہی بیّن فیصلہ فرما دیا ہے کہ سِرَاجًا مُّنِيْرًا کے ساتھ معاً بلا عطف و جملہ معترضہ:

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ	اور مومنوں کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لیے اللہ کی
اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ (۳۳:۴۷۔ پ ۲۲، ر ۲)	طرف سے یہ بہت بڑا فضل ہے۔

نازل فرما دیا ہے۔

اب عدل و انصاف سے کلام الٰہی کی تطبیق میں غور کرنا لازم ہے کہ آفتاب رسالت معبوث کرنے والا جس کا مفاد مومنین کے لیے عیاں ہے، کیا صرف ان مومنوں کے لیے ہے جو محدودے چند حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، یا تمام مومنین کے لیے ہے جو گزر چکے ہیں اور فی زمانہ موجود ہیں؟ تو بروئے قرآن ماننا ہی پڑے گا کہ یہ حکم ان کے لیے بھی منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ ماضی، حال اور مستقبل سب وقتوں میں اس کا تصرّف یکساں ہے۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ حیات النبی با تصرّف ثابت ہوتے ہیں، اور ان دلائل سے انکار کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

باوجود ان دلائل اور نص قطعی کے بھی ضد اور تعصب کی بنا پر انکار ہو تو اس مرض کا کوئی علاج نہیں، اور یہ ایسی گم گشتگی ہے جس کے لیے کوئی سُراغ ہی نہیں۔ ایسی غرقابی ہے جس کے لیے کہیں ساحل نہیں۔ کیونکہ اس منعم حقیقی نے سب سے بڑی اور انتہائی نعمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ	اور تاکہ پوری کروں میں نعمت اپنی اوپر تمہارے
تَهْتَدُوْنَ ۝ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ	اور تو کہ تم راہ پاؤ جیسا بھیجا ہم نے بیچ تمہارے پیغمبر
رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا	تم میں سے۔ پڑھتا ہے تم پر آیتیں ہماری اور پاک
وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ	کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت
الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ	اور سکھاتا ہے تم کو جو کچھ کہ نہیں تھے تم
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲:۱۵۰-۱۵۱۔ پ ۲)	جانتے۔

اور اس کا مفاد ذکی پر رکھا ہے۔ ان آیات کو غور سے مطالعہ فرمائیے۔ کہ آیات کا پڑھ کر امرو نواہی متنبہ کرنا تو يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا پر بس ہے اور يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس نور سے نسبت ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توجہ باطنی سے اپنی امت میں سے جس پر مہربانی فرمائیں، بحکم خدا القا کر دیں۔ اور کفران نعمت محرومئ نعمت کی علت ہے۔ اس بیان میں بہت طول ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر بیان ہوگا۔ اس لیے میں قلم کو روکتا ہوا اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں:

اوپر گزر چکا ہے کہ ابتدا سے ہی دو نسبتوں (شر و خیر) کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ ایک (شر) کا سردار ابلیس اور دوسری (خیر) کے شہنشاہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جن کا ثبوت قرآن شریف سے ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ سخت دھوکا ابلیس کا یمین (دائیں طرف) یعنی نیکی کی طرف سے ہے۔ جو صاحب نصیب نسبت نبوی سے کم و بیش حصہ رکھنے والے ہیں، وہ توفیق الٰہی سے صراط المستقیم پہ چلے جا رہے ہیں۔ جو سراسر نعمت عظمیٰ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ

بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ سے حصہ لینے والے ہیں۔ اور دوسرے اس سے اعراض کرنے والے اپنے زعم کے دریائے توحید میں غوطہ زن ہونے کے بعد انکار رسالت کے ساحل پر سر نکالنے والے حقیقت توحید سے جاہل، اثبات توحید کے بجائے نفی شرک کو عین توحید خیال کرنے والے نسبت رسالت سے محروم، اپنے مقصود سے معدوم، اپنی سیاہی قلب سے لکھی ہوئی کتاب کو سامعین کے روبرو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نصب العین ان آیات سے یہ ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور امر و نواہی کے مطابق دین الحق کی تلقین کر کے چلے گئے۔ اس سے زیادہ حضور کی نسبت خیال کرنا یا خوف و رجا کے ماتحت اعتقاد رکھنا سراسر گمراہی اور ضلالت ہے"

جاننا چاہیے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ کفر و اسلام، نفاق و ایمان، خیر و شر، نور و ظلمت، موت و حیات وغیرہم۔ تو نور رسالت سے انکار اور اعراض بھی اپنی ضد کے سوا نہیں۔ پھر نور کی نسبت کا حصول کیسے اور کس جگہ سے ہو سکتا ہے؟ خداوند کریم جل و علا نے اس امر کو واضح کرنے کے لیے کیا ہی بین ارشاد فرمایا ہے:

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۵: ۱۵۔ پ۶۔ رکوع ۷)

بیشک آیا ہے تمہارے پاس اللہ تعالیٰ سے نور اور کتاب بیان کرنے والی

کلام الٰہی میں نور کا لفظ بہت سی آیات میں مذکور ہے۔ مثلاً:

(۱) اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُہُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَہُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ (۲: ۲۵۷۔ پ۳۔ ر۲)

(۲) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (۶:۱)

(۳) قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّہُدًی لِّلنَّاسِ۔ (۶: ۹۲۔ پ۷)

(۴) اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ۔ (۶: ۱۲۳۔ پ۸)

(۵) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (۹: ۳۲۔ پ۱۰۔ ر۱۱)

(۶) قُلْ ہَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَمْ ہَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (۱۳: ۱۶)

(۷) ہُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۳۳: ۴۳۔ پ۲۲)

(۸) وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ (۳۵: ۲۰۔ پ۲۲۔ ر۱۵)

(۹) اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ (۳۹: ۲۲۔ پ۲۳۔ ر۱۷)

(۱۰) مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّہْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲: ۵۲۔ پ۲۵۔ ر۶)

(۱۱) ہُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۵۷: ۹۔ پ۲۷۔ رکوع ۱۷)

(۱۲) یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ وَیَغْفِرْ لَکُمْ (۵۷: ۲۸۔ پ۲۷۔ رکوع ۲۰)

(۱۳) یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (۶۱: ۸۔ پ۲۸۔ رکوع ۹)

(۱۴) رَسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ (۶۵: ۱۱۔ پ۲۸۔ ر۱۸)

(۱۵) يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (۶۶: ۸۔ پ۲۸۔ ر۲۰)

ان آیات مبارکہ میں سے اکثر کے معانی اور تفسیر میں دو گروہ کا اختلاف ہے۔ ایک کے نزدیک تو نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور دوسرے گروہ کے افراد اس سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ مناظرہ و مباحثہ میں اس حد حیا تک پہنچتے ہیں کہ "کیا حضورؐ کی لحیہ مبارک سیاہ نور تھی"؟ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ ایسے شخصوں کا تو انجام بھی خطرہ میں ہے۔ صحت حال اور تطبیق کلام الٰہی کے رُو سے ایک نے تو کم فہمی کی بنا پر غلو کیا ہے اور دوسرا انکار اور کفر کی وجہ پر حقیقت سے دُور ہوا ہے۔ کیونکہ ان تمام آیات پر غور و فکر کرنے سے بحث و تنقید کا میدان ختم نہیں ہو سکتا۔ دُوسرے گروہ نے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ میں نور اور کتاب مبین کو ایک سمجھنے میں غلو کیا ہے اور اس کے لیے قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ کو دلیل پکڑتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ کتاب انسانوں کے لیے نور اور ہدایت ہے لیکن اس کے حامل انسان ہیں عمل کی رُو سے اور فرمانبرداری کی وجہ پر۔ اور اس کا نور ہونا عملی جامہ میں مستور ہے۔ ورنہ یہ صرف عبارت ہے جو صحت صوت کے لحاظ سے حروف اور الفاظ کے لباس میں ملبوس ہے۔ معانی اور برکات و اسرار کے حامل تو وہ اشخاص ہی ہیں جو ایمان رکھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ہے جس کا اصل صفت بالذات مولیٰ کریم کے قدوسی پردہ میں نہاں ہے لیکن دوسری

تمام آیات میں سے ایک کی بھی اس کے ساتھ تطبیق نہیں ہے۔ غور سے مطالعہ کرنا روز روشن کی طرح ظاہر کر دیتا ہے۔ بالخصوص آیات نمبر ۴، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۵ بالکل واضح ہیں کہ نور من اللہ ایک نعمت عظمیٰ اور حیات ابدی ہے جس سے ہدایت فی الدنیا اور مدارج فی الآخرہ حاصل ہوا کرتے ہیں۔ نہ ہی یہ کتاب ہے اور نہ ہی مومن اور مرسل ہو سکتے ہیں۔ اختلاف صرف عارضہ اور کم فہمی کے سبب سے ہے۔ تعجب ہے کہ کتاب کو (جو کاغذ، سیاہی، حروف و الفاظ کی صورت ہر ایک چیز سراسر حادث ہے) نور ماننے پر مُصِر ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور مان لینے میں انکار کس وجہ پر ہے؟ کوئی خاص عداوت ہے جس پر انکار کا انحصار ہے۔

پہلا گروہ کسی حد تک حق پر ہے۔ اس کی غلطی کا انحصار حفظ مدارج پر ہے۔ اور وہ اس لیے کہ انسان کی حالت اسفل اور اعلیٰ کئی درجوں پر منقسم ہے۔ مثلاً مسلم و کافر، مومن و منافق، عالم و جاہل، روح و بشر و مثلہا۔ انسان جس نسبت سے مناسبت پیدا کرتا ہے اسی صفت سے موصوف اور اسی اسم سے موسوم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مسلم کو اسلام سے، کافر کو کفر سے، مومن کو ایمان سے، منافق کو نفاق سے، عالم کو علم سے، جاہل کو جہالت سے نسبت ہے۔ قرآن حکیم بھی انہی صفات اور اسما سے مخاطب کرتا ہے۔ جیسا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وغیرھا۔ مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ سوائے انسان کے جو ذاتی اسم ہے باقی سب صفاتی ہیں اور ہر ایک کو اس کی صفت سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ولی کو ولایت سے، نبی کو نبوت سے، رسول کو رسالت سے نسبت ہے اور ان سب نسبتوں کا تعلق اس خالق موجودات سے ہے، خواہ مقبولیت سے ہو یا مردودیت سے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مطابق فرمان مولیٰ کریم

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	نہ پائے گا تو کسی قوم کو کہ ایمان لاتے ہوں ساتھ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ	اللہ کے اور دن پچھلے کے دوستی کریں ساتھ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ	اس شخص کے کہ مقابلہ کرتا ہے اللہ کا اور رسول
اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ	اس کے کا اگرچہ ہوں باپ ان کے یا بیٹے ان کے
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ	یا بھائی اُن کے یا کنبہ اُن کا یہ لوگ لکھ دیا ہے
وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط (۵۸ : ۲۲)	اللہ نے بیچ دلوں اُن کے کے ایمان اور قوت
(پ ۲۸ - رکوع ۳)	دی ہے ان کو ساتھ روح کے اپنی طرف سے

اور مطابق:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ	اور جو کوئی شب کوری کرے یاد خدا کی سے مقرر
لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ٥ (۴۳ : ۳۶)	کرتے ہیں ہم واسطے اس کے ایک شیطان پس وہ
پ ۲۵ - رکوع ۱۰	واسطے اس کے ہمنشین ہوتا ہے۔

جیسا فاعل حقیقی نے فرمایا ہے کہ:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ	جو کچھ پہنچے تمہیں نیکی سے پس وہ اللہ تعالیٰ کی
وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ	طرف سے ہے اور جو کچھ پہنچے تمہیں برائی سے
نَّفْسِكَ ط (پ۵ - رکوع ۸)	پس وہ تمہارے اپنے نفس سے ہے

اور مطابق:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ	کیا پس جو شخص کہ کھولا ہے اللہ نے سینہ اس کا واسطے

فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ط (۳۹ : ۲۲ پ ۲۳ ع ۱۷)	اسلام کے پس وہ اوپر نور کے ہے رب اپنے سے

یعنی اس نور کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور نور سے ظلمات کی طرف کی نسبت شیطانوں کی طرف کی ہے۔ اور اس نور السموات والارض نے مومن کی ہدایت کو اپنے نور سے ارشاد فرمایا ہے۔ مطابق يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ یعنی جس کو چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ تعلیم خارجی نہیں ہے کہ امر و نہی کی طرح دعوت عمل ہو۔ بلکہ اس کی رحمت سے انسانی ضمیر میں ودیعت کے مترادف ہے۔ ایک طاقت ہے جو رگ و ریشہ میں سما جاتی ہے۔ ایک قوت ہے کہ طاقت جسمانی کو جو بہیمیت کے مترادف ہے، کمزور کر دیتی ہے۔ قرب خداوندی، لقائے الٰہی اور مشاہدۂ لامتناہی، بصارت قلبی اس کے فرع کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا چلنا پھرنا، کلام و گفتار، صحت و بیماری اسی وجہ پر نمایاں ہوتا ہے بارہا کے تجربہ سے ثابت ہے کہ جب بندگان خدا کو اس میں ذرا کمی واقعہ ہوتی ہے تو کمزور اور بیمار ہو جاتے ہیں لیکن جب یہ ورود درست ہوتا ہے تو قوی، توانا اور تندرست ہو جاتے ہیں۔ بمصداق ؎

چو تو پنہاں شوی از من ہمہ تاریکی و کفرم ‌‌‌‌ چو تو پیدا شوی بر من مسلمانم بجان تو

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا	کیا جو شخص کہ مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور
لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (۶ : ۱۲۲)	اس کو نور عطا کیا کہ اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے

خبردار! یہ حال تو مومن کا ہے کہ خدا کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔ اسی کے نور سے فی الدنیا والآخرہ انسانوں میں چلتا پھرتا ہے، حیات ابدی کا حامل ہو جاتا ہے۔ گو ایسے شخص کی بشریت مفقود نہیں ہوتی لیکن صفاتِ الٰہی سے متصف[1] ہو جاتی ہے۔ بمصداق ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مرسلین کا حال اس سے وراء ہے جس کے بیان کا کسی کو یارا نہیں۔ سوائے اس کے کہ حسبِ استعداد کلام الٰہی سے کچھ ذکر کیا جائے۔ اور خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت صرف نور کہنا بے ادبی ہے۔ کیونکہ اس عزیز الحکیم نے اپنے بندے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پانچ صفات واہبیہ سے خاص فرمایا ہے:

یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے نبی! یقیناً ہم نے بھیجا ہے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ	دینے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا طرف اللہ کی
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ وَبَشِّرِ	ساتھ اس کے حکم کے اور چراغ روشن اور خوشخبری
الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا	دے ایمان والوں کو کہ واسطے ان کے ہے اللہ کی
كَبِیْرًا ۝ (۳۳: ۴۵-۴۷- پ۲۲- ر۳)	طرف سے فضل بڑا۔

یہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ اس خالق کائنات نے بلا محنت و مشقت بلکہ بلا طلب اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان صفات حسنہ سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے۔ دوسرے صفات

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ دفتر سوم مکتوب ۵۳ میں تحریر فرماتے ہیں: "فنا کے یہ معنی نہیں کہ وجود زائل ہو جائے اور نہ ہی بقا کے یہ معنی ہیں کہ ممکن سے امکان بالکل زائل ہو جائے اور اس کو وجوب حاصل ہو جائے۔ کیونکہ یہ محال عقلی ہے اور اس کے قائل ہونے سے کفر لازم آتا ہے۔ بلکہ اس کے معنی امکانیت کے باقی رہنے کے باوجود مخلع و ملبس کے ہیں۔ یعنی صفات بشریت سے نکلنا اور صفات الٰہی سے موصوف ہونا ہے"

کے علاوہ سِرَاجًا مُّنِیْرًا کا مفاد مومنین کے لیے بشارت و رحمت تاکید مزید کے ساتھ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا پر رکھا ہے۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ جس طرح شمس کو رہنما بنایا ہے اور سایہ کے بڑھنے اور سکڑنے کو جو سوائے کسی چیز کے بذاتہ کوئی وجود نہیں رکھتا" اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روحانیت کا رہنما بنایا ہے۔ سِرَاجًا مُّنِیْرًا جو لغت کے لحاظ سے اسم فاعل ہے۔ تو موافق ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَللّٰهُ مُعْطِیْ وَاَنَا قَاسِمٌ کے سِرَاجًا مُّنِیْرًا کے معنی منور کر دینے والے ہیں۔ تو نص قطعی سے ثابت ہو گیا کہ بحکم خدا آپ مومنین کے ضمیر کو منور کر دینے والے ہیں۔ اور اس فاعل حقیقی نے اپنے فعل کے اجرا کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ضمیر میں جاری کر دیا ہے۔ یا صحیح معنوں میں فاعل کی رو سے مختار کر دیا ہے۔ اس کے خلاف خیال کرنا سراسر انکار کلام اللہ اور مشیت ایزد متعال پر اعتراض ہے جو سراپا کفر پر مبنی ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا۔

نتیجہ اس عبارت سے یہ ہوا کہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں مفسرین کے بہت اقوال ہیں۔ جن میں فرع کے لحاظ سے اختلاف ہے اور اس میں بہت طول ہے۔ جو اس جگہ مقصود نہیں ہے۔ اور صفحہ ۴۴ پر پہلے بیان ہو چکا ہے۔ مختصر طور پر صرف اتنا کافی ہے کہ مطابق قرآن شریف تمام خیر و برکت، ثواب و رحمت، توفیق و طاقت، نور و ہدایت مِنَ اللّٰہ ہی ہے۔ اور اس کی سبیل و صراطِ مستقیم، ہادی و رہنما اپنی سنت کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنایا ہے اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا کا خطاب عنایت فرمایا ہے، یعنی منور کرنے والا جس طرح وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کے ضمن میں یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ کو اپنی نسبت سے منسوب

کیا ہے۔ لیکن صراط المستقیم اور صحت حال کی رُو سے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ پر انحصار رکھا ہے، اسی طرح نور و ہدایت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے لیکن طریقت کے لحاظ سے سراجاً منیرا کو رہنما فرمایا ہے۔ اور یہ سلسلہ سینہ بسینہ جاری ہے اور تاقیامت جاری و ساری رہیگا۔ جس کے لیے قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ کا فرمان روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ بجلی کا منبع پانی یا کوئی اور چیز ہے جس کے اخذ کرنے کے لیے انجن تیار کیا گیا ہے۔ اور اس انجن سے تار کے ذریعے دور دراز مقام تک بجلی کے چھوٹے بڑے انڈے سے روشنی کرتے ہیں کئی کارخانے مشینوں کے ذریعے کاروبار کرتے ہیں۔ اگر منبع سے بجلی کی آمد بند ہو جائے تو ان اوزار و ظروف سے کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ سب مانند مُردہ بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے لیکن جب برقی رَو درست ہوئی اور بجلی کی آمد جس کو امر الٰہی اور فاعل حقیقی کے تصرف سے تشبیہ دینا بجا و درست ہوگا، بدستور جاری ہوئی تو سب انڈے روشن اور کاروبار کی مشینیں فاعل ہوں گی۔ اس مثال سے یہ مفاد حاصل کرنا چاہیے کہ منبع بجلی نور ذات باری تعالیٰ ہے، اور کارخانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور تار اور انڈے اولیائے کرام اور مومن ہیں۔ اگر انڈے میں نقص واقعہ ہو جائے تو باوجود بجلی کی طاقت جاری ہونے کے روشن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر انڈا صحیح سالم تار اور آئینہ سمیت درست ہو، اور اس کو کھینچ کر برقی رَو سے علیحدہ کر دیا جائے تو خواہ راستہ بجلی بدستور کھُلا رہے تاہم طاقت بجلی خرچ یا ضائع نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ طاقت بجلی بغیر درستی انڈے کے اور انڈا بغیر بجلی کی طاقت کے کار آمد نہیں ہو سکتے۔ اور تاریں اور انڈے سب کے سب کارخانے کے محتاج ہیں۔ اور کارخانہ

یا انجن بغیر منبع بجلی کے کچھ تصرف نہیں رکھتا۔ چھوٹے سے بڑا اور بڑے سے چھوٹا ہر ایک انڈا حسب استعداد روشن ہر زمانہ میں معروف ہے۔

یاد رہے کہ جس طرح یہ سلسلۂ طریقت صراط المستقیم پر جاری ہے اسی طرح اس کے برخلاف سلسلہ بھی جاری ہے۔ اور ان ہر دو نسبتوں کا جہان میں شور برپا ہے۔ ایک مطابق قَصْدُ السَّبِيْل خدا تک پہنچتا ہے اور دُوسرا مِنْهَا جَآئِر کے موافق عزازیل تک رہ جاتا ہے۔ بمصداق ؎

ہرگز بکعبہ نہ رسی اے اعرابی! آن راہ کہ تو می روی بترکستان است

لیکن با ایں ہمہ اس گروہ کا تصرف میدان دنیا میں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کرامت کی جگہ استدراج کی وجہ پر دنیا والوں کے کاموں میں حیرت انگیز تصرف رکھتا ہے۔

غور طلب امر تو یہ ہے کہ یہ اپنے حال میں خوش كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ کے موافق فرحاں و شاداں بلکہ دوسرے فرقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی ترک دنیا کے مقابلہ میں ان کو دنیادار خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو حال کی رو سے اچھا خیال کرتے ہیں تو اس کو بھی اسفل منزل کا مقیم سمجھتے ہیں۔ اپنے حال کو سب سے اعلیٰ اور ارفع جانتے ہیں۔ غرضیکہ اپنی نسبت کے پورے شکار ہوتے ہیں۔ مطابق اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ دوسرے کے حال کو دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے حال کے دیوانے، سرور کے متوالے، اپنی دھن میں جانے والے۔ لیکن یہ سب یکساں نہیں ہوتے۔ بعض ان میں سے شریعت غرا یعنی صوم و صلوٰۃ کے پابند، سنت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بے شنا... مت و رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے

ہیں۔ ان کے حال میں کچھ تامّل ہے۔ لیکن نسبت سے ان کو بھی کچھ حصہ نہیں ہے اس لیے خطرہ ہی ہے۔ کیونکہ خواہ شریعت اور سنت پر عامل ہو تاہم نسبت خلاف نبوت خطرہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور وہ اس لیے کہ اُس گروہ سے جو محض خشک توحید کے پردے اور نور رسالت سے سرتاپا محروم ہیں، اس گروہ کی موافقت پائی گئی ہے۔

قصہ مختصر، رُوئے خطاب تو خصوصاً اس گروہ کی طرف ہے جن کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف انکار ہے۔ صرف اعراض ہی نہیں بلکہ اعتراض تک ان کے کلام سے ظاہر ہوچکا ہے۔ اور ابلیس علیہ اللعنۃ سے مطابقت ثابت ہے۔ بلکہ اس کے حق میں تعریف اور نعت کو کلام و اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کہتا ہے:

تیری نہ مانی اے حضرت شیطان عجیب، جو قدم بوسی کرے صورت انسان عجیب
تو نے نہ مانا مگر تم کو خدا مان گیا! پھر تیرا ہی ذکر کرے ناطق قرآن عجیب
نسل آدم پہ اسے خوف تیرا طاری ہے پھر جاری ہر ایک جگہ تیرا ہی فرمان عجیب
جس نے دیکھا ہے تمہیں اس نے خدا دیکھ لیا پر تیری کچھ ایسی انوکھی سی ہے پہچان عجیب

صوفی بیچارے کو بھی تیری چاہ نے مارا
ورنہ یہ بھی تھا کسی ملک کا سلطان عجیب

الامان۔ یہ گروہ اس نسبت سے پورا حصہ لینے والا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ میدانِ قیامت میں اُن کے راز کی قلعی کھل جائے گی۔ حقیقت کا انکشاف ان کے لیے روز روشن کا حکم رکھے گا۔ تب اپنے ظلم اور تعدی کی داد دیتے ہوئے کفِ حسرت مل کر کہیں گے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ
يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ
سَبِيلًا ۝ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ
فُلَانًا خَلِيلًا ۝ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ
الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ
الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا ۝
(۲۵: ۲۷-۲۹- پ۱۹ -رکوع ۱)

اور جس دن ظالم کاٹ کاٹ کھائے گا اپنے دونوں ہاتھ اپنے، کہے گا اے کاش کہ پکڑتا میں ساتھ رسول کے راستہ۔ اے وائے ہے مجھ کو کاش کہ نہ پکڑتا میں فلانے کو دوست۔ البتہ بیشک گمراہ کیا اس نے مجھ کو ذکر سے پیچھے اس کے کہ آیا میرے پاس، اور ہے شیطان آدمی کو ہلاکت میں ڈالنے والا۔

ھیہات، اس وقت اس تعلق و رفاقت، خُلّت و محبت اور نسبت و مناسبت کا علم ہو جائیگا لیکن بے سود۔ ہر ایک زمرہ اپنے پیشوا کے پیچھے مطابق حال و نسبت کچھ دوزخ کی طرف اور کچھ جنت کی طرف ہنکایا جائے گا۔ لیکن متبع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ تمام انبیاء و مرسلین **لوائے محمد** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ میں عین مقصود اور حصول کو پانے والے مشکور و ممنون ہوں گے اور **نسبت محمد** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرتاپا مستغرق و محظوظ ہو جائیں گے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

فریب نفس اور شیطانی دھوکے

خواصِ بشریہ

جاننا چاہیے کہ اس خالق کائنات نے انسان کی فطرت کو از حد متأثر بنایا ہے اور یہی اس کی ہر قسم کی ترقی کا باعث ہے۔ خواہ ناری طبقات سے ہو یا نوری، پاکی ہو یا پلیدی، نیکی ہو یا برائی، خیر ہو یا شر، نفع ہو یا نقصان، ہر ایک فعل سے متأثر، ہر ایک نسبت سے مناسبت اختیار کر جانے والا اور اَلْعَادَۃُ طَبِیْعَۃُ الثَّانِیَۃ کے مصداق ہر رنگ میں رنگ جانے والا ہوتا ہے۔ جہان میں اس کی بے شمار مثالیں موجود اور مشہود ہیں۔

مثلاً کوئی شخص پہلی دفعہ ایک رتی بھر افیون کھالے تو اس کو کافی نشہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ بوجہ خون غلیظ ہونے کے زیادہ مقدار میں کھانے کے سوا چونکہ بیوست اور حدت خون میں ناکافی تحریک ہوتی ہے اس لیے مقدار بڑھتی جاتی ہے اور تولہ دو تولہ تک کھانے سے ایک رتی مقدار کے برابر نشہ ہوتا ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بجائے افیون کے سنکھیا کھا جاتے ہیں۔ بعض کی حالت اس درجہ تک ہو جاتی ہے کہ ایک زہریلا سانپ رکھا ہوتا ہے۔ افیون، سنکھیا نہ ملنے کی صورت میں زبان پر سانپ ڈسا لیتے ہیں، تب ان کا وقت گزرتا ہے۔ دوسرے کے لیے ان سمیات کا استعمال موجب ہلاکت ہے اور اس کے واسطے صرف نشہ تو در کنار سوائے ان سمیات کے چلنا پھرنا بھی دشوار اور

بالکل ترک میں بلاشبہ موت کا شکار۔ ایک کے لیے زہر قاتل ہے اور دوسرے کے لیے تریاق۔ دراصل دونوں کے لیے زہر قاتل ہی تھا لیکن عادت ہو جانے کی وجہ سے اور ضمیر کی فنا اور زہر سے بقا حاصل کرنے سے وجود میں سم کا ایک وجود پیدا ہو گیا ہے جو غذا کی مانند طاقت کا سبب بن گیا۔ اسی طرح ہر عمل اور ہر نسبت سے مناسبت مطابق فرمان مولیٰ کریم

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (پ۲۷۔ ع۲) ہر آدمی بیچ اس چیز کے کہ کمایا ہے گرفتار ہے۔

کے قیدی اور مجبور ہو جاتا ہے۔

شیریں آب کی مچھلی تلخ آب میں مر جاتی ہے اور تلخ آب کی مچھلی آب شیریں میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ گرم ملک کے باشندے خطہ سرد کو بلائے جان سمجھتے ہیں اور سرد ملک کے باشندے گرم ملک کو عذاب جان جانتے ہیں۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (پ۱۸۔ ع۳) ہر ایک گروہ ساتھ اس چیز کے کہ پاس اُن کے ہے خوش ہیں

کے موافق ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے۔

اسی طرح ہر اثر سے تعلق اور ہر تعلق سے متأثر ہونا لازم ہے۔ پیدائش ہی سے جبکہ میدان علم بھی اس کے لیے تنگ تھا، تاثرات سے متأثر ہونا جاری ہی رہا اور ہر قسم کا اثر نیک ہو یا بد، اسلام ہو یا کفر، اس کی فطرت پر صفاتی نقش و نگار سے ایسی گل کاری کرتا ہے کہ نقش بر سنگ ہو جاتا ہے جس کا مٹانا اور اس جگہ دوسرا نقش جمانا دشوار بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہندو بچہ رام رام کرتا ہوا پرسن ہو جاتا ہے لیکن اللہ اللہ کرنا اس کے لیے کفر ہے۔ اسی طرح مسلمان اسمائے الٰہیہ سے مطمئن ہوتا ہے لیکن رام رام کرنا اس کے لیے

بلائے جان ہے۔ غرض ہر قسم کے اثرات سے جوارح کے راستے حوضِ دل کا (جو بے رنگ پانی کی طرح ہے) رنگین ہونا لازم ہے۔ اور تاثرات گو خارجی ہوتے ہیں لیکن جب عادت کرتے کرتے طبیعت ثانیہ کی حد تک پہنچ جائیں تو ذاتی کا حکم رکھتے ہیں۔ تب وہ شخص اپنی ضمیر کا بندہ اور اپنی خواہشات کا شیدا ہو جاتا ہے۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰىهُ کا حکم اس کے لیے درست ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کو صرف بُرائی ہی کی طرف حصر کرنا سراسر خطا ہے۔ کیونکہ یہ اصطلاحات دینیہ ہیں

شیطانی فریب

سے نامزد ہے اور یہ بالکل درست و بجا ہے۔ کیوں کہ دنیا و مافیہا کی طرف ہر نفس (جس کو اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ فرمایا ہے) کا رجوع بلا دعوت ہے۔ اس میں شیطانی تصرف رغبت کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ سود کا قاعدہ اور نفع کا شجر ہے، حرص کا میدان اور رذیل حظ کا سامان ہے۔ البتہ نیکی کی طرف شیطانی تصرف بڑی محنت سے ہے۔ یعنی نیکی میں دھوکا دینا ہے۔ وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا میں ان کے اعمال کو مزین مطابق زُیِّنَ لَھُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِھِمْ کرنا ہوتا ہے۔ جہان میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور تصرف معروف۔

عوام و خواص کے نزدیک دنیا و مافیہا کو ترک کرنا اور روحانیت کے میدان میں قدم رکھنا اعلیٰ مقصود ہے۔ لیکن اس کا علم اور عمل نہایت مشکل ہے اور تمیز نہایت دشوار۔

ایک گروہ کے نزدیک علم امر و نواہی اور قوانین اسلام (جو محض نظام کی درستی اور ضروریات نفس کے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کو جاننا ہے) اور اس پر کاربند ہونا اصل

مقصود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ بیحد ضروری ہے۔ نفس کی تادیب اور اصلاح کے لیے سامان، رُجوع الی کی سبیل اور مہذب بننے کا شیوہ ہے، آخرت کے لیے سرمایہ، گناہوں کی مغفرت کا سبب، کامیابی کا راستہ، مولیٰ کریم کی خوشنودی کا ذریعہ، یوم حشر میں آرام حاصل کرنے کا طریقہ اور حصولِ نعمات کے لیے نیک مجاہدہ ہے۔ لیکن ہدایت یعنی ذات باری تعالیٰ کے مشاہدہ و لقا اور قُرب خداوندی کے مقام کی علت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ محض فضل ایزدی ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	بیشک جو لوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل
یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ	کیے، ہدایت دے گا ان کو اللہ بسبب ایمان
(۱۰-۹- پ۱۱- ر۶)	ان کے کے۔

ہیہات! آج کل تو معاملہ اُلٹ ہو رہا ہے۔ عمل صالح تو درکنار، علم کے حصول میں نیت ہی درست نہیں ہوتی۔ عالم اور مناظر و مباحث بننے، فخر اور تکبر کی دستار باندھنے، حصول دنیا کا ذریعہ بنانے کے لیے عمر ضائع کر بیٹھتے ہیں اور فقط اسی یافت و یاب کو معراج کمال سمجھ لیتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ صرف اسی پر ہی بس نہیں ہے۔ اولیاء اللہ اور انبیائے کرام کے علم کو بھی اسی پر حصر کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ان سے زیادہ اکمل جانتے ہیں اور اپنے زعمی مراتب کی وجہ سے جہالت کے دریا میں ایسے مستغرق ہوئے ہیں کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ سے سر نکالنا ناممکن ہو گیا ہے۔ الامان!

یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ عَلٰی شَیْءٍ ط اَلَآ	گمان کرتے ہیں یہ کہ وہ اوپر کسی چیز کے ہیں۔

اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ اِسْتَحْوَذَ	خبردار ہو تحقیق وہی ہیں جھوٹے۔ غالب آیا ہے
عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ	اوپر ان کے شیطان پس بھلادی ان کو یاد خدا کی
اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ	یہ لوگ گروہ شیطان کے ہیں۔ خبردار ہو، بیشک
حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝	گروہ شیطان کے وہی ہیں زیان پانے
(۵۸:۱۸-۱۹۔ پ۲۸۔ ع۳)	والے۔

دوسرے گروہ نے اس رازِ مخفی کو جو نیت کے پردہ میں اوجھل ہو رہا تھا، وہ مقصد جس کے لیے کسی بہانہ یا اوٹ کی ضرورت تھی، اس کو بالکل فاش کر دیا ہے۔ قرآن شریف کی آیات مبارکہ کو اپنے حرص و ہوا کے ڈھانچے میں ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں۔ مناسبت رکھنے والے طبقۂ جہلا نے ان کے ساتھ موافقت کی ہے۔ امارت کے شیدا، الدنیا ملعونٌ وما فیہا ملعون کے طالب،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	رہے، ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠	ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى	کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار کرے گا
اَمْنًا ؕ (۲۴:۵۵۔ پ۱۸۔ رکوع ۱۳)	اور خوف کے بعد ان کو امن دے گا۔

کے مستحق اور عامل بننے کے لیے لباس سپاہیانہ کو کافی سمجھ لیا ہے۔ اور ان ہستیوں اور اعمال

صالح کرنے والوں کی نسبت یہ وعدا للہ ہوا ہے، عملی حیثیت سے ان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے سرے ہی سے اعراض کیا ہوا ہے۔ نہ خلافت کے معانی سے واقف ہوئے ہیں اور نہ ہی وعدہ کے مستحق ہونے کی طرف رجوع کیا ہے۔ اصل کے خلاف فرع کے فریفتوں نے آخرت سے دنیا کو مقدم رکھا ہے۔ شاید انھوں نے کلام پاک میں

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ	پس اب جس نے سرکشی کی اور اختیار کیا زندگانی دنیا
فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ؕ (۷۹:۳۷-۳۹)	کو پس بیشک دوزخ ہے ٹھکانا اس کا۔

کو نہیں پڑھا ہے۔ استغفر اللہ من شرور انفسھم۔

تیسرا گروہ، بلا درد محبت کہلانے والے ہیں۔ نہ شریعت سے کچھ واسطہ، نہ طریقت سے سروکار، حقیقت کا تو ذکر ہی کیا۔ تمام جہان کے مذاہب سے نرالے، اپنی ضمیر کے متوالے، معانی سے بے خبر، مطلق جہالت کے گرفتار، امر و نواہی سے بیزار۔

چوتھا گروہ، جو اسی گروہ کی مانند ہے، لیکن ایک فرق ضرور ہے کہ وہ اپنے کردار میں کاذب نہیں۔ دنیا سے بے تعلقی ہے اور طالب مولیٰ ہیں۔ مجاہد بھی ہیں، زاہد بھی ہیں، تارک بھی ہیں اور حال بھی رکھتے ہیں۔ ایسی ہستیوں کے لیے کچھ توقف ہے۔

حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ "قیامت کو ہر ایک گروہ کو اس کے نام سے پکاریں گے یعنی اس کی صفت سے ندا کریں گے۔ کہ اے امتِ موسیٰ! اے امتِ عیسیٰ، اے امتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم، اے محبانِ خدا۔"

یہ جو کچھ ارشاد مبارک ہے، بالکل بجا و درست ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ان صاحبان

کے لیے ہے جنہوں نے شریعتِ غرا کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے اور مقصود کو حاصل کیا ہے۔

بمصداق ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے چہ داند جام و سندان باختن

میرا مذہب اس کتاب میں محض "انسان فی القرآن" ہے اس لیے اس کی تفصیل کی میرا مسلک مجھے اجازت نہیں دیتا۔ سوائے اس کے کہ بندگانِ خدا نے ریاکاری سے نفور اور اخلاص کے میدان میں قدم جمانے کے لیے ملامت کو اختیار کیا ہے لیکن ملامت کا وہی معیار صحیح ہو سکتا ہے جو شریعتِ غرا کے خلاف نہ ہو۔ یہ لوگ اخلاص کے پودے، محبت کے پھول اور اعلیٰ مقصود کو پانے والے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے اعراض کیے ہوئے، لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ہوتے ہیں۔

لیکن آج کل تو صرف شریعت کی پابندی اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل ہی اعلیٰ درجہ کی ملامت ہے۔ مخلصوں کے لیے یہ وقت نایاب اور قیمتی ہے۔ کیوں کہ آج کل معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ عوام شریعت کے خلاف چلنے والوں کو ولی سمجھتے ہیں، اور پابندِ شریعت کو حقیر خیال کرتے ہیں۔ اور فرمانِ ایزدی ہے:

مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ	اور جو کوئی چاہے سوائے اسلام کے دین پس
یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ	ہرگز نہ قبول کیا جائے گا اس سے اور وہ بیچ
الْخٰسِرِیْنَ ۝ (۳: ۸۵۔ پ۳۔ ۱۷)	آخرت کے خسارہ پانے والوں میں سے ہے

میرے حضرت قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ "یکے فقرِ رحمانی و یکے شیطانی" سبحان اللہ! کیا ہی لطیف اور پر حقیقت ارشاد مبارک ہے۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ پر ایک نورِ عظیم متجلّیٰ ہوا اور اس میں سے ندا آئی کہ "اے عبدالقادر! ہم نے تجھے نماز و مجاہدہ وغیرہ معاف کیا۔ اب تیرے لیے کسی محنت و ریاضت کی ضرورت نہیں رہی۔ تو ہمارا مقبول ہو گیا ہے" جناب کو معاً خیال آیا کہیں میرا معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ گیا ہے؟ تو استغفار پڑھی۔ وہ تجلی اور روشنی دھوئیں کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور آواز آئی کہ "تو بڑا مرد ہے کہ بچ گیا۔ ورنہ میں نے اس مقام پر لاتعداد انسانوں کو گمراہ کیا ہے" آپ نے لاحول پڑھی اور ایک پتھر اٹھا کر اس دھوئیں کی طرف پھینکا۔ ایک چیخ کے ساتھ یہ آواز آئی کہ "یہ میرا آخری داؤ تھا۔ مگر اس میں بھی میں ناکام رہا" اور دھواں گم ہو گیا۔

اگر حضرت اس وقت شانِ جلال و جمال میں تمیز نہ فرماتے اور اس کا کہا مان لیتے تو ملحد ہو جاتے۔ لیکن بڑے ہوشیار تھے، بچ گئے۔ شرع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ علم راہ نما ہو گیا۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کا واقعہ ہے کہ حسبِ مدارج جب حال کھلنے پر آئے تو شیطانی تصرف غالب ہوا۔ کئی نوع پر خوابیں آنے لگیں۔ تو تکبر اور رعونت کی راہ سے عوام کے سامنے بیان کرنی شروع کر دیں کہ "مجھے رات کو فرشتے لے جاتے ہیں، جنت اور دوزخ کی سیر کراتے ہیں، حور و غلمان میری خدمت کرتے ہیں۔ میں نے اپنے عالی مقام کو کئی دفعہ دیکھا ہے۔ آج مجھے تخت پر بٹھا کر عرش معلیٰ تک کی سیر کرائی" وغیرہ وغیرہ

جب حضرت جنیدؒ نے سنا تو تشریف لے گئے اور پوچھا "اے عزیز! تو کیا دیکھتا ہے"؟ اس نے حسب دستور بیان کیا۔ آپ نے فرمایا "اب کے جب ملائکہ تمہیں لے جائیں تو لاحول پڑھنا"۔ اس نے کچھ اعراض کیا کہ میرے حال کو آپ نے شیطانی خیال کیا ہے۔ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور فرمایا "مَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ"۔ جب رات کو وہی معاملہ پیش آیا تو پہلے سے بڑھ چڑھ کر حالات منکشف ہوئے۔ ایک نہایت خوشنما تخت ملائکہ اُٹھائے ہوئے (جس کے گرد حوریں نغمہ سرا تھیں) آئے اور اس پر بٹھا کر لے گئے۔ تب اسے وہی خیال جو دن میں انکار اور اعراض کی صورت میں پیدا ہوا تھا، ظاہر ہوا۔ لیکن معاً یہ خیال بھی آگیا کہ لاحول پڑھنے میں کیا ہرج ہے۔ اور آپ کا فرمان بھی ہے۔ تو پڑھا لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔ پڑھتے ہی وہ سب سامان جاتا رہا اور اپنے آپ کو مزبلے میں گرا پڑا دیکھا۔ تب حضرت کی خدمت میں زار و زار روتا ہوا حاضر ہوا اور توبہ کی۔

حالات و کیفیات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وضاحت کے لیے یہ دو واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ ورنہ قرآن مجید کے ہوتے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ مولیٰ کریم ذوالجلال والاکرام نے

صراط المستقیم

کو واضح کرنے کے لیے، مشعل ہدایت کو روشنی بخشنے کے لیے اور نفسانی شر اور شیطانی تصرف سے بچنے کے لیے کیا ہی بین دلیل سے مطلع فرمایا ہے۔

بھائی! صراط المستقیم کے دو رُخ ہیں۔ ایک بندے کو اس ہادی و نصیر کی طرف،

اور دوسرا مولیٰ کریم کا اپنے بندے کی طرف۔ سو بندے کو خداوند کریم کی طرف سوائے مجاہدہ کے جو اسی کی توفیق سے ہے چارہ نہیں ہے۔ اور اس رب العلمین کا راستہ بندے کی طرف اس کی رضا اور خوشنودی کے باعث ہدایت اور رحمت ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجْعَلُ اللّٰہُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا ؕ (۶: ۱۲۶-۱۲۷- پ- ۲د)

ترجمہ: جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اسی طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔ اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔

پس ہر ایک انسان کو اس ترازو سے اپنی حالت کو جانچ لینا اور معلوم کر لینا چاہیے کہ اگر اسلام کے لیے میرا سینہ کشادہ ہے اور عمل میرے لیے آسان ہو رہے ہیں، اور ذوق و شوق میرے لیے رُوحانی غذا بن رہا ہے، تو ضرور میرے واسطے خداوند کریم کا نیک ارادہ ہے اور ہدایت کی اُمید ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ اور اگر نعوذ باللہ من ذٰلک طبیعت کا رخ دوسری طرف دیکھے تو استغفار مانگے اور توبہ کرے۔ کیونکہ یہ ایسی گمراہی ہے جس کے لیے راستہ ہی نہیں، اور ایسا اندھیرا ہے جس کے واسطے کوئی چراغ ہی نہیں، ایسی غرقابی ہے جس کے لیے سہارا ہی نہیں، اور ایسا طوفان ہے جس کے لیے کوئی کنارا ہی نہیں۔ مطابق ارشاد

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ جس کو خدا گمراہ کرے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں۔

خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے انسان کو اشرف المخلوقات اور اپنی محبت کا امین بنایا ہے اور اس کی پیدائش اپنی سرشت یعنی صفت پر۔ انسان کے ضمیر میں جو عادت کیا جانے کی صفت ہے یہی تنزل و عروج کا سرمایہ اور سبیل الرشد کا سامان ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا حامل ہونا ممکن نہ تھا۔ ہر فرد و بشر حصول اور دریاب ہی سے آزمایا جاتا ہے، جیسے اندھے کے لیے جو بینائی ہی نہیں رکھتا، حلال و حرام نظر سے اس کو کیا حصہ ؟ نامرد کے لیے عورت بلا نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ھٰذا القیاس انسان میں دونوں جہان سے نشان ہیں۔ کفر و ایمان، انکار و اسلام، خُلق نیک و بد، ظلم و رحم، وفا و جفا، محبت و عداوت و مثلہم۔ ان سب کا حامل ہے یہی اس کی آزمائش کے اسباب ہیں اور من اللہ ان سے بخوبی واقف ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱-۸) پھر اس کو سمجھ دی بُرائی اور بھلائی کی۔

تاکہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا کے علم سے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے میدان میں قدم بڑھائے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا کی حقیقت اس پر ظاہر ہو جائے۔

اے بھائی! جب حضرت آدم علیہ السلام کو اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً کے ارادہ سے شرف و بزرگی کی خلعت پہنائی گئی تو ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوا۔ ابلیس نے عداوت اور تکبر کی راہ سے انکار کر دیا۔ حکم خداوندی سے سرکشی کی، لعنت کا طوق اس کے گلے میں اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ پہنا دیا گیا۔ عجز و انکساری اور قصور کا اعتراف تو درکنار نامطابقت کی وجہ پر

مردانہ وار کمر ہمت کو مضبوط کیا اور میعاد اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ کا سوال کیا۔ اس عزیز الجبار نے قادریت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے غضب و غیرت کی رُو سے مہلت دیدی۔ قرآن کریم میں یہ کئی وجہ پر ذکر ہے جس کا بیان اس جگہ موزون نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ یہ ابتدا ہی سے دو گروہ بن گئے۔ ایک نوری اور ایک ناری، ایک صلحا اور دوسرے اشقیا، ایک فرماں بردار اور دوسرا نافرمان، ایک تابعدار دوسرا سرکش، ایک صاحب رحمت دوسرا صاحب لعنت، ایک مقرب دوسرا محجوب، ایک مقبول دوسرا مردود، ایک نسبت نعمت سے مسرور دوسرا نسبت غضبی سے مقہور، دونوں میں سرکاری ظہور۔ ایک نیکی میں مستغرق، دوسرا بدی میں سرتاپا غرق۔ ایک پر نزولِ رحمت و صلوٰۃ، دوسرے پر نزول شیاطین۔ جیسا کہ مومنوں کے لیے فرمان مولیٰ کریم صادر ہو رہا ہے :

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۳۳: ۴۳- پ۲۲- ر ۳)

وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے اوپر تمہارے اور فرشتے اس کے تاکہ نکالے تم کو اندھیروں سے طرف نور کے۔

اور جو نسبت غضبی سے مقہور ہے دوسری جگہ اس کے حق میں ارشاد مولیٰ کریم دیکھیے :

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۲۶: ۲۲۱-۲۲۲- پ۱۹- رکوع ۱۵)

کیا تم کو میں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترتے ہیں؛ وہ نازل ہوتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے گنہ گار پر۔

اَفَّاك کے معنی لغت میں پھرے ہوئے کے ہیں یعنی حق سے، یا فرماں برداری سے

خواہ عملی صورت میں یا انکار کی رُو سے۔ لَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ آپ ہی اپنے پر ظلم کر لیتے ہیں۔

پُھر پھر کے قدم رکھتے ہیں دائرے کے اندر" ایک کا مرجع خدا و رسول، دوسرے کا مرجع شیطان و قبیلہٗ، ایک کی ولایت یعنی دوستی اطاعت، مطابقت، مناسبت اور محبت کے راستہ بتوسل رحمۃ للعالمین سید المرسلین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مولیٰ کریم کے ساتھ اور مولیٰ کریم کی ان پاکباز بندوں کے ساتھ، اور دوسرے کی انکار اور سرکشی کے راستہ بتوسل طاغوت ابلیس مردود کے ساتھ منصرف۔ ہر دو فریق کے تصرف جاری ہیں اور جاری و ساری رہیں گے۔ بلکہ تصرف کے لحاظ سے دوسرا گروہ زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ نفس کا رجوع اکثر (اَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ) بُرائی کی طرف ہے جو سراسر گمراہی ہے۔ اور شریعت غرا کے سب احکام نفس کے خلاف ہیں تاکہ آزمائش ہو سکے۔

گو تصرّفِ حق کے سامنے تصرّفِ نفس و شیطان کچھ حقیقت نہیں رکھتے" چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" لیکن یہ جب معلوم ہو کہ نفس زکیٰ حاصل کرے، عالمِ قُدس کا پرتو اس کو منوّر کرے، چشم دل نورِ معرفت سے روشن ہو، شیطان اس کی حس سے بھاگے۔ اور اس کی مثال روشنی اور اندھیرے کی سی ہے۔ نجاست و طہارت کا سا حال ہے، بلندی و پستی کا سا معاملہ ہے، ہدایت و ضلالت کا رنگ ہے۔ روشنی، طہارت، بلندی، ہدایت، ان سب میں انسان مکلف ہے اور ذوالجلال والاکرام کے فضل کا محتاج ہے۔ لیکن اندھیرا، نجاست، پستی اور ضلالت کے لیے مکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب خود بخود موجود ہے۔ صرف پہلی صفات حسنہ سے

نخا فل ہی کافی ہے۔ مطابق فرمان ایزدی اُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ان کو بھی متمتع کرتے رہیں گے، اور

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ	ہم اسے ادھر ہی پھیریں گے جدھر وہ خود پھرے گا اور
مَصِيْرًا ﴿۴: ۱۱۵۔ پ۵۔ ر۱۴﴾	اسے جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بہت بری جگہ ہے پھر جانے کی

کی پر زور تدبیر کی سنت سے فائدہ حاصل کرتے رہیں گے۔ مگر افسوس! اس دن یعنی قیامت کے روز یہ قلعی کھل جائے گی۔ تب حسرت اور یاس کی بصیرت سے اپنے اعمال کا ملاحظہ کرتے ہوئے افسوس سے اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ	اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا ظالم اوپر دونوں
يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا	ہاتھوں اپنے کے کہے گا اے کاش کہ پکڑتا میں ساتھ
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا	رسول کے راہ۔ ہائے افسوس ہے مجھ کو کاش کہ نہ
﴿۲۵: ۲۷-۲۸۔ پ۱۹۔ ر۱﴾	پکڑتا میں فلانے کو دوست۔

اسی حجت کے ختم کرنے کے لیے، مشعل ہدایت کو روشن کرنے کے لیے، صراط المستقیم کو واضح اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے واسطے خاتم النبیینؐ

سیّد المرسلینؐ

رحمۃ للعالمین، فخر الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور فرمایا۔ لیکن خدا اور اہل کتاب کی آنکھیں جو مدّت سے آخر زمان پیغمبر کی بعثت کی منتظر تھیں جب ایک دُرِّ یتیم اور ایک اُمّی پر پڑیں تو تاج رسالت جو آفتاب سے زیادہ روشن، کل انبیاء و مرسلین کی عزّت اور تصدیق

کے ساتھ رحمۃٌ للعالمین کے سر پر فخر و ناز لیے کھڑا تھا، اس سے شناسا نہ ہو سکیں مطابق فرمانِ ایزدی:

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ	کیا انھوں نے پہچانا نہیں اپنے رسول کو کہ وہ
مُنْكِرُوْنَ ○ (۲۳:۶۹ - پ۱۸ - ع۴)	اس سے منکر اور ناشناسا ہو رہے ہیں؟

تعجّب کی رُو سے اور دُوسرے بظاہر وجہ پر، کیا نہیں پہچانا انھوں نے اپنے رسول کو امانت، سچائی، تحمّل، وفا، کرم، مروّت، خوش خوئی اور کمال علم کے ساتھ، باوصف اس کے کہ انہوں نے علم حاصل نہیں کیا۔ تو وہ کافر اس رسول کے منکر اور نہ پہچاننے والے ہوں؟ یعنی ایسا نہیں ہے کہ رسول کو پہچانتے ہی نہ ہوں، تاکہ انکار کریں اور کہیں کہ یہ بیگانہ ہے، ہم اس کا حال نہیں جانتے۔ بہ اعتبار کی رُو سے۔ لیکن جب ان کی نظریں صرف ظاہر یعنی

آپؐ کی بشریت

پر رہ گئیں تو ان کو انکار ہی آسان معلوم ہوا اور سیاہی قلب سے لکھی ہوئی کتاب کو اپنے سامعین کے رُوبرو اُسی طرح پیش کیا جس طرح پہلوں نے کہا تھا کہ:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا	کہ یہ تو تمہیں جیسا آدمی ہے، جس قسم کا کھانا تم کھاتے
تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ	ہو اسی طرح کا یہ بھی کھاتا ہے، اور جو پانی وغیرہ تم پیتے
وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ	ہو اسی قسم کا یہ بھی پیتا ہے۔ اور اگر تم نے اپنے جیسے
اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○ (۲۳:۳۳-۳۴ - پ۱۸ ع۲)	آدمی کی اطاعت کی تو اس وقت تم گھاٹے میں پڑ گئے۔

اور جب پیغمبروں نے انہی سرداروں اور قوم کے آسودہ حال لوگوں کو دعوت دی، اور اس حیاتِ ابدی اور بے نہایت نعمت کی طرف بلایا جس کو نہ وہ چاہتے تھے اور نہ ہی اعتقاد رکھتے تھے تو مرسلوں کو یہی جواب دیا:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ	تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ
مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا	ہم تمہیں اپنے جیسا آدمی دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھتے
نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ	ہیں کہ تمہارے پیرو صرف وہی لوگ ہوتے ہیں
اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى	جو رذیل ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و
لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ	تعمق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کچھ فضیلت
كٰذِبِيْنَ ○ (۱۱:۲۷ - پ۱۲ - ع۳)	نہیں دیکھتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

گو انکار کفار کئی وجہ پر تھا، مگر یہاں تو صرف ظاہری اسباب پر ہی نظر تھی اور بطن میں یقین لانا محال، اس لیے خدا کی برگزیدہ ہستیوں سے یہی جواب ملا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى	کہا کہ اے قوم! اگر میں اپنے پروردگار کی طرف
بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً	سے دلیلِ روشن پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے
مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ	پاس سے رحمت بخشی ہو جس کی حقیقت تم سے
اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○	پوشیدہ رکھی گئی ہو، تو کیا ہم اس کو تمہارے
(۱۱:۲۸ - پ۱۲ - ع۳)	گلے باندھ سکتے ہیں حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔

لیکن جب خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ کا وقت آیا اور شجرِ رسالت جڑ سے لے کر آہستہ آہستہ

پتے ٹہنیاں اور پھول نکالتا ہوا بار آور ہوا تو پہلے دین منسوخ ہو گئے اور باطل کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا گیا، آتش کدے سرد ہو گئے، قصر کسریٰ کے کنگرے گر گئے۔ بت پرستوں کے دلوں سے بتوں کی وقعت جاتی رہی۔ زمین و آسمان میں انوار بے نہایت غمام کی صورت میں ہویدا ہوئے، دین ہمیشہ کے لیے کامل کر دیا گیا۔ تب مولیٰ کریم نے حجت ختم کرنے کے لیے کافروں کے جواب میں اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس طرح ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

(کہ میرے حبیبؐ! ان سے) کہہ دو کہ اور کچھ نہیں (یعنی تمہاری ہی عقل و سمجھ کے مطابق) میں ایک تمہارے ہی جیسا آدمی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ معبود تمہارا معبود ایک ہی ہے

(۱۸: ۱۱۰ - پ۱۶ - رکوع ۳)

تاکہ اسی کی عبادت کی جائے۔ تو اس میں کفار کے لیے دو مفاد ظاہر ہوئے۔ ایک تو اگر یہ ایمان لے آئیں گے تو خود بخود جان پہچان لیں گے کہ ہمارے نبی بظاہر بشریت کی رو سے تو مثل ہی ہیں لیکن حقیقت میں مثل نہیں ہیں۔ دوسرا نہ ماننے والوں کے لیے حجت قائم ہو جائے گی۔

باوجود اس امر کے بھی کفار کئی باتیں بناتے تھے۔ مثلاً:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ

اور کہتے کہ پیغمبر پر فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوا؟

جو ان کے ساتھ رہتا۔ جواب میں فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

ہاں اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو کام ہی فیصل ہو جاتا، پھر انھیں مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم ان کے کہنے کے مطابق کسی فرشتے کو بھیجتے تو ضرور تھا کہ اسے مرد کی صورت میں بھیجتے تو جس شبہ میں پڑے ہوئے ہیں پھر اسی اشتباہ ہی میں پڑ جاتے۔

(۶: ۸ - ۹ - پ۷ - ۴)

مگر اس تشبیہ کا سوائے اعتقاد کفار یا جواب کفار کے سارے قرآن مجید میں اول سے آخر تک کہیں (مِثْلُنَا یا مِثْلُكُمْ کا) ذکر تک نہیں۔ اب تعجب تو یہ ہے کہ نام نہاد مسلمان بلکہ علمائے دین متین توحید خالص کی عمارت کی تعمیر کو اوپر سے شروع کرنے لگے ہیں، اور اس کے لیے اینٹ اور مصالحہ کفار ہی کے بھٹہ سے لے رہے ہیں۔ تاکہ عوام کو شرک زعمی سے بچانے کے لیے اس لباس میں ملبوس کر دیں جس میں آفتاب نبوت کی شعاعیں نہ پہنچیں۔ ہیہات۔ ورنہ مومنوں کے لیے کلام پاک میں جو ارشاد ہے وہ اس کے سخت برخلاف ہے۔ دیکھو! بخطاب مومن کیا فرما رہے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو اور جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے حضور نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

(۴۹: ۲ - پ۲۶ - ۱۳)

مولیٰ کریم اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس)

ہم نے انسان کو گناہ اور صواب کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔

تاکہ گناہ سے متقی ہو اور اعمال صالح میں ساعی اور گناہ کے بعد استغفار کرنے والا تائب

ہونے والا اور توفیق من اللہ کا شکر کرنے والا ہو۔ سب گناہوں سے وہ معصیت زیادہ سخت اور خطرناک ہے جس کا انسان کو علم ہی نہ ہو۔ ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اور گناہ و صواب حال کے تغیر کا سبب اور دل کی زندگی اور موت کے موجب ہیں۔ تو جب تک دل نورِ ایمانی سے روشن اور زندہ ہے معصیت کی پہچان اور اطلاع ضرور ہوتی ہے۔ اور وہ گناہ جو نورِ ایمانی اور حیاتِ ابدی کے لیے زہر ہلاہل ہو، اور وہ تیز ہوا جو اس چراغ کو فوراً سرد کر دے اور کفر کی تاریکی ایسا ڈھانپ لے کہ وہ ضیا جس سے علم معصیت کا امکان تھا معدوم ہو جائے تو پھر شعور نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ جیسے کہ مولیٰ کریم فرماتے ہیں کہ گناہ نیکیوں کو کھا جاتے ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ اسی لیے نہایت کرم و لطف سے مومنوں کو متنبہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو سمجھتے اور بولتے بلاتے ہو اپنی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ سمجھنا اور نہ ہی ایک دوسرے کی مثل بلند آواز نکالنا۔ ورنہ ایسے گمراہ ہو جاؤ گے کہ تم کو شعور بھی نہ ہوگا، اور تمہاری عقلیں ماری جائیں گی۔

آہ! آج کل تو بجائے نور و ہدایتِ علم کے سیاہیِ علم نے عقلوں کو ڈھانپ ہی لیا ہے۔ ورنہ کچھ بھی سمجھ ہو تو کلام الٰہی ایسی فاصل ہے کہ کوئی دقیقہ باقی ہی نہیں رہتا۔ بشر، رسول اور عبدہٗ و رسولہٗ میں تو کسی کو بھی کلام نہیں، بلکہ یہ لازمی اور ضروری ہے تاکہ ہماری تعلیم میں جنسیت اور مطابقت کے لحاظ سے آسانی ہو سکے اور تاکہ نسبت فیض کا وُرود بآسانی پہنچ سکے۔ ورنہ اگر عدل و انصاف سے کچھ بھی موازنہ ہو تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت کی خاصیت و حقیقت تو درکنار، ظاہراً بھی کوئی چیز ہماری مثل نہ تھی اور علمائے متقدمین و

متاخرین میں سے اکثر اہل حق و تحقیق نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ بطور

استشہاد

چند ایک حوالہ جات درج ذیل ہیں:-

(۱) تفسیر کبیر جلد ثانی، مطبوعہ مصر، صفحہ ۴۴۰، سطر ۲۲۔ زیرِ آیت اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ الآیۃ:

واعلم ان تمام الکلام فی ھذا الباب ان النفس قدسیۃ النبویۃ مخالفۃ بماھیتہا سائر النفوس الخ بلفظہٖ یعنی نفس قدسیہ نبویہ کی ماہیت باقی تمام نفوس کی ماہیت سے مخالف ہے۔

(۲) تفسیر کبیر، جلد پنجم، صفحہ ۴۹۶، سطر ۱۳، مصری، سورۂ کہف:

وَعَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ فنقول جواھر النفس الناطقہ مختلفۃ بالماھیۃ بلفظہٖ۔ یعنی جواہر نفوس مختلف الماہیت ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مطہرہ کی ماہیت سے وہ جداگانہ ہے۔ اس لیے نفس بشریت میں مساوات یا مماثلت کسی انسان سے نہیں۔

(۳) تفسیر کبیر، جلد دوم، صفحہ ۴۳۹۔۴۴۰، سطر ۳۵، مصری:

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ، وذکر الحلیمی فی کتاب المنہاج ان الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لا بد وان یکونوا مخالفین لغیرھم فی القوی الجسمانیۃ والقوی الروحانیۃ وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم زویت لی الارض فرءیت مشارقھا ومغاربھا وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم اقیموا صفوفکم وتواصلوا فانی اراکم من وراء ظھری بلفظہٖ۔ یعنی جانو کہ رسالت کہاں رکھی جاتی ہے۔ اور حلیمی نے کتاب منہاج میں ذکر کیا ہے کہ تحقیق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے قویٰ جسمانی اور قویٰ روحانی میں سے جدا ہیں۔ اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میرے لیے زمین کو سمیٹا گیا۔ پس میں نے اس کے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھ

لیا۔ اور فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ قائم اور سیدھی کرو نماز میں اپنی صفوں کو اور مل کر کھڑے ہو، پس تحقیق میں دیکھتا ہوں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی۔

(۴۲) تفسیر فتح العزیز، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، پارہ عم، صفحہ ۲۱۸، سطر ۱۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات:

از خصوصیاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را در بدن مبارکش دادہ بود:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از پس پشت مے دیدند چنانچہ از پیش روئے خود می دیدند۔

(۲) و در شب و تاریکی چناں مے دیدند کہ بروز در روشنی۔

(۳) و آب دہن ایشاں آبہائے شور را شیریں مے کرد۔

(۴) و با طفال شیر خوارہ یک قطرہ از آب دہن بچکانیدند آن اطفال تمام روز شکم سیری ماندند و طلب شیر نمی کردند چنانچہ در روز عاشورہ با طفال اہل بیت تجربہ شدہ۔

(۵) و بغل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفید رنگ براق بود واصلاً موئے نداشت۔

(۶) و آواز ایشان جائے مے رسد کہ آواز دیگراں بعشر عشیر آن نمی رسد و از دوری شنیدند کہ دیگراں باں مسافت نمی توانند شنید۔

(۷) و در خواب چشم ایشان خواب آلود مے شد و دل خبردار می ماند۔

(۸) و خمازہ دہن ہرگز ایشان در تمام عمر اتفاق نہ افتاد۔

(۹) و احتلام ہرگز واقع نہ شد۔

(۱۰) عرق مبارک ایشان خوشبوتر از مشک بود۔ بحدے کہ اگر در کوچہ مے گذشتند مردم بسبب بوئے خوش عرق ایشان کہ در ہوا سرایت کردہ می ماند پے می بردند کہ ازین کوچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گذشتند۔

(۱۱) ہیچ کس از فضلۂ ایشان بر روئے زمین ندیدہ زمین مے شگافت فرو می برد و از آن زمین بوئے مشک می شمیدند۔

(۱۲) و در وقت تولد مختون پیدا شدند۔

(۱۳) و ناف بریدہ و پاک و صاف ہرگز لوث نجاست بر بدن ایشان نبود۔

(۱۴) چوں بر زمین افتادند سجدہ کناں و انگشت خود را سوئے آسمان برداشتند۔

(۱۵) و در وقت تولد ایشاں نور منتشع شد کہ بسبب آں شہرہائے شام مادر ایشاں را نمودار شد۔

(۱۶) و مہد ایشاں ملائکہ می جنبانیدند۔

(۱۷) و مہتاب با ایشاں در حالت گہوارہ تکلم می فرمود۔

(۱۸) ہمیشہ بروز وقت تمازت گرما ابر بر ایشاں سایہ می داشت۔

(۱۹) اگر زیر درختے می آمدند سایہ درخت بسمت ایشاں متوجہ می شد۔

(۲۰) و سایہ ایشاں بر زمین نمی افتاد۔

(۲۱) و مگس ایشاں را ایذا نمی داد۔

(۲۲) بر جامہائے ایشاں مگس نمی نشست۔

(۲۳) اگر بر جانورے سوار می شدند آں جانور تا مدت سواری ایشاں بول و براز نمی کرد۔

(۲۴) در عالم ارواح اوّل کسے کہ پیدا شد ایشاں بودند۔

(۲۵) اوّل کسے کہ در جواب اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ بَلٰی گفت نیز ایشاں بودند۔

(۲۶) و سیر معراج مخصوص با ایشان است۔

(۲۷) و سواری براق نیز مخصوص با ایشاں

(۲۸) و بالائے آسمان رفتن و بحد قاب قوسین رسیدن و بدیدار الٰہی مشرف شدن

(۲۹) و ملائکہ را فوج و حشم ایشاں ساختن ہمراہ ایشاں مانند لشکریاں جنگ و قتال کردند نیز خاصہ ایشان است۔

(۳۰) و شق القمر و دیگر معجزات عجیبہ و غریبہ نیز مخصوص با ایشان است۔

(۳۱) و در روز قیامت آنچہ ایشاں را دہند ہیچ کس را ندہند۔

(۳۲) اوّل کسیکہ از قبر سر بر آرد ایشاں باشند

(۳۳) ایشاں بر براق حشر نمائند۔

(۳۴) و ہفتاد ہزار فرشتہ گرداگرد ایشاں جلو دار باشند۔

(۳۵) و بجانب راست عرش بالائے کرسی ایشاں را جا دہند۔

(۳۶) وبمقام محمود مشرف سازند۔

(۳۷) ودر دست ایشاں لوا الحمد دہند کہ حضرت آدم وتمام ذریت ایشان زیرآں نشان باشند

(۳۸) وہمہ انبیاء باتبیان خود پس ایشان شوند۔

(۳۹) ودر دیدار خدا اول بایشاں شروع کنند۔

(۴۰) وبشفاعت عظما ایشاں رامخصوص سازند۔

(۴۱) واوّل کسے کہ برپلصراط بگذرد ایشاں باشند وتمام خلائق حشر را حکم شود کہ چشمہائے خود را فرو بندند تا دختر ایشاں فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بر پلصراط بگذرد۔

(۴۲) اوّل کسیکہ جنت را بکشاید ایشاں باشند۔

(۴۳) درروز قیامت ایشاں را بمرتبہ وسیلہ مشرف سازند وآں مرتبہ ایست نہایت بلند کہ کسے را درمخلوقات میسر نہ شد۔

(۴۴) وحقیقت آں آنست کہ ایشاں دراں روز از جناب خداوندی بمنزلہ وزیر از پادشاہ باشند وآنچہ درشرائع آں مخصوص اند چیزہائے بسیار است کہ تعدد آں موجب تطویل ست۔ بلفظہ۔

(۵) حدیث شریف صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۲۴۶۔ سطر ۳۵۔ مطبوعہ مصر۔ باب الوصال۔ ترجمہ:

"یعنی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے کہ وصل نہ کرو۔ یعنی روزہ وصل نہ رکھو۔ عرض کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہ آپ جو وصل کرتے ہیں اس لیے ہم بھی روزہ وصل رکھیں گے۔ اس پر فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ کہ میں تمہارے کسی آدمی کی مانند نہیں ہوں۔"

(۶) صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۲۴۶، سطر ۳۷۔ مصری۔ ترجمہ:

"یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ منع فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے وصال سے یعنی روزہ وصال سے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ آپ جو وصال کرتے ہیں۔ فرمایا حضور صلعم نے اِنِّیْ لَسْتُ مِثْلَکُمْ کہ تحقیق میں تمہاری مثل یا مانند نہیں ہوں۔"

۷۔ صحیح بخاری، جلد اوّل۔ صفحہ ۲۴۷، سطر ۲۔ مصری۔ ترجمہ:

"حضرت سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وصال کے روزہ کی بابت تو حضورؐ نے فرمایا اِنِّی لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ کہ میں تمہاری شکل وصورت وہیئت کی مانند نہیں ہوں۔ کیونکہ مجھے (اللہ تعالیٰ) کھلانے والا کھلاتا ہے اور پلانے والا پلاتا ہے۔

۸۔ صحیح بخاری، جلد اوّل۔ صفحہ ۲۴۶، سطر ۵، مصری۔ ترجمہ:

"روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ منع فرمایا حضورؐ نے روزہ وصال سے اور فرمایا اِنِّیْ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ کہ میں تمہاری شکل وصورت اور خوخصلت کے مانند نہیں ہوں۔"

۹۔ صحیح بخاری، جلد اوّل، صفحہ ۲۴۶، سطر ۹، مصری۔ ترجمہ:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے روزہ وصال سے منع فرمایا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ حضور جو روزہ وصال رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اَیُّکُمْ مِثْلِیْ۔ یعنی تمہارے میں کون میری مانند ہے؟"

۱۰۔ مواہب اللدنیہ، للشیخ قسطلانی علیہ الرحمۃ جلد اوّل، صفحہ ۲۴۸۔ مقصد ثالث، سطر ۲۳:

"اعلم ان من تمام الایمان بہ صلی اللہ علیہ وسلم الایمان بان اللہ تعالیٰ جعل خلق بدنہ الشریف علی وجہ لم یظہر قبلہ ولا بعدہ خلق آدمی مثلہ الخ بلفظہم

یعنی خوب جان لے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے ساتھ کمال ایمان یہ ہے کہ ایمان لاوے اللہ تعالیٰ پر کہ اس نے پیدا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے بدن شریف کو ایسی طرح پر کہ ان کے برابر نہ کوئی پہلے پیدا ہوا اور نہ ان کے بعد پیدا ہوگا۔ یعنی ان کی مثل یا نظیر کوئی نہیں ہوگا۔"

۱۱۔ مکتوبات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ جلد سوم مکتوب نمبر ۱۰۰۔ ترجمہ اردو:

"جاننا چاہیے کہ پیدائش محمدی تمام افراد انسان کی پیدائش کی طرح نہیں۔ بلکہ افراد عالم میں کسی فرد کی پیدائش کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم باوجود عنصری پیدائش کے حق تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا ہے خُلِقْتُ مِنْ نُّوْرِ اللّٰہِ۔ میں اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں۔ دوسروں کو یہ دولت میسر نہیں ہوئی۔ اس دقیقہ کا بیان یہ ہے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت واجب الوجود جل شانہٗ کے صفات ثمانیہ

حقیقیہ اگرچہ دائرۂ وجوب میں داخل ہیں۔ لیکن اس احتیاج کے باعث جو ان کو حضرت ذات تعالیٰ کے ساتھ ہے ان میں امکان کی بو پائی جاتی ہے۔ اور جب صفات حقیقیہ قدیمیہ میں امکان کی بو پائی جاتی ہے تو حضرت واجب الوجود جلّ شانہٗ کی صفات اضافیہ میں بطریق اولیٰ امکان ثابت ہوگا اور ان کا قدیم نہ ہونا ان کے امکان پر پہلی دلیل ہوگا۔ کشف صریح سے معلوم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش اس امکان سے پیدا ہوئی ہے جو صفات اضافیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ نہ کہ اس امکان سے جو تمام ممکنات عالم میں ثابت ہے۔ ممکنات عالم کے صحیفہ کو خواہ کتنا ہی باریک نظر سے مطالعہ کیا جائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مشہود نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی خلقت کو امکان کا منشا عالم ممکنات میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اس عالم سے برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سایہ نہ تھا۔ نیز عالم شہادت میں ہر ایک شخص کا سایہ اس کے وجود کی نسبت زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ جب جہان میں ان سے زیادہ لطیف کوئی نہیں تو پھر ان کا سایہ کیسے متصور ہو سکتا ہے"۔ بلفظہٖ۔

۱۴۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی دفتر سوم۔ مکتوب نمبر ۴۶:

"جن محجوبوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر کہا اور دوسرے انسانوں کی طرح تصور کیا وہ منکر ہوگئے۔ اور جن سعادت مندوں نے ان کو رسالت اور رحمت عالمیان کے طور پر دیکھا اور تمام لوگوں سے ممتاز اور سرفراز سمجھا وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے اور نجات پاگئے"۔ بلفظہٖ۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فرقان حمید میں مولیٰ کریم نے فرمایا:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا	اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے
اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ	میں اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا
اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷: ۹۴۔ پ۱۵)	خدا نے آدمی کو پیغمبر کرکے بھیجا ہے۔

یہ وہی مرض ہے جس کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ وہی حجاب ہے جو کھل نہ سکا، یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے انکار آسان معلوم ہوا۔ لیکن آج کل نام نہاد مسلمان اس آیت کو عجیب طرح سے

حجت پکڑتے ہیں اور مَنَعَ النَّاسَ کا اطلاق بَشَرًا رَّسُوْلًا پر کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ یہ انکار کہ آپ بشر نہ تھے وہی انکار ہے جو کفار کرتے تھے۔ یہ وہی حجاب ہے جس میں وہ محجوب ہو رہے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بشراً رسول اور عبداً رسول میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ صرف مثلکم میں کلام ہے۔ جیسا کہ اقوال بزرگان دین و احادیث اور تفاسیر سے اوپر گزر چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا انکار کی رو سے ہے اور دوسرا فضیلت مدارج اور نور ایمانی کی رو سے ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کی عورتوں نے دیکھا تو ان کے حسن و صورت کی وجہ سے ساختہ بول اٹھیں کہ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ط ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول محض عزت و تکریم کی وجہ سے تھا، انکار کی رو سے نہ تھا۔ ورنہ خوب جانتی تھیں کہ یہ بشر ہے، زلیخا کا غلام ہے، اور طعن کی رو سے:

تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ج قَدْ	عزیز کی عورت اپنے غلام سے ناجائز خواہش
شَغَفَهَا حُبًّا ط اِنَّا لَنَرٰىهَا فِىْ ضَلٰلٍ	کرتی ہے اور اس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے۔
مُّبِيْنٍ ۝ (۱۲: ۳۰۔ پ۱۲۔ ع۱۴)	ہم دیکھتی ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہے۔

کہا تھا۔

معلوم کرنا چاہیے کہ اس خالق موجودات نے انسان کے لیے بشر کا لفظ کس جگہ اور کس وقت استعمال فرمایا ہے اور اس کا وصف کیا ہے؟ دیکھو ذوالجلال والاکرام کا فرمان:

اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا	میں بنانے والا ہوں ایک بشر مٹی سے۔ جب
سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ	اس کو ٹھیک بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ (پ۱۴۔ ۱۴؍۱۴) پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا۔

رُوح کے بغیر صرف بُت انسان کو بشر سے نامزد کیا ہے۔ اور لُغت میں بشر کے معنی ردّیُ الخلق چمڑے کے ہیں۔ بعض بزرگوں نے بھی آپ کو سیّدالبشر فرمایا ہے لیکن اس لحاظ سے تو میرے نزدیک حضورؐ کے لیے یہ خطاب بھی مذموم ہی ہے۔ اس واقعہ سے پہلے حضرت باری تعالیٰ نے بھی قبل از ظہورِ جب بشر اور بشریت کا نام تک نہ تھا، انسان فرمایا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ — بیشک آیا ہے انسان پر ایک وقت زمانے

لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ (الدہر۱) — میں سے کہ نہ تھا کچھ چیز ذکر کیا گیا۔

اور یہ اسم مبارک اس کا ذاتی نام ہے جو تمام صفات کا جامع اور احسن تقویم سے مزین ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ — انجیر اور زیتون کی قسم اور طورِ سینین کی اور

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا — اس امن والے شہر (مکے) کی کہ ہم نے انسان کو

الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (پ۳۰۔ تین) — اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

باقی سب کے سب نام صفاتِ حسنہ اور سیئہ کے اسموں سے موسوم ہیں۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے آدمی ہو گیا ہے۔ بعدہٗ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اور بعض جگہ صرف روح کے نام ہی سے مخاطب فرمایا ہے۔ یہاں ہر اسم کے ساتھ آیات کا حوالہ دینا ضروری نہیں۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان ان صفات سے علم رکھتا ہے۔ مثلاً کافر، منافق، فاسق، مشرک اور مسلم، مومن، ولی، نبی، رسول، یہ سب کے سب صفاتی نام ہیں جس صفت سے انسان نسبت رکھتا ہے اسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان میں سے کافر، منافق، مشرک، فاسق

یا مومن و مسلمان بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کی وجہ پر ہے۔ لیکن ولایت، نبوت اور رسالت سو یہ وہبی شرف ہے جو کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ اور اَرْسَلْنٰكَ اس پر شاہد ہے اور اس میں بھی مدارج ہیں۔ گو رسالت میں سب یکساں ہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ لیکن تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی حیثیت سے مختلف۔ جیسے نوح نجی اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ علیہم السلام۔ ہر ایک کو اس صفت سے موصوف فرمایا ہے جس میں وہ ممتاز تھے۔ اور ہر وجود با وجود سے مطابق مدارج وصفات فعل بھی سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً نجات حضرت سے نوح علیہ السلام کو اور خُلّت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور کلام سے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سرفراز فرمایا۔ اور رُوحانیت کے کرشمے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوئے۔ جیسے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست، مُردہ کو زندہ اور مٹی کا جانور بنا کر ٹھیک اور درست کر دینا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اس لم یزل ولا یزال، بے مثل و بے مثال نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کونسی صفتوں سے مزین فرما کر مرسل کیا ہے؟

خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

سراجًا منیرا

کی خلعت سے آراستہ فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے سراج کے معنی چراغ کے لیے ہیں اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ چراغ سے دوسرا چراغ بلکہ لاانتہا چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور آفتاب سے ایسا فعل سرزد ہونا ناممکن سمجھ کر مفاد کو ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن تطبیق قرآن شریف کے

لحاظ سے سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے معنی شمس ہی کے ہیں۔ گو سراج کے معنی چراغ کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن آفتاب کے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ کیونکہ جو حقیقت اور مفاد آفتاب سے عیاں ہے چراغ ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور وہ اس لیے کہ چراغ نے بھی آفتاب ہی سے روشنی حاصل کی ہے۔ چراغ کی روشنی کا اصل سرمایہ کوئی روغن ہے اور باقی وجود چراغ یا بتی سامان ہے۔ ہر روئیدگی جس سے روغن حاصل کرنا ممکن ہے اپنے نشوونما کے میدان میں آفتاب کی محتاج ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ عالم موجودات کی ہر چیز کو اس خالق یکتا نے عناصر اربعہ یعنی آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہی سے خلقت کیا ہے۔ نیز فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ یعنی ہر چیز کی حیاتی پانی سے ہے۔ جب کچھ نہ تھا پانی تھا۔ مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین
فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ	کو بیچ چھ دن کے اور تھا عرش اس کا اوپر پانی کے
لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (پ۱۲-۱)	تاکہ آزمائے تم کو کون تم میں بہتر ہے عمل میں۔

اور موجودات کی تخلیق اربعہ عناصر میں سے کسی ایک عنصر سے ہونا روا نہیں ہے۔ اور جو فرمایا

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ	اور البتہ بیشک پیدا کیا ہم نے آدمی کو بجنے والی
مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ	مٹی سے جو بنی تھی کیچڑ سڑی ہوئی سے اور جنوں کو
مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵: ۲۶-۲۷)	پیدا کیا ہم نے ان کو پہلے اس سے آگ لوؤں کی

یہ جنسیت کے لحاظ سے اور غلبہ کے رُو سے ارشاد مبارک ہے۔ ورنہ یہ امر معروف ہے کہ ہوا کے بغیر زندگی محال ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مخلوق اربعہ عناصر ہی سے بنائی گئی

ہے اور ہر ذی روح کے جسم کا نظام اور وجود کا ثبات و صحت انہی عناصر کے قریب بہ اعتدال رہنے پر منحصر ہے۔ اور ایک دوسرے کی اضداد کا مستحیل ہو کر اور ترکیب پا کر فنا ہونے کے بعد باہمی اتحاد و امتزاج ایک وجود کے ظہور کا باعث ہے جس میں وجود عناصر کی انفرادیت کا نشان معدوم ہو چکا ہوتا ہے۔ مثلاً لکڑی میں آگ، مٹی، ہوا اور پانی کا بعینہٖ ملنا ناممکن ہے اور یہی حال تمام مخلوق کا ہے۔

مطابق ارشاد مولیٰ کریم تخلیق میں دو درجے ثابت ہوتے ہیں۔ اوّل عناصر سے اور دوسرا نطفہ یا تخم سے۔ پس ہر تخم میں روح اور جسد پنہاں ہے جس کا ظہور انہی عناصر سے خوراک کا محتاج ہے تاکہ جڑ سے لے کر تنے ٹہنیوں، برگ اور پھول کے منازل کو طے کرتا ہوا پھل یعنی تخم سے بار آور ہو۔ اور مولیٰ کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے کل موجودات کا نظام شمس سے متعلق رکھا ہے جس کے بغیر سلسلۂ نشوونما بالکل ناممکن ہے۔ اس لیے اس کو نظام شمسی کہنا بجا و درست ہے۔ اس کے پورے بیان میں بہت طول ہے۔ اختصار کے طور پر کچھ حوالۂ قرطاس کیا جاتا ہے۔ مثلاً رات اور دن کی آمد و رفت اسی کے چہرہ کے نقاب اور رویت کا نتیجہ ہے۔ موسم کا تغیر و تبدل اسی کے بعد و قرب کے باعث ہے۔ پانی کو اسفل مقام سے اُٹھا کر اوج فلک پر پہنچا دینا اور اس سے چمک اور گرج پیدا کرنا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ پہاڑوں کی سخت چٹانوں میں اپنی شعاؤں کے تصرف سے لعل و زمرد کا پیدا کرنا اس کے طبع فیض کا ظہور ہے۔ بجلی اور اس کی طاقت سے کارخانوں کی حرکت اور دور دراز کی خبروں کے سامان کا مبداء یہی ہے۔ لیکن اس کا تصرف و فیض اور ہر قسم کا مفاد دراصل مولیٰ کریم کی طرف سے ہے بلکہ

سایہ تک کو بھی جو محض آفتاب کی رویت میں حجاب کے سوا وجود نہیں رکھتا، اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے۔ اور اسی سنت اللہ پر ہر ایک چیز کے فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ یعنی ہم ہی تم کو رزق دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ	بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا	کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو
الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ	اس کو (بے حرکت) ٹھیرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس کا
اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ۝ (۲۵ : ۴۵-۴۶)	نشانی ٹھیرایا۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر
پارہ ۱۹، رکوع ۳	اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

اسی طرح ہر ایک فعل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے۔ ہاں ایک جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ	دیکھو تو کہ جس نطفے کو تم عورتوں کے رحم میں
تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝	ڈالتے ہو، کیا تم اس سے انسان کو بناتے ہو یا
(۵۶ : ۵۸-۵۹ - پ۲۷ - ر ۱۵ - س واقعہ)	ہم بناتے ہیں؟
اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ	بھلا دیکھو تو کہ جو کچھ تم بوتے ہو۔ تو کیا تم اسے
تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝	اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ (پ۲۷۔ ر۱۵۔ واقعہ)

فرق صرف یہ ہے کہ ہر شے مثل دانہ یا نُطفہ میں تصرف کسی قدر اسباب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن تصرف رُوح کو (جس کے سوا کسی وجود کی بھی پرورش ناممکن ہے اور درحقیقت وہ حق

کے فعل کے سوا نہیں ہے) اپنی ذات کے فعل سے ملحق کیا ہے لیکن یہ بھی قاعدہ کلیہ نہیں ہے بعض تصرف روحی بھی مخلوق کی طرف منسوب ہیں۔ تاہم ان کی حقیقت بھی حق کی طرف ہی سے ہے، جو مخلوق روحی ہیں۔ اور یہ اقسام مخلوق ہیں۔ جیسے زمین و آسمان و مافیہن سب مخلوق ہیں اور سب کے سب فانی ہیں لیکن ملائکہ جو نوری وجود رکھتے ہیں، اس مخلوق سے ان کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ انسان، دوزخ اور جنت بھی مخلوق ہیں لیکن ان کو فنا حقیقی نہیں ہے۔ اور مرسلین بشریت کی رو سے یا بنی آدم ہونے کی حیثیت سے انسان ہی ہیں لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے بدن میں آنکھ یا حجریات میں لعل یا آئینہ کیونکہ آئینہ باوجود وجود رکھنے کے سایہ نہیں رکھتا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے اپنے مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر ۱۰۰ میں فرمایا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ "پیدائش محمدی تمام افراد انسان کی پیدائش کی طرح نہیں بلکہ افراد عالم میں کسی فرد کی پیدائش کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی" اس لیے خام مثالیں بیگانگی ہیں اور شرم و حیا غالب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی مثال پیش کی جائے چونکہ مولیٰ کریم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراجاً منیرا کے لقب سے ممتاز فرمایا ہے اس لیے آفتاب اور آپ کا فرق بیان کرنے کے بغیر چارہ نہیں۔

واضح ہو کہ اَلشَّمْسَ ضِیَآءً کی صفت آفتاب کے لیے ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سِرَاجًا مُّنِیْرًا فرمایا ہے۔ یعنی خورشید ضیا سے متصف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراپا نور۔ سورج دنیا کی تاریکی کو روشنی سے بدلنے والا ہے، اور حضورؐ روحانیت

کی ظلمات کو مٹا کر نور سے منور کرنے والے۔ سورج موجودات کی نشو و نما کا رہنما حضورؐ روحانیت کے پودوں کے ہادی و پیشوا۔ سورج ہر بار آور کو ثمر تک پہنچانے والا، اور آپ ہر مومن تابع کو کعبہ مقصود تک لے جانے والے ہیں۔ زیادہ تحریر بھی سوء ادبی ہے۔ صرف یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح عالم موجودات کا سب نظام مولا کریم نے آفتاب پر رکھا ہے اور اس کو رہنما فرمایا ہے اسی طرح عالم روحانیت کا سارا نظام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رکھا ہے۔ فرمان ایزدمتعال اس پر دال ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝ (۳۳: ۴۵-۴۷۔ پ ۲۲)

اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور خدا کی طرف بلانے والا اس کے حکم سے اور سورج منور۔ اور مومنوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے بڑا فضل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ جل شانہٗ نے پانچ صفات سے متصف فرمایا شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، اور سراجاً منیرا۔ مبشر و نذیر اور داعی الی اللہ ذات حق کے حکم یعنی وحی کے ذریعہ سے معروف ہے۔ اس کی تسلیم میں تو کسی بھی مسلمان کو کلام نہیں۔ رہا شاہد و سراجاً منیرا، سو

شاہد

کے معنی گواہ کے ہیں۔ اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک تو کسی غیر پر اس کے حال سے آگاہی رکھنے

والا اور دوسرا اپنے افعال کی وجہ سے اپنی ذات پر شہادت دینے والا۔ پہلا علم احوال غیر کی وجہ پر شاہد ہے اور دوسرا اپنے حال کی وجہ پر شہید۔ جیسے لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو شہید کہنا درست ہے اور اس کے لیے کسی علم کی احتیاج لازم نہیں ہے لیکن شاہد کے لیے علوم ظاہری و باطنی کا ہونا از حد ضروری ہے۔ کیونکہ وہ معنی جو شاہد کے لیے لازم ہیں بغیر علم کے مطلق ناممکن ہیں۔ لیکن شاہد اور شہید دونوں صفتوں کا جمع ہونا کمال اتم کی دلیل ہے۔ جیسے ارشاد مولیٰ کریم وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا یعنی شہید تو کمال وصف ذاتیہ سے اور شاہد وصف فعلیہ سے جیسا صفت بالذات جو ذات سے متصف ہیں، نہ ذات سے منفک ہوئی ہیں اور نہ ہی کبھی ہوں گی۔ اور صفت بالفعل کا تصرف و ظہور الی الخلق ہے۔ گو صفات فعلیہ بھی ذات سے منفک نہیں ہیں۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ صفات بالفعل تابع صفات بالذات ہیں اور صفات بالذات تابع ذات۔

اسی طرح ذوالجلال والاکرام نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں شہید کا لقب استعمال کیا ہے:

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲: ۱۴۳) اور ہوں رسول تم پر گواہ۔ (پ ۲۔ ع ۱)

تو اس میں ہر دو معانی منکشف ہوئے۔ یعنی شہید اپنے حال و ذات کے لیے اور حلیہ کی رو سے شاہد امت کے واسطے۔ لہٰذا ان دونوں وصفوں کا جمع ہونا آپ کے کمال حال اور علم کی دلیل ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔ خود ذات باری تعالیٰ نے فرمایا ہے كَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا یعنی اللہ کا

تم پر بڑا فضل ہے۔ اور یہ تخصیص کی رو سے ہے۔ جو قابلیت رسالت اور منصب نبوت کے لیے لازمی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی دفتر اوّل مکتوب نمبر ۹۹ میں ایک حدیث شریف کا بیان فرماتے ہیں:

"تنام عینای ولاینام قلبی۔ کہ تحریر یافتہ بود اشارت بدوام آگاہی نیست بلکہ اخبار است از عدم غفلت احوال خویش وامت خویش۔ لہٰذا نوم در حق آں سرور ناقض طہارت نگشت۔ و چوں نبی رنگ شبانست در محافظت است خود غفلت شایان منصب نبوت او نباشد۔"

رہی سراجاً منیرا کی مثال جو ذات باری تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے، بالکل عیاں ہے۔ اس عزیز الحکیم سے بہتر کون مثال پیش کر سکتا ہے یہ رب العلمین ہی کے شایاں ہے۔ کیونکہ خالق موجودات، وارث کائنات جس نے ہر چیز کو اس کے اصل سے پیدا کیا اور اس کی فرع کو ظہور کا اسباب بنایا۔ ہر چیز کی حقیقت کا علم اسی عزیز الحکیم ہی کے لیے خاص ہے۔ سوائے اس کے کما حقہٗ عارف ہونا یا ذات باری تعالیٰ کا سا علم ہونا مخلوق کے لیے روا نہیں ہے:

لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا	نہیں احاطہ کرتے ساتھ کسی چیز کے علم اس کے
بِمَا شَآءَ ۚ (۲:۲۵۵۔ پ ۳ ر ۲)	سے مگر ساتھ اس چیز کے کہ وہ چاہے۔

ہاں جس قدر عنایت فرمائیں مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ صرف اسی قدر۔

تو اس قادر و قیوم نے جیسے عالم موجودات میں شمس کو اس قدر روشنی عطا فرمائی ہے کہ ہر چیز اس کی ضیا سے روشن اور فیض یاب ہے۔ یہ ضیا زمین و آسمان و ما بینہما ہر جگہ

تمام موجودات پر حاوی ہے، بلکہ کل کائنات و مخلوقات کی حیات کا سبب ہے۔ کوئی جگہ اس سے پوشیدہ نہیں اور یہ ہر چیز کے لیے عیاں ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحانیت کے جہان میں انہی صفتوں کے ساتھ موصوف ہیں۔ اب اس مثال کی مطابقت بھی من اللہ ہی ہونی چاہیے تاکہ معانی میں کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ مومنوں کے واسطے اطمینان قلب اور نور ایمانی میں افزائش ہو۔ مذبذبین کے لیے دلیل ہو اور منکروں پر حجت ہو۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ دے، اس خالق کون و مکان نے آفتاب کو نعمت فرمایا ہے اور شکر کے لیے دعوت دی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ	اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے
النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ	رات اور دن کو بنایا ہے تاکہ تم اس میں آرام کرو
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۲۸:۷۳)	اور اس کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ شکر کرو۔

رات اور دن کا ہونا سورج کے پھرنے سے ہے، تو اصل میں یہاں منعم کریم کی نعمت شمس کے شکر کے لیے ہی فہمائش کی گئی ہے۔ ہر نعمت کا شکر اس منعم حقیقی کی قدرت کاملہ کی تمجید اور صنعت کی توصیف و تعریف سے ہے اور کفران نعمت محسن حقیقی کے احسان کو فراموش کرنا ہے نعمت دو نوع پر ہے۔ ایک نعمت جسمانی اور دوسری روحانی۔ جسمانی کا دارومدار میدان دنیا پر ہے اور روحانی کا دار الآخرہ پر۔ دنیوی انعام فانی ہیں اور نعمت الآخرہ یعنی روحانی انعام باقی رہنے والے ہیں۔ نعمت دنیا ایک حد تک ضرورت کے پورا کرنے کے بعد متغیر صورت اختیار

کرنے سے زحمت ہو جاتی ہے لیکن نعمتِ عظمیٰ یعنی فی الآخرہ بے انتہا اور تغیر سے مبرا ہے۔ مثلاً پیاسے کے لیے پانی نعمت ہے لیکن دوسرے کے لیے جو سردی سے کانپ رہا ہو، زحمت ہے۔ بھوکے کے لیے کھانا بہت بڑی نعمت ہے لیکن سیری طعام کے بعد کھانا اس کے لیے بلا کا حکم رکھتا ہے۔ جاڑے میں تمازت آفتاب اکسیر کا حکم رکھتی ہے لیکن گرمیوں میں بعض اوقات موجب ہلاکت ہو جاتی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔

تیسری نعمت وہ ہے جو دین و دنیا میں باعث برکت اور نعمت کا اصل ہے۔ اسلام و ایمان، توحید و رسالت۔ ان سب کا اصل اور ثمر توحید باری تعالیٰ ہے جس کا اول یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ محض ظن سے ہے اور آخر روئیت ہے۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔

لیکن خبردار ہونا چاہیے کہ سوائے توحید رسالت کے توحید بھی مذموم و باعثِ گمراہی ہے اور صراط المستقیم کی راہروی سوائے نور رسالت کے ناممکن، اور اس سے روگردانی باعث اہمیت و کفران نعمت۔ زمین قلب کو ماسوائے اصل سے پاک کر کے کتنی ہی محنت سے سنوارا جائے اور حبِ مقصود ڈال کر اعمال صالح سے آبپاشی کی جائے، جب تک آفتاب نبوت کی شعائیں رہنمائی نہ کریں، روئیدگی محال ہے، اور عمل بے فائدہ۔ کیونکہ ارادۂ الٰہی اور سنت اللہ اسی طرح جاری ہے۔ کلام الٰہی اس کی مصدق اور دلیلیں روشن موجود، نص اس پر شاہد اور مثالیں بین۔ عدل و انصاف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نورِ ایمانی کے ترازو سے موازنہ کرنا چاہیے کہ جس طرح مولیٰ کریم نے اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کو آفتاب منیر سے مثال دی ہے اسی طرح آفتاب رسالت کی شعاعوں میں پرورش پانے والوں، اس نور خدا سے منور

ہونے والوں، دین و ایمان سے مزین اور ثمر توحید رسالت اور مقصود کو حاصل کرنے والوں کی مثال روئیدگی سے بیان فرمائی ہے۔ تاکہ کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ فرمایا ہے:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ	وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے)
فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ	اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی
يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۔	اور پھر نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی
(۴۸ : ۲۹ - پ ۲۶ - ع ۱۲)	والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

ہیہات! آج کل تاریکی و ظلمات کی گھٹائیں اس قدر محیط ہو گئی ہیں کہ حق و باطل میں تمیز محال ہو گئی ہے۔ ایمان کے میدان میں تسلیم تو درکنار صاف انکار ہی کو صراط المستقیم سمجھ رہے ہیں۔ العلم حجاب الاکبر کے ملبوس، اپنے زعم کے موحد، نور معرفت سے بے نور، چاہ کو مینار اور مینار کو چاہ جان رہے ہیں۔ سچ ہے ارشاد باری تعالیٰ:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ	حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر قابو نہ پا سکے
لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۚ كَذٰلِكَ كَذَّبَ	اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔ اور ابھی اس
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ	کی حقیقت ان تک آئی ہی نہیں۔ اسی طرح جو
كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۰ : ۳۹)	لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے تکذیب
پ ۱۱ - ع ۹ - سورہ یونس -	کی تھی سو دیکھ لو کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔

لیکن جنہوں نے اس نور سے بصارت قلبی حاصل کی، اللہ جل شانہٗ نے اپنی رحمت سے ان کے سینوں کو شفا بخشی اور يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

اس نعمت عظمیٰ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت سے عارف ہوئے۔ فرمان ایزدی

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ	اور میں اپنی تمام نعمتیں بخش دوں اور یہ بھی کہ
تَهْتَدُوْنَ ۝ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ	تم راہ راست پر چلو (منجملہ اور نعمتوں کے) بھیج تم
رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ	میں تمہی سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو میری
يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہیں پاک
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝	بناتے ہیں اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔
(۲: ۱۵۰-۱۵۱ - پ۲ - ع۲)	اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

کی ان کے دلوں نے تصدیق کی وَیُزَکِّیْکُمْ کے مفاد سے زکیٰ حاصل کرتے ہوئے وَیُعَلِّمُکُمْ سے علم حاصل کیا۔ تب اس بے بہا دولت سے مومنین کو آگاہ کرنے کے لیے یوں ارشاد فرمایا

۱۔ علامہ نبہانی اپنی تحقیق انعام فرماتے ہیں:

حیث قال وان الذی اراہ ان	میں جو دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضور پر نور سید عالم
جسدہ الشریف لایخلو منہ زمان	صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مقدس سے زمان
ولا مکان ولا محل ولا امکان و	خالی ہے نہ مکان، محل خالی ہے نہ امکان، عرش
لا عرش ولا لوح ولا کرسی ولا قلم	خالی ہے نہ قلم، زمین خالی ہے نہ سمندر، نرم
ولا بر ولا بحر ولا سھل ولا وعر و	زمین خالی ہے نہ پہاڑ، برزخ خالی ہے نہ قبر"
لا برزخ ولا قبر"	غرضیکہ تمام عالم کے ذرہ ذرہ میں سرکار اعظم
	جلوہ افروز ہیں۔

۲۔ شفا حضرت قاضی عیاض شرح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہما صفحہ ۱۱۷ جلد ثانی۔

ان لم یکن فی البیت احد فقل	یعنی اگر (کسی مسلمان کی ملاقات کو جاؤ) وہ گھر میں موجود
السلام علی النبی و رحمۃ اللہ	نہ ہو تو کہو کہ میرا سلام و رحمت و برکت آنحضرت صلی اللہ علیہ
و برکاتہٗ لان روحہ علیہ السلام	وآلہ وسلم پر ہے۔ یہ اس واسطے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
حاضر فی بیوت اھل الاسلام	آلہ وسلم کی روح مبارک ہر اہل اسلام کے گھر میں حاضر رہتی ہے۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر عزیزی میں وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا کی یوں تفسیر فرماتے ہیں:

یعنی باشد رسول شما بر شما گواہ زیرا کہ او مطلع است بنور نبوت بر رتبہ ہر متدین بدین خود کہ در کدام درجہ از دین من رسیدہ و حقیقت ایمان او چیست و حجابے کہ بداں از ترقی محجوب ماندہ است کدام است پس او می شناسد گناہان شمارا و درجات ایمان شمارا و اعمال نیک و بد شمارا و اخلاص و نفاق شمارا والہذا شہادت او در دنیا بحکم شرع در حق امت مقبول و واجب العمل است۔"

۴۔ شیخ شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد اوّل، باب تشہد صفحہ ۴۰۳ میں حدیث شریف از عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ کے تحت یوں تحریر فرماتے ہیں:

"دعا بخیر و سلامت ست بر تو اے پیغمبر و مہربانی خدا و افزونیہائے خیر و کرم وے و وجہ خطاب بآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بجہت القائے ایں کلام است بر آنچہ در اصل بود کہ در شب معراج از جانب پروردگار تعالیٰ و تقدس بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطاب بسلام آمد پس آنحضرت ﷺ در حین تعلیم امت

نیز بہماں لفظ اصل گذاشت تا ایشاں را بذکر آں حال گردد۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ نصب العین مومناں و قرۃ العین عابدان است در جمیع احوال و اوقات خصوصاً در حالت عبادت و آخر آنکہ وجود نورانیت و انکشاف دریں محل بیشتر و قوی تر است۔ و بعضے عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است در ذرائر موجودات و افراد ممکنات۔ پس آنحضرت در ذات مصلیاں موجود و حاضر است۔ پس مصلی را باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد و ازیں شہود غافل نبود تا با نوار قرب و اسرار معرفت منور و فائز گردد۔" بلفظہ۔

گو میرے مسلک کے خلاف تھا کہ ان سندات کو پیش کیا جائے لیکن تصدیق اور امید مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بزرگان دین کے اقوال مبارک کو باعث برکت سمجھ کر درج کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کے لیے مفید ہی ثابت ہو گا۔

شاید میرے وہ مسلمان بھائی جنہوں نے محض خشک اور ظنی توحید کے شجر کو تاویل اور بے اصل اعتراض کے میدان میں کھڑا کیا ہے، کہہ دیں کہ یہ ممتنعات سے ہے۔ میں نہایت ادب سے ملتمس ہوں کہ اس ممتنعات سے ان کا مقصود علم ذاتی ہے یا عطائی؟ امید اغلب ہے کہ وہ ذاتی کے علاوہ عطائی کو بھی ممتنعات ہی سے قرار دیں گے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کے لیے کلام الٰہی اظہر من الشمس ہے:

اِنِّیْٓ اَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ	کہ میں تمہارے سامنے بشکل پرندہ مٹی کی مورت بناتا
فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ	ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم
اللّٰہِ ج وَاُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَ	سے سچ مچ کا جانور ہو جاتا ہے۔ اور مادر زاد اندھے

اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ج وَاُنَبِّئُکُمْ	اور کوڑھی کو خدا کے حکم سے تندرست کر دیتا ہوں
بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ	اور مُردے میں جان ڈال دیتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے
فِیْ بُیُوْتِکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً	ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تم کو
لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ہ (۳:۴۹)	بتا دیتا ہوں، اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں
پ۳ - س ۱۳ -	میں تمہارے لیے (قدرت خدا کی) نشانی ہے۔

اب یہ افعال یعنی مُردے کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا، مٹی کا جانور بنا کر پھونک مارنے سے سچ مچ کا جانور بن جانا، اور لوگوں کے کھانوں اور گھروں کے ذخیروں تک سے مطلع کرنا، اگر یہ سب ممتنعات سے نہیں ہیں تو مُردے کو زندہ کرنا اور مٹی سے پرندہ بنا کر روح پھونکنا ضرور ممتنعات سے ہیں اور ہونے چاہییں۔ کیونکہ یہ فعل ذات باری تعالیٰ ہیں جو سوائے اس کے غیر کے لائق نہیں۔ اور جیسے قرآن مجید میں کئی جگہ پہ ذکر ہے۔ مثلاً:

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَآ	اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی۔ نہیں جانتا
اِلَّا ھُوَ ط (۶:۵۹ - پ - س ۱۳	ان کو کوئی مگر وہی۔
اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ	بیشک اللہ کے پاس ہے قیامت کا علم
وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ج وَیَعْلَمُ مَا فِی	اور اتارتا ہے بارش، اور جانتا ہے جو کچھ پیٹ
الْاَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ	پیٹوں ماں کے ہے۔ اور نہیں جانتا کوئی جی
مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِیْ	کہ کیا کمائے گا کل کو۔ اور نہیں جانتا کوئی

نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ؏ (۳۱:۳۴۔ پ ۲۱ ع ۱۴)

نفس کہ کس زمین میں مرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے خبردار ہے۔

ان آیاتِ بیّنات میں اختلاف لاحق ہوا ہے جن کی تطبیق مشکل بھی ہے اور نہایت ضروری بھی۔ کیونکہ مولیٰ کریم اپنے کلام کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ؏ (پ ۵۔ ۸۲)

بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؛ اور اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

یہ آیت مبارک اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ کلام الٰہی میں اختلاف محال ہے۔

اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تصور و تصدیق کے موضوع پر علمائے کرام نے کئی کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن کو منطق کے نام سے موسوم کیا ہے، اور اسی علم کی بساط پہ چھ تصدیقات بیان فرمائی ہیں: تصدیق بالذّات، تصدیق بنعت الذّات، تصدیق بالرّب، تصدیق بنعت الرّب، تصدیق بالحال، تصدیق بالحکم۔ اور تحریر فرمایا ہے کہ ان میں پانچ مردود ہیں اور ایک مقبول:

(۱) تصدیق بالذّات یعنی تصدیق ساتھ ذات کے۔ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ، جیسا تھا ویسا ہی ہے اور اسی طرح رہے گا۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔ بخاری شریف میں وارد ہے کان اللہ ولم یکن معہ شیٔ و ھو الاٰن کما کان۔ سوائے واحد یا ذات کے یہاں بیان ہی نہیں، سوائے ذات کے کسی وصف کا عیان ہی نہیں۔

(۲) تصدیق بنعت الذات، یعنی ان صفات کی نعت یا تعریف جو ذاتیہ ہیں، اور یہ سات ہیں: حیّ، قدیر، علیم، مرید، سمیع، بصیر، کلیم۔ یہ صفات ذاتیہ نہ ذات سے منفک ہوئی ہیں اور نہ ہوں گی۔ ان کو ذات سے اتصال ہے جس کا انفصال ناممکن ہے۔

(۳) تصدیق بالرّب: یہ صفت ربوبیت ہے۔ خواہ اس کا ظہور ہو یا نہ ہو متحقق بالذات ہے یعنی قدرت ربوبیت جو صفت ذاتیہ کے تابع ہے۔

(۴) تصدیق بنعت الرب: یہ صفات فعلیہ سے ہے اور یہ ظہور الی الخلق ہے۔ یعنی ربوبیت کی تعریف سے ہے۔ خواہ جسمانی صورت سے ہو یا روحانی صورت سے۔

(۵) تصدیق بالحال: یہ عبارت حال سے ہے۔ نہ اس سے کوئی کماحقہٗ واقف ہے اور نہ ہونا ممکن ہے۔ یہ ذات باری کی چگونگی سے ہے جو حرام ہے۔

(۶) تصدیق بالحکم: جس کے لیے کوئی طرف چاہیے۔ اس قادر مطلق کی قدرت کا ظہور فی الخلق ہے۔ پہلی صفات خمسہ تو اس لم یزل ولایزال بے نظیر و بے مثال ہی کے لائق ہیں۔ سوائے ذوالجلال والاکرام کے کسی کو قدرت اور طاقت نہیں اور نہ ہی کسی کے لیے روا ہیں اور نہ ہی کبھی کسی کے لائق اور روا ہوں گی اور نہ ہی قبل اس کے کبھی ہوئی ہیں لیکن یہ جو چھٹی صورت ہے یعنی اس کے حکم سے، دراصل یہ فعل خداوندی ہے جو اس کے اذن سے خلق میں برگزیدہ ہستیوں کے لیے مرسل ہوا ہے۔ اسی لیے علم منطق میں اُن پانچوں کو مردود کہا گیا ہے اور اس چھٹی کو مقبول۔ یعنی وہ پانچ واقعی ممتنعات سے ہیں اور یہ چھٹی مقبولات سے جس کا ظہور ہوتا رہا ہے، اور ہے اور ہوتا رہے گا۔ جیسا حضرت عیسیٰ

روح اللہ علیہ السلام کی نسبت اوپر گزر چکا ہے۔

اب جس طرح یہ فعل درحقیقت فاعل حقیقی کے سوا نہیں ہیں اور اسی کی قدرت کا ظہور ہیں۔ منسوب باذنہٖ حضرت عیسیٰ بن مریم (جو اللہ کے بندے اور اس کے فیض اور بلا شک وشبہ مخلوق ہیں) کی طرف ہیں اسی طرح ان صفات کو جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرسل کرنے کے ساتھ مختص بالذات ہوئے ہیں۔ بنظر انصاف ملاحظہ کرنے سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ویسے ہی فرمان باری تعالیٰ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ہے جو تصدیق بالحکم ہی کے مترادف ہے۔ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ رب العالمین نے حضور کی شان میں وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

کا خطاب ارشاد فرمایا ہے جو مذکرہ بالا پانچوں صفات کا اجمال اور نتیجہ ہے تاکہ رحمۃ للعالمین کا مفاد تکمیل کے ساتھ ظاہر ہو کیونکہ جب تک ان اوصاف خمسہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متصف نہ ہوں رحمۃ للعالمین کا عمل دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اور وہ اس لیے کہ رحمۃ للعالمین کی باران رحمت ایک دو عالموں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام عوالم کے لیے ہے۔ جیسے عالم دنیا میں مبشراً و نذیراً کی تعلیم سے، یعنی تسلیم کنندگان کے لیے بشارت اور منکرین کے لیے وعید تاکہ وہ خوف کریں اور اس خوف سے حصول رجوع الی اللہ ہو اور داعیاً الی اللہ اس نعمت عظمیٰ کے لیے جو مقصود فی الدنیا والآخرہ ہے۔ اور سراجاً منیراً ہدایت جو سراسر رحمت او فیض

انوار جو سراپا صبغۃ اللہ کے مترادف ہے، عالمین کے لیے ہے جس سے کوئی عالم بھی محروم نہیں ہے۔ اور مثال اس کی باذنہٖ مثال آفتاب کی ہے جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ عوالم کی تفصیل ہر کہ ومہ پر روشن ہے اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک انسان کے لیے ذاتی ہے اور دوسرا کونی۔ جیسے عالم موجودات، عالم محسوسات، عالم معلومات، عالم معروفات، عالم امر اور ذات باری تعالیٰ میں ذاتی اثرات و حصول کی رو سے ہے۔ اور کونی تمام مخلوقات کے لیے ہے ذاتی عوالم کا حجاب محجوب کے لیے بمنزلہ عذاب دوزخ کے ہے اور اس کا کشف و حصول رحمت اور نعمت عظمیٰ ہے۔ موجودات عالم دنیا ہی کا نام ہے۔ اس میں ایک ادنیٰ رحمت ظاہر ہے کہ پہلی امتوں میں بداعمالیوں کی وجہ سے صورتیں مسخ ہوتی رہیں:

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝ (پ۔۱) ہو جاؤ تم بندر ذلیل

لیکن آج ان سے زیادہ سخت بدکاریاں ہو رہی ہیں مگر صدقہ رحمۃ للعالمین تا قیامت کوئی گروہ اس صورت سے مسخ نہ ہوگا۔

دوسرا عالم برزخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ممد و معاون ہونے کی رو سے مسلمانوں کے لیے رحمت ہیں، اور خاص مومنوں کے لیے فیض و بشارت، ولی کے لیے عطا اور مناسبت رکھنے والوں کے لیے نسبت، جملہ انبیا اور مرسلین کے سید المرسلین، خاتم النبیین، آخر آمد بود فخر الاولین ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ — اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب (میں)

لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ — تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں، پھر جب آئے

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ	تمہارے پاس رسول تمہاری کتاب کی تصدیق کرے
لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ	تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد
ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ	کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے
اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ	اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا؟ انہوں نے کہا
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ	ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ تم اس کے گواہ رہو میں
فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ تو جو اس کے بعد پھر
الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۳: ۸۱-۸۲۔ پ۳۔ س۱۷)	جائیں وہ بدکردار ہیں۔

یہ میثاق ہے جس کا علم سوائے انبیائے کرام کے ثابت نہیں ہو سکتا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ برزخ دو وجہ پر ہے۔ ایک قبل از پیدائش فی الدنیا اور دوسرا ما بعد الموت۔ ان دونوں کا علم مومنین کے لیے میدان دنیا میں ظن کے سوا نہیں۔ جیسے بخطاب مومن فرمایا:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ	اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو
يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ	حالانکہ پیغمبر (خدا) تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے پروردگار
مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝	پر ایمان لاؤ اور اگر تم کو باور ہو تو وہ تم سے اس
(۵۷: ۸۔ پ۲۷۔ س۱۷)	بارے میں عہد بھی لے چکا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس امر پر شاہد ہے کہ محض محل یقین کے سوا اس کا کچھ علم نہیں۔ اس کے علاوہ اور جگہ بھی جس قدر یہ میثاق بیان ہوئے ہیں اسی طرح ہیں۔ صرف انبیائے کرام کا میثاق اَقْرَرْتُمْ اقرار کی رو سے سوالیہ جملہ مولیٰ کریم کی طرف سے اور اَقْرَرْنَا انبیائے کرام سے وعدہ کی رو سے

اس امر کی دلیل ہے کہ مرسلوں کو عالم روحانیت میں عمل سے علم ہے، کیونکہ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی قید ان کے لیے نہیں ہے۔ دوسری صورت اس اقرار کے عمل کی ہے۔ جس کے لیے فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کی وعید ظاہر ہے۔ وہ بھی عالم برزخ ہی سے ہے۔ عام مفسرین اس پر ہیں کہ یہ امر امت کے لیے ہے۔ یعنی ہر ایک نبی اپنی امت کو متنبہ کرتا گیا "تاکہ جونسی امت اس وقت موجود ہو اس پر عمل کرے۔ لیکن اس کے اسباب اس سے بالکل خلاف ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں سوائے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اور کوئی امت تھی ہی نہیں، تو تمام انبیاء کی امتوں کا عمل مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ وہ تاویل ہے جس کے سوا چارہ نہ ہو سکا، یہ وہ تفسیر ہے جو اپنے ضمیر کے محل سے اپنی رائے کے دروازہ پر مکاشف ہوئی۔ ورنہ صاف ظاہر ہے کہ سرے ہی سے میثاق انبیائے کرام سے لیا گیا ہے۔ نہ امت کا ذکر اور نہ وقت پانے کی قید۔ اگر ذرا بھر نظر تعمق سے غور کیا جائے تو یہ سب اشکال حل ہو جاتے ہیں جس کی مثالیں موجود ہیں اور عمل ظاہر جیسے کہ لیلۃ الاسریٰ میں حضورؐ کی مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی امامت لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ کا عمل اور تصدیق ہے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نماز میں تخفیف کرانے کی غرض سے حضورؐ کو بار بار دربار رب العزت میں تشریف لیجاتے کے لیے عرض کرنا وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کے مترادف ہے اور آپ کا یہ استفادہ مشہور و معروف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

یہ دونوں واقعات حدیث شریف کی اکثر کتابوں کے باب فی المعراج میں مذکور ہیں اور چونکہ حدیثیں طویل ہیں اس لیے اختصار کے پیش نظر صرف یہ حصہ بطور تصدیق درج ذیل ہے:

...... وَقَدْ رَأَيْتُنِي فِي جَمَاعَةٍ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ	(حضورؐ نے فرمایا) اور بیشک دیکھا میں نے اپنے تئیں انبیاء
فَإِذَا مُوسٰى قَائِمٌ يُصَلِّي فَإِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ	کی جماعت میں پس ناگہاں موسیٰ کھڑے نماز پڑھتے ہیں پس
جَعْدٌ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوءَةَ وَإِذَا	ناگہاں موسیٰ ایک مرد ہیں میانہ قد گٹھے ہوئے بالوں کے گویا
عِيسٰى قَائِمٌ يُصَلِّي أَقْرَبُ النَّاسِ بِهِ	کہ وہ مردوں شنوءہ کے سے ہیں اور ناگہاں عیسیٰ بھی کھڑے نماز
شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُودٍ الثَّقَفِيُّ فَإِذَا	پڑھتے ہیں نزدیک ترین لوگوں کا ساتھ ان کے مشابہت میں
إِبْرَاهِيمُ قَائِمٌ يُصَلِّي أَشْبَهُ النَّاسِ بِهِ	عروہ بن مسعود ثقفی ہے پس ناگہاں ابراہیم بھی کھڑے نماز پڑھتے
صَاحِبُكُمْ يَعْنِي نَفْسَهُ فَحَانَتِ الصَّلٰوةُ	ہیں مشابہ ترین لوگوں کا ابراہیمؑ سے یار تمہارا ہے یعنی خود حضورؐ
فَأَمَمْتُهُمْ ...... رواہ مسلم۔	پس آیا وقت نماز کا پس امام ہوا میں ان کا (مشکوٰۃ)

دوسری حدیث شریف :

...... ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ خَمْسِينَ	(حضورؐ نے فرمایا) پھر فرض کی گئی مجھ پر نماز یعنی پچاس نمازیں
صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ	ہر دن رات میں پس پھرا میں درگاہ رب سے پس گزرا میں موسیٰ
عَلٰى مُوسٰى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ	علیہ السلام پر پس کہا موسیٰ نے ساتھ کس عبادت کے حکم
أُمِرْتُ بِخَمْسِينَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ	کیا گیا تو کہا کہ حکم کیا گیا ہوں میں ساتھ پچاس نمازوں کے
قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيعُ خَمْسِينَ	ہر دن میں کہا موسیٰ نے کہ یقیناً امت تیری نہیں ادا کر سکے گی
صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّي وَاللّٰهِ قَدْ جَرَّبْتُ	پچاس نمازیں ہر دن میں قسم اللہ کی تحقیق آزمایا ہے میں نے
النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ	لوگوں کو پہلے تمہارے علاج کیسا ہے بنی اسرائیل کا
أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ	سخت علاج کرنا پس پھر جاؤ تم طرف پروردگار اپنے کے

فَسْئَلْهُ التَّخْفِيفَ لِأُمَّتِكَ فَرَجَعْتُ	اور درخواست کرو اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی واسطے اُمت
فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوسٰى	اپنی کے پس پھر گیا میں پس موقوف کیں مجھ سے دس نمازیں
فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا	پس پھر پھرا میں طرف موسیٰ کے پس کہا موسیٰ نے مانند اس
فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ	کلام کے پس پھر گیا میں درگاہ خدا میں پس کم کیں مجھ سے اور
فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوسٰى	دس نمازیں پس آیا میں نزدیک موسیٰ کے پس کہا مانند اس کے
فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا	پس گیا میں پس کم کیں مجھ سے دس نمازیں پھر آیا میں موسیٰ کے
فَأُمِرْتُ بِعَشْرِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ	پاس پس کہا مثل پہلے کلام کے پس پھر گیا میں پس کم کیں مجھ
إِلٰى مُوسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَأُمِرْتُ	دس نمازیں پس حکم کیا گیا میں ساتھ دس نمازوں کے ہر روز
بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلٰى	پس آیا میں موسیٰ کے پاس پس کہا مانند اسی کلام کے پس پھر گیا
مُوسٰى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ	میں پس حکم کیا گیا میں ساتھ پانچ نمازوں کے ہر روز پھر پھرا
بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ	میں موسیٰ کی طرف پس کہا موسیٰ نے کیا ارشاد ہوا میں نے کہا
أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ	حکم کیا گیا میں پانچ نمازوں کا ہر روز کہا موسیٰ نے یقیناً امت
كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّي قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ	تیری نہیں طاقت رکھیں گے پانچ نمازوں کی ہر روز اور تحقیق
وَعَالَجْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ	میں نے آزمایا ہے لوگوں کو پہلے تم سے اور علاج کیا میں نے
فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ التَّخْفِيفَ	بنی اسرائیل کا سخت ترین علاج پس پھر جا طرف رب اپنے کے
لِأُمَّتِكَ قَالَ سَأَلْتُ رَبِّي حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ	اور سوال کر اس سے تخفیف کا اپنی امت کے لیے کہا حضرتؐ نے
وَلٰكِنِّي أَرْضٰى وَأُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ	کہ سوال کیا میں نے اپنے رب سے یہاں تک کہ شرم زدہ ہوا میں لیکن

نَادٰی مُنَادٍ اَمْضَیْتُ فَرِیْضَتِیْ وَ — راضی ہوں میں اور تسلیم کرتا ہوں میں فرمایا حضرت نے پس جب

خَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِیْ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔ — گزرا میں اس مقام سے آواز دی آواز دینے والے نے کر جاری

(بخاری و مسلم۔ مشکوٰۃ باب فی المعراج) — کیا میں نے فرض اپنا اور تخفیف کی میں نے اپنے بندوں سے

عالمِ آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان مومنین کے لیے جن کا اعتقاد صحیح ہوگا، دین کی بنیاد درست ہوگی، ایمان نورِ رسالت سے منور ہوگا شفاعت کی رُو سے رحمت ہوں گے۔ منکرین کے لیے سخت حسرت کا دن ہوگا۔ سب تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ کل انبیاء نفسی نفسی کہیں گے لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُمتی یا ربّ اُمتی کی صدا باذن اللہ تعالیٰ بلند کریں گے۔ آہ! اس دن علمائے سوء جن کے دلوں پر زنگ جم چکا ہے، حرفوں کی سیاہی قلب پر حجاب بن چکی ہے، صرف بظاہر جو بشریت کے لیے اسباب حجاب ہیں، سدِّ راہ ہو چکے ہیں، دیکھ لیں گے اور کہیں گے کہ "کاش! اگر ضد پر نہ اَڑے رہتے تو آج محروم نہ رہتے" مگر بے سود۔ اور وہ اس لیے کہ اس دن کا اسلام و ایمان، تسلیم و ایقان خواہ پہاڑ کے برابر ہو، آج کے ذرہ بھر کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور یہ انکار اور ضد دو وجہ پر ہے۔ ایک علم کی وجہ اور دوسرا جہالت کی رو سے۔ پہلا جو علم کی وجہ پر ہے اگر جان بوجھ کر ہے تو یہ ایسا مرض ہے جس کا علاج ناممکن ہے اور یہ ایسی بلا ہے جو ٹلنے والی نہیں ہے۔ ایسی گمراہی ہے جس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں، ایسی بیگانگی ہے جس کے لیے یگانگی روا ہی نہیں۔ یہ ایسی ضد ہے جو ہٹنے والی ہی نہیں اور ایسی نوشت ہے جو مٹنے والی ہی نہیں، کیونکہ یہ طبیعت کا اصل اور اس کی فرع ہے۔ ابوجہل و ابولہب وغیرہ کفارِ مکہ اور یہود اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر کہا کرتے کہ ہمیں اپنے

بچوں کے اپنے ہونے میں تو یقین نہیں، ممکن ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ہماری عورتوں نے کہیں اور جگہ سے حاصل کیے ہوں، لیکن اس میں شک و شبہہ نہیں کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اپنے دعویٰ میں صادق ہیں لیکن ہم ہرگز ایمان نہیں لا سکتے اور نہ ہی لائیں گے۔ مولیٰ کریم نے شروع کتابِ مبین میں فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ — تحقیق جو لوگ کہ کافر ہوئے برابر ہے اوپر ان کے

ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ — کیا ڈرایا تو نے ان کو یا نہ ڈرایا تو نے ان کو نہیں

لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ — ایمان لائیں گے۔ مُہر کی اللہ نے اوپر دلوں ان کے

وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ — کے اور اوپر کانوں ان کے کے اور اوپر آنکھوں ان

غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ — کی کے پردہ ہے اور واسطے ان کے عذاب ہے

(۲:۶-۷ پ-۱) — بہت بڑا۔

اب یہ ایسا اشکال ہے جو خلافِ سنت اللہ و خلافِ قرآن الحمید اور خلافِ عمل ہے۔ کیوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس حی القیوم کی طرف سے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور ڈرا قبیلے اپنے نزدیک والوں کو۔ پ۱۹۔ ۲۶:۲۱۴) کا فرمان ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حسب الحکم ایک پہاڑی پر تشریف لے گئے اور یا معشر القریش یا معشر القریش کی صدا بلند کی۔ اہلِ عرب کے لیے یہ ایک ایسی آواز تھی جیسے ہر ملک میں کسی مصیبت کے وقت امداد کی غرض سے پکارنا مروج ہے۔ چنانچہ سب لوگ اس پہاڑی کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن آ رہا ہے تو تسلیم کرو گے۔ سب کے سب یک زبان

ہوئے کہ ہم کو معلوم ہے کہ ساری عمر گزشتہ میں آپ نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ ہم آپ کو صادق محمدؐ، امین محمدؐ اور سعید محمدؐ جانتے ہیں اس لیے صرف اس بات کا یقین تو درکنار ہم از روئے تصدیق مسلح ہو کر لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ تب جناب نے بحکم خدا فرمایا کہ مجھے اس قادر ذوالجلال والاکرام نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور تبلیغ توحید کا حکم دیا ہے۔ تم اس پر ایمان لاؤ اور شہادت کے لیے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہو۔ سب کے سب مفرور ہو گئے اور ان میں کا ایک بھی مومن اور مسلمان نہ ہو سکا۔ سب نے انکار فاش کر دیا۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ انکار کی رو سے سب کافر ہی تھے جن کے لیے خَتَمَ اللّٰهُ کا خطاب ہو رہا ہے، اور یہ محال ہے کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اصحاب کبار اور خالد بن ولید جیسے شیر جرّار جن کے بالقول خلافِ اسلام جنگی کارنامے مشہور ہیں، بالآخر مشرف باسلام ہوئے۔ جن کے ذریعہ سے اسلام کا بول بالا ہوا، مشرق سے مغرب تک پرچم اسلام لہرا اٹھا، تواریخ کے اوراق انہی کی جانکاہیوں کے ثنا خواں ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

بعض لوگ خصوصاً عیسائی بے علمی کی وجہ سے قرآن الحکیم پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں جو سراسر لایعنی ہے کیونکہ اس رحیم و ودود نے اپنی سنت کے مطابق رسالت کو خلق کے لیے سرتاپا رحمت بنایا ہے اور دلوں کی تصدیق کے لیے سبیل۔ تو جب تک تصدیق بالقلب نہ ہو جائے رسالت کا کام باقی رہتا ہے۔ اور کفر یعنی انکار کئی وجوہات سے تھا۔ بعض بے قرار کر دینے والے شک میں پڑے ہوئے تھے جن کو مذبذبین بھی فرمایا ہے:

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى — (کم بخت) بیچ میں ہی پڑے لٹک رہے ہیں۔ نہ

هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ (پ ۵۔ ر ۱۸) — ان کی طرف ہوتے ہیں نہ اُن کی طرف۔

بعض اپنے سرداروں اور قبیلوں کے سبب سے انکار کر رہے تھے۔ بعض ڈر کے مارے اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکتے تھے:

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ — اور اگر نہ ہوتے مرد مسلمان اور عورتیں مسلمان

مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ — نہیں جانتے تم ان کو یہ کہ کچل ڈالو تم ان کو پس

فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ — پہنچ جائے تم کو ان سے ایذا بے خبر۔

(۴۸ : ۲۵ - پ ۲۶ - ر ۱۱)

اور بعض ایسے تھے جن کا ایمان دنیوی عزت کے بحر ظلمات میں غرق ہو رہا تھا۔ ولید بن مغیرہ کا قصہ اسی کے مترادف ہے۔ لیکن ان سب صورتوں میں ختم اللہ کا عمل جاری نہ ہوا۔ خَتَمَ اللّٰهُ صرف ان کافروں کے لیے مخصوص ہے جن کے دلوں نے تسلیم کر لیا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ واقعی یہ خدا کے سچے پیغمبر حق لے کر آئے ہیں۔ دیکھو فرمان ایزد متعال فرعون اور اس کی قوم کی نسبت کس زور سے شاہد ہو رہا ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ — ان کے دلوں نے تو ان کا یقین کر لیا مگر انھوں نے

ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ (۲۷ : ۱۴۔ پ ۱۹ - ر ۱۰) — بے انصافی اور غرور سے انکار کیا۔

تو مان لینے یا خفیہ ایمان لانے اور تصدیق قلب ہو جانے کے بعد ضد اور غرور سے انکار کرنا خَتَمَ اللّٰهُ کا سبب ہوتا ہے۔ کیونکہ اب رسالت کا کام ختم ہو چکا، تصدیق جو رسالت کا حق تھا ادا ہو چکا۔ اب ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا مساوی ہو گیا۔ مطابق آیاتِ بیّنات اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ

عَلَیْھِمْ صراط المستقیم سے اعراض کرنے والوں، حق کو پہچان کر اعراض کرنے والوں، دنیا کی زندگی کو آخرت کی حیاتی پر ترجیح دینے والوں کو آگاہ کرنے کے لیے، اعتراض کو رفع کرنے کے لیے، اختلاف کلام کو مٹانے کے لیے، ہوائے نفس میں غرق شدہ کو بچانے کے لیے، اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کی خواب سے جگانے کے لیے، تطبیق قرآن مجید کے سلجھانے کے لیے کیا ہی اچھا اور بیّن فیصلہ دیا ہے:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ	بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش
اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی	کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے
سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ	(گمراہ ہو رہا ہے تو) خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور
غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ	اس کے کانوں اور دل پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں
اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۲۵ - ع ۱۹)	پر پردہ ڈال دیا۔ پس کون ہدایت کرے گا اس کو پیچھے

لیکن یہ ان لوگوں کی نسبت ذکر ہے جنھوں نے جان بوجھ کر ضد اور غرور کی رُو سے انکار کیا اور اپنی خواہش کے پردہ میں محجوب رہنے کی وجہ سے کافر ہی رہے۔ سوائے اس کے ان کو مزید علم حاصل نہ ہوا اور نہ ہی اسلام کی برکات اور نور ایمانی سے حصّہ ملا۔

دوسرا انکار جہالت کی وجہ سے ہے جو اہل اسلام کی طرف سے پیدا ہوا ہے اور اس میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو قرآن مجید اور احادیث شریف کے اختلافات کی تطبیق سے عاجز ہیں۔ چونکہ انسانی قاعدہ ہے کہ جس چیز سے اس کو حصہ نہ ہو جس کی نسبت اس کے قلب میں اثر نہ رکھتی ہو، مطابقت و مناسبت کا ظہور اس کی زبان سے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ لیکن

ان کا نور ایمانی کسی طرف حکم لگانے کے لیے مقتضی نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں وہ کسی مؤاخذہ کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن آج کل یہ لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اثبات توحید کے لیے حق و ناحق دونوں کا انکار کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید و حدیث شریف سے بجائے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم

بیان کرنے کے نفی علم کی آیات و احادیث منتخب کرتے ہیں۔ اور گستاخانہ و بے باکانہ کلماتِ خبیثہ سے اپنے انکار پر مُصر ہیں۔ طبقۂ جُہلا نے بوجہ مطابقت و مناسبت ان سے موافقت کر رکھی ہے۔ اور ان کے اقوال کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سوائے وحی جلی کے کچھ بھی علم نہ تھا" حالانکہ یہ مطابق:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے
اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	بات کرے مگر الہام کے ذریعے سے یا پردے
اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ	کے پیچھے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے
مَا یَشَآءُ ؕ (۴۲: ۵۱ - پ ۲۵ - ع ۶)	حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔

نص کے خلاف ہے۔

نیز رحمۃ للعالمین خاصہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (سخت تعجب ہے حیرانگی ہے کہ) کس قدر سخت انکار ہے۔ امید اغلب بلکہ یقین ہے کہ وہ رحمۃ للعالمین خاصہ رب العالمین تو مانتے ہی ہوں گے، اور یہ بالکل درست ہے۔ لیکن توسل اور اسباب کا انکار مسبب کا انکار ہے۔ اور

تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ مناظرہ (جو آج مجادلہ اور مکابرہ کی صورت اختیار کرچکا ہے) کا نتیجہ اور ثمر ہے۔ کیونکہ مجادلہ اور مکابرہ میں خواہ ایمان بھی نہ رہے پرواہ نہیں کی جاتی۔ یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ۔

اس میں شک نہیں کہ انبیائے کرام کے حال سے عام مومنین تو درکنار کسی ولی اللہ کو بھی کما حقہٗ علم نہیں ہے۔ لیکن جن کو اس آفتاب نبوت سے (خواہ ذرہ کی مقدار ہی کیوں نہ ہو) روشنی نصیب ہوئی ہے وہ تسلیم ہی کریں گے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اکسیر ہدایت (کیمیائے سعادت) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ ظاہری علم مانند تالاب کے ہے اور باطنی مثل چشمہ کے جو زیر زمین ہے جب تک تالاب کا پانی نکال نہ دیا جائے اور اس کو نیچے سے کریدا نہ جائے، چشمہ کا پانی آنا محال ہے"۔

بھائی! علم اجمالی صورت کے لحاظ سے تین نوع پر منقسم ہے۔ ایک ظاہری جس میں عوام و خواص سب مشترک ہیں۔ جیسے آیات محکمات، احکام اوامر و نواہی، بشارت و نذارت وغیرہم۔ دوسرا علم باطنی ہے جو صرف خاصوں کا حصہ ہے، عوام اس کے حامل نہیں ہوسکتے اور تیسرا علم وہ ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان ہے۔ نہ تو اس کا ذکر عام سے ہوسکتا ہے اور نہ خاص سے۔ پہلا ظاہر علم سے ہے، دوسرا علوم باطنیہ سے، اور تیسرا اسرار الٰہیہ سے ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو علم سیکھے۔ ایک تو وہ ہے جو بظاہر ہے۔ اور دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اس کو ظاہر کروں تو میری رگ گردن کاٹ دی جائے[1]۔ معاملات کی رو سے عمل اسی پر ہے جب الحکم

[1] یہ حدیث شریف ؐ ؍ پر درج کی گئی ہے ۱۲

ذوالجلال والاکرام حسب استعداد ہر ایک کو تعلیم ہوئی، اور یہ سنت اللہ اسی طرح جاری ہے اور جاری و ساری رہے گی۔ اسی معاملہ کی وجہ سے بالکل ظاہر کے میدان میں دوڑنے والوں کو اعتراضات کا موقع ملا، اور اسی وجہ سے انھوں نے انبیاء اور اولیاء کے حال کو اپنے حال کی مانند سمجھا۔ اسی لیے ان کا علم ان کے لیے حجاب اور سدِ راہ ہوگیا اور جہالت کے باعث ان کو انکار ہی آسان معلوم ہوا۔ چنانچہ اعتراضات کے ڈھانچے میں ایسے اشکال پیدا کردیے جو بالکل لایعنی ہیں۔ مثلاً حدیث شریف تنام عینای ولاینام قلبی کے جواب میں کہا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل زندہ ہوتا تو لیلۃ التعریس کے موقع پر مع صحابہ کرام آپ کی نماز فجر قضا نہ ہوتی ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم! کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

اگر کوئی آریہ یا نصرانی یہ اعتراض کرتا تو اُسے زیبا بھی تھا لیکن تف ہے ایسی مسلمانی پر جو اپنے پیغمبر کی زندہ دلی کی بھی قائل نہیں۔

عزیز من! اگر کچھ نور ایمانی ہے تو اس کے لیے یہی حدیث شریف کافی ہے کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ اور آپ کی نیند ناقض وضو بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ تو ایسی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز نہ قضا ہوئی نہ ہوسکتی تھی، اور یقیناً آپ نے پڑھی ہے[1]۔ یہ واقعہ حدیث شریف میں ان الفاظ سے ذکر ہوا ہے:

عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ عَرَّسَ رَسُوْلُ	روایت ہے زید بن اسلم سے کہا کہ اترے رسول خدا
اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃً بِطَرِیْقِ	صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیچ آخر رات کے مکہ کے راہ میں

[1] یہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۷۲ پر درج ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

مَكَّةَ وَوَكَّلَ بِلَالًا أَنْ يُوقِظَهُمْ لِلصَّلٰوةِ فَرَقَدَ بِلَالٌ وَرَقَدُوا حَتّٰى اسْتَيْقَظُوا وَقَدْ طَلَعَتْ عَلَيْهِمُ الشَّمْسُ فَاسْتَيْقَظَ الْقَوْمُ فَقَدْ فَزِعُوا فَأَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَرْكَبُوا حَتّٰى يَخْرُجُوا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِي وَقَالَ إِنَّ هٰذَا وَادٍ بِهٖ شَيْطَانٌ فَرَكِبُوا حَتّٰى خَرَجُوا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِي ثُمَّ أَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَنْزِلُوا وَأَنْ يَتَوَضَّئُوا وَأَمَرَ بِلَالًا أَنْ يُنَادِيَ لِلصَّلٰوةِ أَوْ يُقِيْمَ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدْ رَأٰى مِنْ فَزَعِهِمْ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَنَا وَلَوْ شَاءَ لَرَدَّهَا إِلَيْنَا فِيْ حِيْنٍ غَيْرِ هٰذَا فَإِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ أَوْ نَسِيَهَا ثُمَّ فَزِعَ

اور حکم کیا بلال کو یہ کہ جگا دے ان کو واسطے نماز کے پس سو گیا بلال اور سو گئے لوگ یہاں تک کہ جاگے اس حال میں کہ تحقیق طلوع ہوا ان پر آفتاب پس جاگے لوگ پس تحقیق گھبرائے پس حکم کیا ان کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ سوار ہوں یہاں تک کہ نکلیں اس جنگل سے اور فرمایا تحقیق یہ جنگل ہے کہ مسلط ہے اس میں شیطان پس سوار ہوئے حتی کہ نکلے اس جنگل سے پھر حکم کیا ان کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ اتریں اور وضو کریں اور حکم کیا بلال کو کہ اذان کہے واسطے نماز کے اور تکبیر کہے پس نماز پڑھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ لوگوں کے پھر پھرے اور دیکھی گھبراہٹ ان کی پس فرمایا اے لوگو! تحقیق اللہ نے قبض کی تھیں روحیں ہماری اور اگر چاہتا البتہ پھیرتا ان کو طرف ہماری بیچ غیر اس وقت کے پس جس وقت کہ سو جائے ایک تمہارا نماز سے یا بھول جائے نماز سے پس گھبرائے طرف اس کی پس چاہیے کہ پڑھے اس کو جیسا کہ تھا پڑھتا اس کو وقت اس کے میں پھر التفات کی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے طرف ابی بکر صدیق کے پس فرمایا تحقیق شیطان آیا بلال کے پاس اور

إِلَيْهَا فَلْيُصَلِّهَا كَمَا كَانَ يُصَلِّيْهَا فِيْ وَقْتِهَا ثُمَّ الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ فَقَالَ إِنَّ الشَّيْطٰنَ أَتٰى بِلَالًا وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فَأَضْجَعَهُ ثُمَّ لَمْ يَزَلْ يُهَدِّئُهُ كَمَا يُهَدَّأُ الصَّبِيُّ حَتّٰى نَامَ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَالًا فَأَخْبَرَ بِلَالٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ الَّذِيْ أَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَا بَكْرٍ فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا

وہ کھڑا نماز پڑھتا تھا پس تکیہ لگوایا اس کو۔ پھر بڑی دیر تک تھپکتا رہا اس کو جیسے کہ تھپکا جاتا ہے لڑکا یہاں تک کہ سو یا وہ۔ پھر پکارا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلال کو پس خبر دی بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانند اس چیز کی کہ خبر دی تھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پس کہا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گواہی دیتا ہوں میں یہ کہ بیشک آپ رسول ہیں اللہ کے۔ روایت کی یہ مالک نے بطریق ارسال کے۔ (مشکوٰۃ)

دیکھیے! خود اسی حدیث شریف سے جو نفی علم کے لیے پیش کی جاتی ہے، صاف ظاہر ہے کہ آپ اس حال میں بھی سب حالات سے باخبر اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر شیطان کے تصرف سے ایسا علم رکھتے تھے کہ گویا آپ دیکھ رہے ہیں اور اسی اطلاع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی تصدیق رسالت کو دوہرایا۔ لیکن با ایں ہمہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ نماز ادا کی اور وہ اس لیے کہ حکم ظاہر شریعت کے مطابق ہے حال پر نہیں۔ صاحب حال کو حسب استعداد خواہ مخواہ تقلید حاصل ہوا کرتی ہے۔ لیکن جو صاحب حال نہ ہو اس کے لیے حال کی تقلید حرام ہے۔ اگر حضورؐ نماز ادا نہ کرتے تو صاحب حال کے لیے

حجت ہو جاتی، سنت بن جاتی اور ان جہلا کے لیے دلیل بن جاتی جو آج اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم ہر وقت نماز ہی میں رہا کرتے ہیں[۱]۔ اور ایک حکمت اس میں یہ تھی کہ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو عوام کے لیے نیند کی حالت میں نماز کا وقت گزر جانے کی صورت میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔

نفی علم میں ایک ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ "حضورؐ پوچھتے تھے" یہ کھجور صدقہ کی ہے یا نہیں"؛ سو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر آپ کو علم ہوتا تو کیوں دریافت فرماتے۔

اس کے جواب کے لیے مولیٰ کریم کے کلام پاک نے ہم کو آزاد کر دیا ہے یعنی جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو وادیِ مقدس میں ذات باری تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف بخشا گیا تو اس عزیز الحکیم علیمؐ بذاتِ الصُّدُورِ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت فرمایا:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ○ قَالَ هِيَ عَصَايَ ؕ (۲۰: ۱۷-۱۸۔ پ ۱۶)

اور موسیٰ! تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا یہ میری لاٹھی ہے۔

تو اس سے نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ یہ لازم آتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ کو خبر ہوتی تو کیوں دریافت

[۱] خیال ہے کہ شاید عوام اس لطیف اشارہ کو نہ سمجھ سکے ہوں لہٰذا اس کی تفہیم کیلیے مثالاً ایک واقعہ نقل کرتا ہوں: حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "ایک دفعہ ہم اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے اور اثنائے سفر میں آپ گاڑی پر استراحت فرما رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آیا تو ہم نے نماز ادا کر لی اور اعلیحضرت کو مطلع کرنے کی کسی نے جرأت نہ کی لیکن جب نماز کا وقت تنگ ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا تو ہم نے قدرے بلند آواز سے اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا۔ آپ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا "نماز تو ہم پڑھ چکے ہیں لیکن ظاہرًا ادا کرنا بھی ضروری ہے"۔ چنانچہ آپ نے وضو فرما کر نماز ادا کی" اب ہم اس حالی کیفیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے تاوقتیکہ صاحب حال نہ ہو جائیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب امت کے متاخرین میں سے ایک صاحب حال کی یہ کیفیت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم جن کی شان یہ ہے کہ تنام عینا ی ولا ینام قلبی، بلکہ آپ نے حضرت بلال کی کیفیت بھی اسی حال میں معلوم کر لی تو یقین ہے کہ آپ نے اپنے حال میں ضرور نماز ادا کر لی ہو گی۔ لیکن چونکہ حالی کیفیات کا اظہار عوام کے سامنے منع ہے اس لیے علی الاعلان ذکر نہ فرمایا اور صاحب حال خود بخود سمجھ جاتے ہیں کَمَا ذُکِرَ (کاتب)

فرماتے"؟ —— اے بھائی! اس مالک کون و مکان سے خوف کرنا چاہیے کہ اس کی غیرت کی شمع ہر وقت جل رہی ہے، مبادا تیرے پروانۂ ایمان کو جلا کر راکھ نہ کر دے۔

میرے عزیز! پہلے گزر چکا ہے کہ مطابق سنت اللہ علم تین نوع پر منقسم ہے۔ ایک ظاہری جس کا حکم ظاہر کی طرف ہے۔ دوسرا باطنی جس کا حکم بطن کی جانب ہے۔ اور تیسرا جس کا حکم نہ ظاہر کی طرف ہے نہ باطن کی طرف، اور وہ معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بس ہے۔ چونکہ اس کا حکم ظاہر کی طرف تھا اس لیے باوجود جاننے کے فرمایا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ جس سے مقصود تصدیق اور علم حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھا، نہ اپنی ذات کے لیے علم، جو رفع جہالت کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اور مفاد اس کا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خوب جان لیں کہ میرا عصا ہے۔ پھر حکم دیا اَلْقِ عَصَاكَ۔ جب ڈال دیا تو وہ اژدہا بن گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے فرمایا خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى۔ یعنی ڈرو نہیں بلکہ اسے پکڑ لو۔ ہم اس کو اپنی اصلی پہلی حالت پر جس سے آپ کو تصدیق اور علم کرا چکے ہیں، لوٹا دیں گے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کا دریافت فرمانا تصدیق علم غیر کے لیے تھا۔ اور مفاد اس میں یہ تھا کہ میری طرف سے حدیث ہو۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کھجور صدقہ سے ہے یا نہیں؟ اور فرمایا کہ یہ اہل بیت پر حرام ہے تاکہ تفصیل کے ساتھ تا قیامت دلیل ہو۔

نیز واقعۂ افک کے متعلق جو بے سمجھ اعتراض رکھتے ہیں کہ "اگر حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کو خبر ہوتی تو آپؐ اس قدر پریشان نہ ہوتے"۔

اگر ضمیر کے ترازو میں کچھ بھی ایمان وزن رکھتا ہو تو بالکل عیاں ہے کہ آپ کی پریشانی محض انتظارِ وحی کے لیے تھی۔ اور دوسرے اس بہتان کی وجہ سے تھی جو افترا پردازوں نے بے دلیل غل مچا رکھا تھا، بلا ثبوت شور برپا کر رکھا تھا جس کی نفی بعد میں بڑے غیظ و غضب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام پاک کی سورۂ نور کے دو رکوع میں کی گئی۔ اگر آپ کو علم کی بنا پر تسلی و تشفی نہ ہوتی تو اس بہتان کے سبب سے جو عوام میں محلِ یقین تک پہنچ چکا تھا، آپ کی غیرت فوراً طلاق کی مقتضی ہوتی۔ لیکن بخلاف اس کے حدیث شریف میں اس طرح بیان ہے کہ:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کون ہے
من یعذرنی من رجل بلغنی اذاہ	یا کوئی ایسا ہے جو اس کا بدلہ لے اس آدمی سے
فی اھلی فواللہ ما علمت فی اھلی الا	جس نے میری اہل (بیوی) کی بابت مجھے ایذا دی
خیرا وقد ذکر رجلا ما علمت علیہ	ہے پس قسم ہے اللہ کی کہ مجھے اپنی بیوی کی بابت
الا خیرا۔ (بخاری۔ کتاب الشہادات۔ باب	علم ہے کہ وہ نیک اور پاک ہے اور جس مرد (صفوان)
تعدیل النساء)	کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی پاک ہے۔

آپ کی غیرت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اُمہات المومنین کا ذرا سا خیال زینتِ دنیا کی طرف مبذول ہونے سے کیا کچھ ہوا تھا حتیٰ کہ آپ نے مہینہ بھر کے لیے ایلا کیا اور مشہور ہو گیا کہ شاید آپ نے طلاقیں ہی دے دی ہیں۔ قرآن مجید، حدیث شریف، اور کتب سیر و تاریخ سب اس پر شاہد ہیں۔

العلم حجاب الاکبر کے طوفان میں غرق اور حقیقت سے بے بہرہ، روشنی کو اندھیرا اور

اندھیرے کو روشنی سمجھنے والے، کفر کو اسلام اور اسلام کو کفر جاننے والے صاحبان قرآن مجید میں سے نفی علم غیب کی دلیل ثابت کرنے کے لیے بالخصوص سورۂ یوسف کو اپنا معیار قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے خیال سے تفسیر کرتے ہوئے، شیطان کو اپنا معاون و مددگار پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر حضرت یعقوب علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علمِ غیب من اللہ ہوتا تو اتنا عرصہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہجر و فراق میں کیوں روتے رہتے۔"

افسوس! اگر انصاف کو مدنظر رکھتے اور نورِ ایمانی کا ایک ذرہ بھی روشن ہوتا تو حقیقت سے اندھوں کو صاف نظر آجاتا کہ یہ سورۃ نفی نہیں بلکہ انبیاء کو من اللہ علم غیب ہونا ثابت کر رہی ہے۔ لیکن بقول شاعر ے

ہرگز بہ کعبہ نرسی اے اعرابی!　　کیں راہ کہ میروی بترکستان ست

کے مصداق بن کر الٹ سمجھ رہے ہیں۔

مولیٰ کریم اپنا فضل و کرم فرما کر اگر ہدایت کی طرف راہ نمائی فرمائیں تو شروع قصہ ہی سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیٹوں نے سوال کیا کہ یوسف (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو ہمارے ساتھ سیر و شکار کے لیے روانہ فرمائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو آگے چل کر وہ بہانہ کرنے والے تھے یعنی حضرت یعقوبؑ نے اشارۃً ان کو ان کے ارادہ سے مطلع فرما دیا۔ گویا آپ کا آئندہ کی خبر سے خبردار ہونا قرآن شریف سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے:

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَن تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ　　انہوں نے کہا کہ یہ امر مجھے غمناک کر دیتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ

اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ○ (۱۲-۱۳- پ۱۲ - ع۱۲)

اور مجھے یہ بھی خوف ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

چنانچہ بیٹوں نے آ کر یہی جواب دیا:

قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ج (۱۲:۱۷ - پ۱۲ - ع۱۲)

کہنے لگے کہ ابا! ہم تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو دوڑنے لگے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔

پھر بیٹوں کا یہ بہانہ:

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ط

کہ ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا لہو بھی لگا لائے

دیکھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ فرمایا:

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط (۱۲:۱۸ - پ۱۲ - ع۱۲)

کہا یعقوب علیہ السلام نے بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات بنائی ہے۔

اب ان آیات بینات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہر صاحبِ عقل ضرور تسلیم کرے گا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو اس بات سے آگاہ کیا جو ابھی ہونے والی تھی اور پھر یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کے کھانے کی خبر سُن کر حضرت یعقوب علیہ السلام کا بنائی ہوئی بات جاننا من اللہ علمِ غیب پر مطلع ہونے کی صریح دلیل ہے۔

۲۔ برادرانِ حضرت یوسفؑ کا بن یامین کو بموجب حکمِ عزیزِ مصر میں لے جانا، اور وہاں چوری کے الزام میں پکڑا جانا، اور برادرانِ یوسفؑ کا باپ کو آ کر بتانا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فرمانا، اور بن یامین کو اس اتہام سے پاک جاننا، ہر صاحبِ دانش اس بات سے اندازہ کر سکتا ہے کہ سوائے علم کے پیغمبر کی زبان سے جو مسلمانوں کے عقائد کی رُو سے معصوم ہیں ایسی بات بالکل نہیں نکل سکتی۔

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ برادرانِ یوسف تو اس مقدمہ میں بالکل بے گناہ بلکہ بے خبر تھے۔ اس لیے صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حال سے آگاہی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تدبیر سے کوئی حجاب نہ تھا۔ اور آپ کا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فرمانا انہی کے حق میں تھا۔

۳۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا:

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ط (۱۲:۸۳ - پ۱۳ - ع۴)

پس صبر بہتر ہے بشتاب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو اکٹھا۔

اور اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۱۲:۸۶ - پ۱۳ - ع۴)

میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

فرمانا۔ ان آیات قرآنی کو بنظرِ نورِ ایمانی ملاحظہ کیا جائے تو ہر ذی عقل اور صاحبِ حیا کو ماننا پڑے گا کہ حضور کو بعطائے الٰہی حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق پورا علم تھا۔

۴۔ حضور کا بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور بن یامین کی تلاش کے لیے بھیجنا اور

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے ناامید

اللّٰہِ ؕ (۱۲: ۸۷۔ پ۱۳۔ ع۴) نہ ہو۔

فرمانا کیا یہ لاعلمی کی دلیل ہے؟ باوجودیکہ بیٹوں نے صاف عرض کر دیا تھا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کو بقول مخالف حضرات لاعلمی تھی تو بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور بن یامین دونوں کی جستجو میں بھیجنا چہ معنی دارد؟ اب انکار کا موقع ہر اس صاحب ایمان کو جسے کچھ خوفِ خدا ہے نہیں مل سکتا۔

۵۔ پھر جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو آپ نے فرمایا:

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ	کہ اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے تو
اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ؕ (۱۲: ۹۴۔ پ۱۳۔ ع۵)	مجھے یوسف کی بو آ رہی ہے

چنانچہ جب بشیر نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص لا کر روئے مبارک پر ڈالا تو آپ بینا ہو گئے اور فرمایا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ	کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ میں خدا کی
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ؕ (۱۲: ۹۵۔ پ۱۳۔ ع۵)	طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

صاف نظر آتا ہے کہ ریحِ یوسف کا دور دراز مسافت سے معلوم ہونا اور آپ کا یہ برملا کہہ دینا کہ میں اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے علم کی واثق دلیل ہے۔

۶۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قمیص دے کر بشیر کو روانہ کرنا اور فرمانا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰی	یہ میرا قمیص لے جاؤ اور اسے والد صاحب کے منہ
وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ (پ۱۳۔ ع۴)	پر ڈال دو تو وہ بینا ہو کر آ جائیں گے۔

اس آیتِ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تھا کہ جب کرتہ منہ پر ڈالا جائے گا تو آپ بصیر ہو جائیں گے اور اس سے انکار کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔ تو ثابت ہوا کہ علم غیب پیغمبروں اور نبیوں کو مولیٰ کریم عطا فرماتے ہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ علم غیب کی نفی کرنے والے صاحبان نبیوں اور رسولوں کے حال کو اپنی حالت پر متصور کرتے ہوئے محض اسی ضد پر رہ کر اصل معاملہ سے اعمیٰ اور ناواقف ان بزرگ ہستیوں پر اپنے ضمیر کو مدِنظر رکھتے ہوئے اعتراض کرتے وقت حیا سے کام نہیں لیتے ورنہ ہر اہل ایمان کے لیے یہ بات عیاں ہے کہ نبی اور مرسل تو درکنار اولیاء اللہ بھی مامور ہوتے ہیں اور باوجود علم ہونے کے حکم خداوندی سے ایک قدم بھی باہر نہیں چل سکتے۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات کو ہی ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کی نسبت کوئی اشکال نہ رہ جائے گا۔ ایک لمحہ کے لیے فرض کر لیا جائے کہ یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی نسبت علم نہ تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام کو تو اباجان کی نسبت بخوبی علم تھا۔ مانا کہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے غلامی کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے یا قیدی ہونے کی وجہ سے معذور تھے اور خبر نہ دے سکتے تھے۔ لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی خبر تک نہ کی۔ بلکہ جب برادران غلہ لینے کی غرض سے مصر میں تشریف لائے تو بھی اطلاع نہ دی اور نہ ہی والد (یعقوب علیہ السلام) کو کوئی پیغام بھیجا۔ صرف دوبارہ آتے وقت بھائی (بن یامین) کو ہمراہ لانے کی تاکید کر دی۔ پھر جب حضرت بن یامین ہمراہ تشریف لائے تو پھر بھی رخصتی کے وقت بھائیوں سے یہ نہ کہا کہ بن یامین میرا بھائی ہے اسے میرے

پاس رہنے دو، بلکہ ان کو اپنے پاس رکھنے کے لیے بحکم الٰہی یہ تدبیر کی کہ صواع الملک یعنی بادشاہ کا پیمانہ (پانی پینے کا پیالہ) چپکے سے ان کے رحل میں رکھ دیا۔ جس کے متعلق مولیٰ کریم، عزیز الحکیم فرماتے ہیں:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ	اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے یہ تدبیر کردی
لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ	ورنہ وہ اپنے بھائی کو شاہی قوانین کے لحاظ سے
اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۱۲: ۷۶۔ پ۱۳۔ ع۳)	اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ من اللہ اظہار کی اجازت ہی نہ تھی۔ اور جب احکم الحاکمین کی طرف سے اجازت ہوگئی تو فوراً بتا دیا کہ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ۔ ہاں میں یوسف علیہ السلام ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اور فرمایا:

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (پ۱۳۔ ع۴)	اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔

ان امور سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مامور من اللہ نبی مرسل اور اولیاء اللہ باوجود علم ہونے کے حکم خداوندی کے سوا اظہار نہیں کر سکتے۔ تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی شان تمام انبیاء سے ارفع واعلیٰ ہے، بلکہ تمام انبیاء آپ کے مقابلہ میں امتی کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کے علم پر گفتگو کرنا اور اعتراض کرنا کہ آپ کو علم نہ تھا، سراسر نادانی اور جہالت ہے۔

اے بھائی! انکار کا تو کوئی علاج ہی نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب پر احادیث تو درکنار نص قطعی یعنی کلام اللہ سے کافی شہادت ہے۔ اگر کچھ صراط المستقیم کی ضرورت

اور حق کی طلب ہے، اگر کچھ خوف خدا ہے تو ضد کو چھوڑ کر پنبہ غفلت کو دل کے کانوں سے نکال دے اور چشم بصیرت کو کھول کر دیکھ کہ مولیٰ کریم کیا ارشاد فرما رہے ہیں:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ	اور ہمیشہ رہے گا تو خبردار ہوتا ان کی خیانت
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ	سے مگر تھوڑے ان میں سے پس معاف کر ان
وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ	اور درگزر کر۔ بے شک اللہ دوست رکھتا ہے
(۵: ۱۳۔ پ۶۔ ع۷)	احسان کرنے والوں کو۔

اور فرمایا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا	اے اہل کتاب! بیشک آیا ہے تمہارے پاس
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ	رسول ہمارا۔ بیان کرتا ہے واسطے تمہارے بہت
مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ قَدْ	اس چیز سے کہ تھے تم چھپاتے کتاب میں سے
جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ	اور درگزر کرتا ہے بہت سے۔ بیشک آیا تمہارے
مُّبِيْنٌ ۝ (۵: ۱۵۔ پ۶۔ ع۷)	پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب بیان کرنے والی

دوسری جگہ سورۂ تحریم میں فرمایا:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ	اور جب نبی نے چھپا کر اپنی بعض بی بی سے ایک
حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ	بات کہی پھر جب اس بی بی نے خبر دی اس بات
اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ	کی اور خدا نے اس حال سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا تو
عَنْۢ بَعْضٍ ۚ (۶۶: ۳۔ پ۲۸۔ ع۱۹ تحریم)	پیغمبر نے کچھ تو جتائی اور کچھ نہ بتائی۔

یہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ مولیٰ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کو منافقین کے تمام مخفی رازوں، شرارتوں اور خیانتوں سے مطلع تو کر دیا لیکن آپ نے مناسب صورت حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ تو اظہار فرما دیا اور جو اظہار کے قابل نہ تھا اس کو مخفی ہی رکھا۔

قرآن مجید کا نزول کئی وجہ پر ہوا ہے اور کئی نوع پر منقسم ہے۔ ان سب صورتوں کا اجمالی بیان تین طرح پر واضح ہے جن کا عمل مختلف ہے: محکماتؔ، متشابہاتؔ اور مقطّعات۔

(۱) مُحکمات: جن کے متعلق ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰب فرمایا گیا ہے۔ اس حصہ کا حکم بظاہر احکام پر مبنی ہے۔ یعنی اوامر و نواہی، حلال و حرام، معاملات، جزا و سزا فی الدنیا و فی الآخرہ ہے۔ جس کے معانی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عمل کے میدان میں کچھ اختلاف ہے جس کا مفاد اس کے وجودی عمل کے اثبات پر ہے۔ خواہ فرع آپس کی ضد کے باعث بلائے جان اور سدِّ راہ ہی کیوں نہ ہو جائے اصل کے خلاف کا مقتضی نہیں ہو سکتا۔

(۲) مُتَشَابِھَات: جن میں کئی معنوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ	اور متشابہات بھی ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں
فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا	میں کجی ہے وہ تو متشابہات کے درپے ہوتے
تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَ	ہیں کہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ
ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ	لگائیں اور مراد اصلی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں
اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ	جانتا۔ اور جو لوگ علم میں مضبوط ہیں، وہ

یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ	کہتے ہیں ایمان لائے ہم ساتھ اس کے ہر ایک ہمارے
رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا	رب کے پاس سے ہے۔ اور عقل والے لوگ ہی
الْاَلْبَابِ ۝ (۳:۷۔ پ۳۔ ع۹)	نصیحت پکڑتے ہیں۔

(۳) مقطّعات: ان کے معانی کو سوائے حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اور آپ کے خاص الخاص متبعین، بندگانِ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

محکمات تو عوام کے لیے ہے اور متشابہات خواص کے لیے جن پر منجانب اللہ علم کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جیسے واقعہ معراج، حضرت آدمؑ کی جنت میں سکونت، شجرہ ممنوعہ و ہبوط و مثلہا۔ لیکن مقطّعات خاص الخاص مرسلین کے لیے ہے۔ جیسے فرمایا:

فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی ۝	پس وحی کی اپنے بندے پر جو وحی کی

غور کیجیے، باوجود تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ ہونے کے یہاں اجمالاً بھی ذکر نہیں فرمایا گیا۔

اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں کہ یہ کتاب اللہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ یعنی ہر ایک چیز کو بیان کرنے والی ہے لیکن یہ کہاں ثابت ہے کہ سب کے لیے یکساں ہے، سب کے لیے مساوی تو محکمات بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ علمائے ظاہر سند حاصل کر کے دستارِ فضیلت باندھ کر اپنے فکر کے دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد ایک دوسرے کے سخت مخالف ہو رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ
تَقَاصَرُ عَنْہُ اَفْھَامُ الرِّجَالِ

اے بھائی! مولیٰ کریم اپنے فضل و کرم سے تجھے صحیح فکر اور نیک سمجھ عطا فرمائیں،
قرآن حکیم عوام کے لیے تو قال ہی ہے لیکن حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ
کے خاص الخاص متبعین نسبت محمدی سے فائزین کے لیے صدر و حال۔ کیوں نہ ہو۔ یہ کلام
اس رب العلمین کا ہے جو علیم بذات الصدور ہے۔ اس لیے اس کا شان نزول دو وجہ پر ہے۔
ایک بظاہر واقعہ کی ضرورت کو پورا کرنے کی رُو سے اور دوسرا مطابق حال۔ کافروں کے لیے اور
طرح، مومنوں کے لیے اور، اور حضورؐ کے لیے اور۔ ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق تعلیم
ہوئی۔ مناسبت حال سے مناسب امور کا نزول فرمایا گیا۔ گویا شان نزول ہمارے حال کی
عبارت سے ہے، اور یہ اعجاز کلام الٰہی ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

مثلاً اصحاب کہف کے قصہ میں لوگوں کے اختلاف کو رفع کرنے کے لیے حضور
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا:

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (پ۱۵۔ ع۱۶)	اور اصحاب کہف اپنی غار میں نو اوپر تین سو سال رہے۔

تو ساتھ ہی جواب کفار کے لیے ارشاد ہوا:

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ (پ۱۵۔ ع۱۶) کہہ دو کہ جتنی مدت وہ رہے اسے خدا ہی خوب جانتا ہے۔

بعض معترض کہہ دیں گے کہ یہ نفی علم نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کے علم کی تصدیق ہے
اور یہ لایعنی اعتراض ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کے لیے تو قرآن مجید کا فرمان بس ہے۔ پھر اَللّٰهُ
اَعْلَمُ سے کیا فائدہ؟ اور ساتھ قُلْ اس امر کا شاہد ہے کہ یہ رد کفار کے لیے جواب تھا۔

ورنہ قُلْ کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح قرآن شریف میں جتنے قُلْ نفی علم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم میں وارد ہیں سب کے سب جواب کفار میں ہیں۔

ایک صاحب اعتقاد نے ان سب کو کسر نفسی پر محمول کیا ہے۔ جس پر مخالف نے
اعتراض کیا ہے کہ کیا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ نبی نے جھوٹ کہا ہے، اور مولیٰ کریم نے جھوٹ
سکھایا ہے؟ کیا اس کتاب میں جھوٹ کا بھی دخل ہو سکتا ہے؟ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ ۔

گو کسر نفسی کے طور پر ایسا جواب کسی حد تک درست ہے جیسے سورۂ یوسف میں
ہے کہ جب شاہ مصر نے حکم دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید سے آزاد کر کے میرے پاس
لے آؤ تو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیغام سن کر فرمایا کہ پہلے جا کر میرے متعلق ان
عورتوں سے دریافت کر دیکھو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ چنانچہ جب ان سے دریافت
کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ	بادشاہ نے (عورتوں سے) پوچھا کہ بھلا اس وقت کیا ہوا
عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا	تھا جب تم نے یوسف سے (ناجائز طور پر) اپنی کاربرآری
عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْۗءٍ (۱۲:۵۱)	چاہی؟ بول اٹھیں کہ حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی
(پ۱۲۔ ع۱۶)	معلوم نہیں کی۔

ظاہر ہے کہ آپ کا یہ اقدام سراسر اپنی بریت پر مبنی تھا۔ لیکن چونکہ اپنے آپ کو پاک کہنا ایک
عیب ہے اس لیے اپنی زبان مبارک سے یوں فرمایا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ	اور میں اپنے نفس کو پاک صاف نہیں کہتا بیشک

بِالسُّوْٓءِ (۱۲: ۵۳۔ پ ۱۳۔ ع ۱) — نفس بُرائی کی طرف حکم کرنے والا ہے۔

بالکل اسی اسلوب اور اسی نہج پر یہ آیات مبارکہ ہیں۔ مثلاً:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ — کہہ نہیں کہتا میں تم سے کہ میرے پاس خزانے

اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ — خدا کے ہیں اور نہ میں جانتا ہوں غیب کو اور نہ

لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ (۶: ۵۰۔ پ ۷۔ ع ۱۱) — کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔

لیکن جن آیات کے شروع میں لفظ قُلْ ہے ان کو نہ تو کسر نفسی پر تاویل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور حیلہ کی حاجت۔ جھوٹ کہنا تو سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ کیونکہ یہ شریعت غرا پر الزام کے مطابق ہے۔ اور شرع شریف حکم کے تابع ہے جس کے وجود کے لیے کئی لباس حرام سے حلال اور حلال سے حرام کی صورت میں تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بموجب حکم خدا جل وعلا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اسی کو مکمل کر دینے والی ہوئی۔ تاہم انبیاء و مرسلین کی شریعت عوام سے مرفوع ہی ہے۔ مثلاً مہر کا ادا کرنا، چار سے زیادہ نکاح اور تہجد کی فرضیت اس امر پر واضح دلائل ہیں۔

اس مقدمہ میں ایک امر غور طلب ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کسی شریعت میں ناحق قتل، جھوٹ اور بہتان کبھی جائز نہیں ہوا اور نہ ہی آئندہ ہوگا۔ فرمایا ہے:

مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ — جو کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے پس

جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ — بدلہ اس کا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور

عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا — غضب ناک ہوا اللہ اس پر اور لعنت کی اس کو اور

عَظِيْمًا ۝ (پ ۵۔ ع ۱۰۔ ۴: ۹۳) — تیار کیا واسطے اس کے بڑا عذاب۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـــَٔةً اَوْ اِثْمًا — اور جو کوئی کمائے کچھ خطا یا گناہ پھر تہمت

ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ — لگائے ساتھ اس کے بے گناہ کو پس بیشک اٹھا

بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۴: ۱۱۲۔ پ ۵) — لیا اس نے بہتان اور گناہ ظاہر۔

لیکن جب اس باری تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے کسی مصلحت کے پیش نظر کوئی امر ظاہر شریعت کے خلاف مقرر کر دیا تو اس کے لیے وہ حکم جائز اور جاری ہو گیا۔ جیسے حضرت یوسف اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعات سے ظاہر ہے:

(۱) فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ — تو جب ان کا اسباب تیار کر دیا تو اپنے بھائی

السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ — کے شلیتے میں پیمانہ (پیالہ) رکھوا دیا۔ پھر ایک

مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ۝ — پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو!

(۱۲: ۷۰۔ پ ۱۳۔ ع ۳) — یقیناً تم چور ہو۔

(۲) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا — پس دونوں (حضرت موسیٰ اور خضر) چل پڑے

فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا — حتیٰ کہ کشتی میں سوار ہوئے تو خضر نے کشتی کو پھاڑ ڈالا

لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا — موسیٰ نے کہا آپ نے اس کو اس لیے پھاڑا ہے کہ اس کے

اِمْرًا ۝ (۱۸: ۷۱۔ پ ۱۵۔ ع ۲۲) — سواروں کو غرق کر دیں، یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات کی۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا — پھر دونوں چلے حتیٰ کہ رستے میں ایک لڑکا

غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝ (۱۸:۷۴۔ پ۱۵۔ ع ۲۲)

ملا تو خضرؑ نے اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ نے کہا کہ آپ نے ایک بے گناہ شخص کو ناحق بغیر قصاص کے مار ڈالا یہ تو آپ نے بُری بات کی۔ علیہما السلام

یہ امر مسلمہ ہے کہ نزول قرآن شریف خاص واقع ہوا ہے اور حکم عام۔ اور یہ مناسبت حال کی رُو سے ہے۔ مثلاً:

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَاۨ ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝

اور روبرو لائیں گے ہم دوزخ کو اس دن واسطے کافروں کے روبرو لانا۔ وہ لوگ کہ تھیں آنکھیں ان کی بیچ پردے کے یاد میری سے اور نہیں تھے سن سکتے۔

کا شان نزول خاص کفار کے لیے ہے اور حکم مناسبت رکھنے والوں کے لیے عام۔ مناسبت کے لحاظ سے مومن ہو یا کافر سب برابر ہیں۔ بلکہ باوجود ایمان رکھنے کے اس نسبت کا ہونا زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ کافر کے متعلق احتمال ہے کہ وہ نورِ ایمانی کے ذریعے اس اہمیت سے خلاصی پائے۔ لیکن جو ایمان رکھنے کے باوجود اس سے مناسبت رکھتا ہو اُس کا اس بلا سے نجات پانا دشوار ہے۔ جب تک وہ اعتقاد کی درستی اور رجوع نہ کرے۔ لہٰذا اس امر سے خوف رکھنا چاہیے کہ جو کلمات بحکم خدا جواب کفار ہیں ان کی طرف منسوب ہیں کہیں مومن ان سے مناسبت نہ رکھے۔ اور جو باری تعالیٰ کے غیظ و غضب کی رو سے حجت ختم کرنے کے لیے وارد ہوا ہے اس پر اعتقاد رکھ لینے کے سبب سے نورِ ایمانی کو نہ کھو دے۔

قرآن کریم کا نزول واقعات کے سوا ایک ایک لفظ حال کے مطابق تطبیق کرنے والا ہے۔ ذرا چشم بصیرت سے غور و فکر کے ترازو میں ایقان کے اوزان سے موازنہ کر کہ توحید یا فعل کا بیان کرتے ہوئے هُوَ الَّذِيْ سے ارشاد ہوتا ہے۔ جو ہمارے حال يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے موافق ہے۔ بعض غیر مسلم خصوصاً آریہ اور عیسائی جہالت کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ورنہ اِنِّیْ یا اَنَا کا لفظ ہوتا، جو ذات سے اتصال رکھتا ہے۔ اور هُوَ کی نسبت غیر کی طرف ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ کلام الملوک ملوک الکلام کے مطابق هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ کا کلام جو سراسر حال اور ہمارے حال کے مترادف ہے پُراسرار واقع ہوا ہے۔ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ مشیت ایزدی سے وادیٔ مقدس میں قدم زن ہوئے تو ارشاد ہوا:

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ بیشک میں ہی ہوں رب تیرا پس اتار لے جوتے اپنے۔

چونکہ اس وقت تجلیات کا ظہور تھا اس لیے مطابق حال اور ورود ویسا ہی ارشاد فرمایا۔ یوں تو اَلْحَمْدُ سے لے کر وَالنَّاس تک سارا کلام الٰہی ہے، خواہ وہ قصص کی رو سے غیر کا کلام ہو یا حال و کلام کفار۔ گو قرأت کے لحاظ سے خواہ نماز میں ہی کیوں نہ ہو، پڑھنا اور سننا ثواب بلکہ فرض ہے۔ لیکن عمل میں از حد اختلاف ہے۔ مثلاً فرعون کی زبان سے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کلام الٰہی تو ہے لیکن عمل کے میدان میں کفر ہے اور اس کا عامل واجب القتل۔ التحیات یعنی قعدۂ نماز میں رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ دعائے قرآنی کا پڑھنا جائز اور مروج ہے۔ لیکن جس کے والدین کا خاتمہ کفر پر ہوا ہو، اسے تلاوت اور قرأت کے بغیر دعا کے طور پر پڑھنا بحکم

خدا ممنوع ہے۔ اسی طرح جس آیت قرآن شریف کا شان نزول کفار کے حق میں ہو اس پر مومنین کا عمل حرام ہے۔ اور جن آیات کے ساتھ قُلْ جو حکم خدا کا مقتضی ہے اس پر عقیدہ یا عمل مطلق گمراہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اکثر قُلْ جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ محض سوال کفار کا تعلیماً جواب ہیں ان کو اسی پر معیار کرنا نادانی ہے۔ یہ صرف اس موقع و محل پر واقع ہوا ہے جن کے انکار کی وجہ سے وعید اور بیان انکار اور وعدہ عذاب کی تفصیل درج ہے جن کے لیے بات پوری ہو چکی۔ کچھ تو مِثْلُكُمْ کی وجہ پر بیان ہو چکے جن کو دوبارہ درج کرنا بے سود ہے باقی سب کے سب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں تاکہ یہ اشکال پوری تکمیل کے ساتھ حل ہو جائے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ تو اس علیم خبیر نے پہلے ان کے مشوروں کی خبر دی کہ:

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ	اور چھپ چھپ کر مشورہ کیا ان لوگوں نے کہ ظالم
هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ (۲۱:۴)	ہیں کہ نہیں یہ مگر بشر ہے مثل تمہاری

پھر جواب کفار میں حضور کو حکم ہو رہا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	آپ کہہ دیجیے کہ ہاں میں تمہارے ہی جیسا آدمی ہوں۔

جو ان کے حال کے مناسب تھا۔

اب نہایت ادب سے التجا بلکہ استغاثہ ہے کہ اس سلطنت قرآن کی حکمرانی میں سیر کریں، ہر بازار اور گلی کوچہ میں تجسس کر دیکھیں، ہر محل اور ہر موقع میں چراغ ایمان کی روشنی سے متلاشی ہوں، ہر شجر کی ٹہنیوں اور پتوں کے رگ و ریشہ سے معلوم کریں، ہر وادی میں سرگردانی کریں، ہر گلستاں کی ہر بہار کے پھولوں کی خوشبو سونگھیں، اس میں آفتاب کے

تصرفات کو دریافت کریں، اس کی رات کے ماہتاب اور ستاروں سیاروں کی حرکات و سکنات کا ملاحظہ فرمائیں کہ کہیں مومنین کے شان یا ان کے جواب میں یا ان کے اعتقادات کی بنا پر ان کو مطلع کرنے کے لیے، حقیقت کو عیاں کرنے کے لیے بھی ایسا بیان ہوا ہے؛ یعنی ارشاد باری تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ مومنوں سے کہہ دو جو قُلْ جواب کفار کے مثل اور مانند ہوں؛ ایک کلمہ تو درکنار ایک حرف بھی میدان قرطاس میں کلام الٰہی سے اس قسم کا نہیں ملے گا۔

ہاں! بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، حکمت سکھانے والا حکیم، رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ مطابق اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ، معلم و مزکی، مبشر و نذیر، سراجاً منیر۔

نزول قرآن حکیم کے مطابق مولیٰ کریم کا معاملہ کفار کے ساتھ ان کے اعتقادات اور انکار و اعمال کی وجہ پر ان کے حال کے مناسب ہے اور مومنین کے ساتھ ان کے اعتقادات اور تسلیم و اعمال کی بنا پر ان کے حال کے مناسب۔ مثلاً شَدِيْدُ الْعِقَابِ کفار کے لیے ہے تو غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ مومنین کے لیے۔ عمل کے میدان میں خدا کا تصرف بالکل عیاں ہے جو فرمان تعلیماً نازل فرمائے ہیں، ملاحظہ ہوں:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ	مت مقرر کرو پکارنا پیغمبر کا درمیان اپنے جیسا
كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۚ (پ۱۸۔ ع۱۵)	پکارنا بعضے تمہارے کا ہے بعضوں کو
يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا	اے اہل ایمان! خدا اور رسول سے پہلے
بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا	بات نہ کیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو، بیشک

اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝ یٰۤاَیُّھَا	خدا سنتا جانتا ہے ۔ اے اہل ایمان! اپنی آوازیں
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ	پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو۔ اور جس طرح تم
فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡھَرُوۡا لَہٗ	آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو
بِالۡقَوۡلِ کَجَھۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ	ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ
تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝	تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔
اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَھُمۡ عِنۡدَ	جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے
رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ	ہیں، خدا نے ان کے دل (ظہور) تقویٰ کے لیے
اللّٰہُ قُلُوۡبَھُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ	آزمائے ہیں ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔
اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝ (۴۹: ۱-۳۔ پ ۲۶۔ ۱۳۴)	(سورہ حجرات)

پھر فرماتے ہیں:

وَ ذَرۡنِیۡ وَ الۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ	اور چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں صاحبوں
وَ مَھِّلۡھُمۡ قَلِیۡلًا ۝ (۷۳: ۱۱۔ پ ۲۹۔ ۱۴)	آرام کے کو اور ڈھیل دے ان کو تھوڑی سی۔
قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ لَاۤ	کہہ اے کافرو! نہیں عبادت کرتا میں اس
اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝ (پ ۳۰۔ ۳۴۴)	چیز کی کہ عبادت کرتے ہو تم۔

دیکھیے! متذکرہ بالا آیات جو مومنین کے حق میں ہیں کافروں کے بالکل برخلاف ہیں۔ اور جو کافروں کے حق میں ہیں، مومنوں کے خلاف ہیں۔ اسی طرح یہ قُلْ جو بالکل حکم خدا کے مترادف ہے اہل ایمان کے لیے سمجھنا سراسر گمراہی ہے۔ کیونکہ یہ محض کفار کے لیے ہے اور انہی کے

مناسبت حال کی رو سے ہے۔ اور جو مومنوں کے لیے ہیں ان پر ایمان رکھنا اہل اسلام کے لیے اکسیر ہدایت اور سبیل رُشد اور دو جہان کی کامیابی ہے۔ ورنہ باوجود مومن ہونے کے اجیت اور ہدایت سے محرومیت کا باعث ہے۔ اور وہ اس لیے کہ جس چیز پر اعتقاد نہ ہو اس سے حصول ناممکن ہوتا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی

قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی	انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! کیا دیکھا تم نے
بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً	اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہوں
مِّنۡ عِنۡدِہٖ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ	اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی ہو جس
اَنُلۡزِمُکُمُوۡھَا وَ اَنۡتُمۡ لَھَا کٰرِھُوۡنَ	کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہو تو کیا ہم اس کو
(۱۱: ۲۸۔ پ ۱۲۔ ۳)	تمہارے گلے باندھ سکتے ہیں اور تم اس سے بیزار ہو۔

تو ان ہر دو قسم کی آیات میں جو ایک دوسری کی ضد ہیں سخت اختلاف ہے۔ صاحب اعتقاد ان کو دلیل پکڑیں گے، اور نہ ماننے والے اُن کو دلیل بنائیں گے۔ لیکن اس صورت میں بموجب فرمان ایزدمتعال:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ وَ لَوۡ کَانَ	بھلا یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے اور اگر
مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ	یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا
اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ۝ (پ ۵۔ ۸۷)	اختلاف پاتے۔

وحدانیت اور کلام الٰہی میں سخت فرق لاحق ہو گا۔ جس سے نور ایمانی کے ضائع ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے اس تطبیق کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور دلائل کے رُو سے ماننا ہی پڑے گا کہ

جواب کفار منکرین کے لیے ہے اور اثباتِ علم مومنین کے لیے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ کس وضاحت سے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ فرمایا ہے۔

اس موقع پر آج کل کے عالم حجابِ اکبر کے بحر میں غوطہ لگانے کے بعد ضرور کہہ دیں گے کہ "ہمارا اور پیغمبر کا فرق صرف وحی کا ہے۔ ورنہ مثلنا میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے۔ اور وحی پر ہمارا ایمان ہے۔" معلوم ہوتا ہے کہ شاید وحی کو انہوں نے اس رقعہ یا پروانہ کی مانند سمجھ رکھا ہے جو ایک دوسرے کی طرف بھیجا جاتا ہے اور انھیں یہ نہیں معلوم کہ وحی ایک ایسی حالت ہے جس کا برگزیدہ ہستیوں کے سوا کوئی متحمل نہیں ہوسکتا۔ اگر کچھ نظر عمیق ہے تو دیکھو مولیٰ کریم ان کفار کے جواب میں کیا ارشاد فرما رہے ہیں جن کو نبوت کی ہوس تھی:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ — اللہ خوب جانتا ہے کہ کس جگہ رکھے رسالت اپنی کو۔
(پ ۸ - س ۶ - ۱۲۵)

یہاں ایک لفظ اظہار کے قابل ہے کہ مثلنا تو قول اور اعتقاد کفار ہے۔ رؤف و رحیم اس سے مومنوں کو بچائے رکھے۔ رہا یہ کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وحی کے ذریعے احکام الٰہی ہم کو پہنچیں ان پر عمل کرنا ہی مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ہے اور بس۔ لیکن اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ جو اصل ایمان اور نور ایقان ہے، فَاتَّبِعُوْنِيْ کے سوا محال ہے۔

اطاعت اور اتباع

کے معنی ایک ہی سمجھے جاتے ہیں لیکن ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اطاعت حکم کی تعمیل ہے جو بیگانگی ہے اور اتباع یگانگی۔ حکم ماننا اور اس پر عمل کرنا اطاعت ہے۔ اور

اتباع قدم بقدم چلنا مطابقت ہے۔ بعض احکام عنایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض کی طرح تھے۔ مثلاً نماز تہجد۔ اور عام مسلمانوں پر یہ فرض نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اتباع کے میدان میں یہ فرض ہی کی حیثیت رکھے گی۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف حکم ہو رہا ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ (۱۶: ۱۲۳ - پ ۱۴ - ۲۲) — پھر وحی بھیجی ہم نے طرف تیری یہ کہ پیروی کر دین ابراہیم (علیہ السلام) حنیف کی۔

تو اس میں اطاعت کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اتباع حنیف کا حکم ہے کہ جیسے یکسوئی والے اور خلیل ابراہیم علیہ السلام تھے، ویسے ہی تم بھی ہو جاؤ۔ تو یہ اشارہ حال سے ہے۔ اسی طرح مومنوں کو مطلع فرمایا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳۱:۳ - پ ۳ - س ۱۴) — کہہ دو میرے حبیب! اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو یا رکھنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، محبت کرے تم سے اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ جب تک اتباع نہ کرو گے کبھی محبت کو نہ پہنچ سکو گے۔ اطاعت جوارح کے فعل سے ہے اور اتباع قلب کے جذبے، اور محبت کا تعلق دل ہی سے ہے۔ اسی لیے اس لفظ کو محبت کے لیے مخصوص کیا ہے اور اطاعت سے محبت تک پہنچنا دشوار ہے۔ گو اطاعت مجاہدہ کی رو سے سبب بافت و یاب ہے لیکن حال کی علت نہیں ہے۔ کیونکہ حال کی تقلید بغیر حال کے کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ ہم لوگ صرف اعتقاد کی شمع اور روشنی سے اس کے فضل کی امید پر ساعی ہیں۔

محققین اہل سنت والجماعت کے نزدیک ولی کا وجود عوام کے روح کی مانند ہوتا ہے اور نبی کا وجود ولی کے روح کی مانند۔ گو اس روح سے بطن یا روحانیت مراد ہے لیکن مراتب اور

حال کے لحاظ سے یہ کہہ دینا ہی موزوں ہوگا۔ کیونکہ عام مومن اُس حال میں جبکہ اس کے حواس خمسہ نیند میں مستغرق ہوں اور رُوح بطن کی طرف متوجہ ہو تو گاہے غیبی خواب دیکھتا ہے۔ اور ولی بیداری میں وجود کی آفت سے چھوٹا ہوا ان معنوں کو پانے والا ہوتا ہے۔ تاہم سر اور حقیقت کی رویت کے لیے غنودگی یا استغراق لازم ہوتا ہے۔ لیکن نبی کے لیے بالکل بظاہر بیداری میں عام حالت کی مانند یہ عبارت نمود پکڑتی ہے۔ ولی کو بھید میں الہام سے اطلاع دی جاتی ہے اور نبی کو ظاہر وحی سے۔ کرامت ولی کے لیے ہوا کرتی ہے اور معجزہ نبی کے لیے عام پر ظاہر کرنے کے واسطے۔ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوتی ہے۔ ولی طلب میں جانے والا ہوتا ہے اور نبی مقصود کو پائے ہوئے واپس الی الخلق آنے والا ہے۔ ولی ولایت کے اظہار سے معطل ہوتا ہے اور نبی دعوائے نبوت سے تصدیق کو پہنچنے والا۔ خواہ آج مسلمان کہلانے والے مِثلُنَا کے حجاب میں انتہا کو پہنچ گئے ہوں، مراتب اور مدارج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کے گناہ دوسرے کے صواب ہیں۔ بلکہ ہم کو تو نبیوں اور رسولوں کے گناہ بھی نصیب نہیں ہیں۔ مثلاً حضرت یونس علیہ السلام سے جو قصور سرزد ہوا وہ محض غیرت اسلام اور کفر سے بیزاری تھا لیکن عتاب میں گرفتار ہوئے اور فرمایا کہ اگر یونس معافی نہ مانگتے اور اپنے رب کی تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ لیکن ادھر اگر آج کسی کو وہ غیرت نصیب ہو تو وہ بلاشبہ ولی اللہ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

حسنات الابرار سیئات المقربین وحسنات المقربین سیئات العاشقین وحسنات العاشقین سیئات الواصلین۔

عوام کے نزدیک یہ عجیب بات ہے۔ کیونکہ گناہ اور صواب دو متضاد فعل ہیں۔ تو پھر ایک کے گناہ دوسرے کے لیے صواب کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اے عزیز! خداوند کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے اور تیرے علم کو زیادہ کرے۔ یہ گناہ و صواب حال کے تغیر سے ہے فعل کے صادر ہونے سے نہیں ہے۔ جب واصل کا کسی خطا سے تنزل ہوتا ہے تو وہ اپنے مقام وصل یعنی اس حال سے جس میں اسے مشاہدہ اور لقا سے اطمینان تھا، گرایا جاتا ہے تو وہ وصل کے لیے دردِ فرقت میں بے قرار ہوتا ہے۔ اور عاشق اپنے مقام درد اور محبت میں خوش ہوتا ہے۔ تو گویا واصل کا حال تنزل کی صورت میں عاشق کی مانند ہوتا ہے۔ اور عاشق جب کسی وجہ سے اپنے مقام سے گرتا ہے تو مقرب کے مقام میں آتا ہے اور اس عشق و محبت کے لیے بے قرار ہوتا ہے جو اسے حاصل تھا۔ اور مقرب گاہے درد و الفت کی ہوا سے لینت قلب سے سرور پاتا اور خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح مقرب کسی غفلت سے چار و ناچار ابرار ہوتا ہے۔

تو جب بندگانِ خدا اور مردانِ الٰہ کے حال کے علم سے ہماری عقلیں عاجز ہیں تو نبیوں اور مرسلوں کے حال کے علم سے تو کلام ہی کیا۔ بلکہ جو کچھ بھی ہم نعت کی رو سے نبیوں اور مرسلوں کی نسبت جانیں یا کہیں وہ ہم آپ ہی ہوں گے۔ ان کے حال سے تو کسی ولی کو بھی حصہ نہیں ہے مگر بہت کم۔ اور عوام تو اس میں از حد عاجز ہیں اور یہی باعث انکار ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کی حقیقت سے عارف اور شناسا نہ ہو سکے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے۔ مطابق فرمان:

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهٗ ؕ (۱۰: ۳۹) پ ۱۱، ع ۹

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر قابو نہ پا سکے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت ان تک آئی ہی نہیں۔

اور سورۂ مومنون میں فرمایا:

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُونَ ○ (۲۳: ۶۹ - پ۱۸ - ع ۴)

یا نہیں پہچانا انھوں نے رسول اپنے کو پس وہ واسطے اس کے انکار کرنے والے ہیں۔

لغت میں منکر کے معنی ناشناس کے بھی ہیں۔ دیکھو! سورۂ یوسف میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَجَاءَ اِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُونَ (۱۲: ۵۸ - پ۱۳ - ع ۲)

اور آئے بھائی یوسف کے پس داخل ہوئے پاس اس کے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

تو یہاں منکرین کے معنی ناشناس کے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے باوجود تسلیم کر لینے کے یہ انکار باعث جہالت ابدی اور مقصود سے نامرادی اور حقیقت سے اعمیت ہے، کیونکہ یہ سوءِ اعتقادی ہے۔ جب بنیاد ہی حقیقت کے خلاف ہو تو عمارت کی استقامت حق پر محال ہے۔ اور اس محل میں لقائے الٰہی اور سیر الی اللہ کا مشاہدہ ناممکن۔ اس واسطے کہ جس چیز پر یقین ہی نہ ہو اس کے لیے سعی کے قدم کٹ جاتے ہیں۔ تو پھر سب اعمال اور اجر اُلٹے ہو جاتے ہیں۔ جن مسلمانوں کو مولیٰ کریم نے اپنے فضل و کرم سے اس گمراہی کے گڑھے سے بچا لیا ہے

گو وہ حقیقت تک نہ ہی پہنچ سکیں تاہم صراط المستقیم پر حسن اعتقاد کے سہارے چل رہے ہیں۔ اور بخشش و نعمت کے مستحق ہیں۔ لیکن جو سوءِ اعتقادی کے دریا میں غرق ہو رہے ہیں، کنارۂ نجات ان کے لیے عنقا ہو گیا ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

تو افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی مثل خیال کرتے ہیں اور ہر آیتِ رشد کو ظاہری اسباب پر ہی جانچ رہے ہیں۔ گویا وہ دین کی حقیقت اور نورِ ایمانی کو ظلمات کے حجاب میں مستور کر رہے ہیں۔ تو حسرت سے کہنا ہی پڑے گا کہ پھر ان کفار میں جن کے حق میں حق کا ارشاد ہو رہا ہے:

وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ (۱۰: ۴۳ - پ۱۱ - ع ۱۰)

اور بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم ایسے اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے اگرچہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں۔

اور ان مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باجود نورِ ہدایت اور حضور کی طرف دیکھنا ہی سبیلِ رُشد ہے۔ لیکن بظاہر صورت جو ایک دوسرے کے مثل ہے، اس کی نفی فرمائی ہے کہ "میرے حبیب! آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف دیکھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں دیکھتے تو کیا ایسے اندھوں کو جن کی نظریں آپ کے ظاہر ہی پر رہ گئیں اور حقیقت سے ناشناس ہیں، راستہ دکھائیں گے؟ جس حال میں کہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں"۔ تو وہ نور جو بشریت کے لباس میں مستور تھا، وہ ہدایت جو حضورؐ کے پہلو میں پوشیدہ تھی،

وہ کیفیت جو گوشۂ چشم حبیب خدا سے ہویدا تھی، وہ شمع جو دونوں جہان کی روشنی کا موجب ہے اس سے اندھے رہ کر گمراہ ہوئے تو بظاہر دیکھنا ان کے لیے بجائے نفع کے نقصان کا باعث ہوا۔ تو آج مدعیانِ اسلام بھی اس حقیقت نور اور ہدایت سے ناشناس اور منکر ہو رہے ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ اس پر مصر ہیں۔ تو گویا جہالت کو علم، تاریکی کو روشنی اور گمراہی کو راستہ سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ زمانہ کے صدیق اکبر حقیقت سے ماہر معنوں کو پائے ہوئے، صحابہ میں سے برگزیدہ نے کیا ہی حق فرمایا ہے:

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا ثَلٰثٌ اَلنَّظَرُ	پسند ہیں مجھ کو دنیا کی تین چیزیں۔ دیکھنا
اِلٰی وَجْہِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَاِنْفَاقُ مَالِیْ	طرف منہ رسول اللہ کے، اور خرچ کرنا اپنے
عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ وَاَنْ یَکُوْنَ اِبْنَتِیْ	مال کو رسول اللہ پر اور میری بیٹی بی بی رہے
تَحْتَ رَسُوْلِ اللّٰہِ (منبہات ابن حجر)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔

قرآن حکیم میں فکر و تدبر سے دیکھیں تو اَفَاَنْتَ تَھْدِی الْعُمْیَ کا مفاد اس بات پر دال ہے کہ اس شخص کو جو دل کی آنکھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھتا وہ ہدایت سے اندھا اور محروم ہے۔ گو دعوت عام اور ہدایت خاص ہے جس میں ارادہ حضور کو خاص حصہ ہے۔ لیکن اس بدبخت کے لیے جس نے اپنے باطن کی آنکھ کو کج فہمی اور سوءِ اعتقادی سے اندھا رکھا تلقی فرمائی ہے کہ "تم کس طرح ہدایت دے سکتے ہو اس بے نصیب کو جو آپ کو باوجود نظر کرنے کے نہیں دیکھتا۔ لیکن جنہوں نے دیکھا اور اس نور کو پایا ہے خوب جانتے ہیں۔ بلکہ یا کے دامن کو حسرت کے ہاتھوں سے جھاڑتے ہوئے حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہٗ

قطب زمان فرماتے ہیں کہ "تین چیزوں کی کُنہ کو میں نہیں پہنچ سکا: معرفت الٰہی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجات، نفس کی شرارت ؎

در حریم سر تعظیم تو کس را راہ نیست
در کمال احتشامش ہیچ کس آگاہ نیست

اور یہ اس طرح ہے جیسے فرمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ لیکن یہ کمال معرفت اور عبادت کی دلیل ہے۔ کیونکہ حَقَّ عِبَادَتِکَ اور حَقَّ مَعْرِفَتِکَ کے الفاظ سے عرف اور اس کی حقیقت سے علم ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ عبارت حال کے دوام اور کنہ سے ہے، جہالت سے نہیں۔ اور

انسان کی علم و عرف میں سیر

اس کے مدارج و منازل تک محدود ہوا کرتی ہے۔ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان کے لیے چھ منزلیں ہیں: (۱) عالم ارواح سے پشت والد (۲) بطن مادر (۳) میدان دنیا (۴) قبر یعنی عالم برزخ (۵) میدان قیامت (۶) دوزخ یا بہشت۔

ہر چند پیدائش سے قبل و مابعد کا کوئی علم نہیں۔ ہوش سنبھالا تو میدان دنیا ہی میں علم کے حصول کے بعد ماضی، حال اور مستقبل سے معلومات و محسوسات میں جذب ہوتے۔ اس سے پہلے نہ خدا کا پتہ نہ دین و اسلام کی خبر، نہ اپنے سے جان پہچان، نہ غیب سے علم، نہ

صواب سے عرف۔ محض یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ پر دار و مدار۔ پھر علم الیقین بلکہ حق الیقین کی یہی جگہ، سعی و حصول کا قیمتی وقت، جنت اور دوزخ خریدنے کی تجارت گاہ، معرفت خداوندی حاصل کرنے کا مقام، مومن و کافر، منافق و فاسق، جاہل و عالم بننے کا محل، حرص و طول اَمَل کا بے انتہا شجر، تفاخر اور خود غرضی کی ناؤ، سود کا قاعدہ، اندھا دھند معشوق بے وفا، جاہلیت کا مرکز، غفلت کی زندگی، مومن کا قید خانہ، دوست کے لیے بلا، بوڑھی دُلہن، لباس مکر سے آراستہ، خوبصورت منقش سانپ، مہلک بیداد، عبث مایہ، مصائب اور آفات کا سمندر پُرخون، یافت و حُصُول مطعُون، اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنٌ وَّمَا فِیْھَا مَلْعُوْن، ظلمت بے نور، اَلدُّنْیَا مَتَاعُ الْغُرُوْر۔ صبح جس کو نوازتی ہے شام کو گرا دیتی ہے۔ اس کا فائدہ نقصان اور نقصان فائدہ۔ اس اُلٹ بیان کا کیا ٹھکانا، بس دھوکا اور فریب ہے اس سے دل کا لگانا

انسان نے یہاں آکر پرورش پائی، اسی جگہ عقل آئی، میدان دنیا ہی میں حیاتی پائی اور پھر اسی جگہ ہی موت کا شکار ہوا، بے نام و نشان ہوا، اور پھر یہاں سے ہی اُٹھا کھڑا کیا جائے گا ـــــــ لیکن کہاں کا اُٹھنا اور کیسی موت! جب تک زندہ ہے کچھ یاد نہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ	اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ آزمائے
لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (پ ۲۹ ع ۱)	تم کو کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔

سے بے خبر آزمائش کے میدان میں حرص و حظ کے بستر پر طول اَمَل کا تکیہ لگائے، غفلت کی چادر اوڑھے، بے فکری کی نیند میں بے ہوش پڑا ہے۔ وہ سعی اور کوشش جو مولیٰ کریم نے صراط المستقیم پر چلنے اور عین حقیقت کو پہچاننے کے لیے عنایت فرمائی تھی، بے راہ اور بے محل

میں صرف کر رہا ہے اور اپنی دانست میں بہت اچھا کر رہا ہے۔

اسی خسارہ اور نقصان سے بچانے کے لیے اور صراط المستقیم اور مقصود کو پانے کے لیے مولیٰ کریم اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ارشاد فرما رہے ہیں۔ گویا دعوت دے کر علم حق سے متنبہ فرما رہے ہیں:

قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ	کہو (میرے حبیب!) کیا ہم تمہیں بتائیں کہ عملوں کے
اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ	لحاظ سے خسارہ میں کون ہے؟ وہ لوگ جن کی سعی
فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ	حیاتی دنیا میں صرف ہو گئی اور وہ سمجھے ہوئے ہیں
اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ (پ ۱۶ ع ۳)	کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

سعی کو تو آخرت کی راہ پر لگن لگانا تھا، سو اُس طرف سے تو بالکل بے توجہی رہی، اور دنیا کے سامان عیش و عشرت اور حظوظ نفسانی کے لیے خون جگر پی پی کر نہایت اخلاص سے طالب اور تمام عمر کوشاں رہے اور اسی کو مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔

اے عزیز! یہ دو حصّوں پر منقسم ہے: ایک بظاہر، دوسرے باطن۔ بظاہر طاقت سے عمل ظہور پکڑتے ہیں اور باطن ہمّت سے۔ اور ہمّت قدرت سے اور قدرت ہستی سے وابستہ ہے۔ گو بظاہر طاقت بھی ہمت کے سوا متحرک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب تک انسان کسی امر (بد یا نیک) کے لیے مرید نہیں ہوتا، جوارح کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جو ارادہ یا خیال طاقت کی طرف رُخ کرتا ہے گویا حاکم اپنے محکوم کی طرف حکم فرماتا ہے، وہ بجا لاتے ہیں۔ اور جو نسی قوت ارادی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتی اور اپنے فکر و غور میں منہمک رہتی ہے

وہ ہمت ہے اَلْہِمَّۃُ اِسْمُ الْاَعْظَم۔

یہ تو ہر انسان سمجھدار پر روشن ہے کہ جب یہ اپنے ارادوں سے کوئی کام کرنے لگتا ہے تو صرف چند لحظوں کے لیے جب تک فکر اس سے وابستہ ہو، ہمت اور طاقت جمع ہو جاتی ہے لیکن جہاں کام شروع ہو گیا، خواہ وہ تحریر اور حساب ہی کیوں نہ ہو اس کی ہمت اس کام پر جمع اور مقید و محدود نہیں رہتی بلکہ کسی مطلوب اور مرغوب مقصود کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ تو گویا یہی حقیقی انسان ہی صُوری اور معنوی صورت میں دوڑتا پھرتا ہے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک یہ دوسرا وجود ہے جو مثلی صورت کہلانے کا مستحق ہے۔ بعض ہستیوں کی ہمت اس قدر بلند اور طاقتور ہو جاتی ہے کہ ان سے نہایت عجیب و غریب واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اور چونکہ بظاہر اعضائے عناصر کی طرف ان کی اکثر توجہ نہیں ہوتی اور ساری ہمت باطن ہی میں متصرف رہتی ہے اس لیے ان کی ہیبت بالکل کمزور ہو جاتی ہے اور یہاں تک ترقی کر جاتے ہیں کہ ہوا میں اُڑ جاتے ہیں، پانی پر زمین کی طرح چل سکتے ہیں، ہزارہا کوس کی مسافت چند قدم میں طے کر لیتے ہیں۔ اور ان کے ارادوں سے کئی ایک ایسے خرق عادت واقعات سرزد ہونے لگتے ہیں کہ عوام الناس کی عقلوں پر دیکھ لینے اور مان لینے کے بعد بھی تنگی واقع ہوتی ہے کہ روحانیت اس جسم کی باوجود ثقل کے کس طرح متحمل ہو سکتی ہے؟ نہ معلوم کہ ان بندگان خدا کا وجود مثل لباس کے ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی طاقت سے لباس بے جان کو ساتھ لیے پھرتا ہے تو یہ وجود بھی ان مقدس ہستیوں کے لیے گراں نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان مردان خدا کا مقصود خرق عادت نہیں ہوتا ہے۔ عوام الناس کے نزدیک تو

یہی ولایت اور کمال فقر ہے، حالانکہ یہ راستہ کا کھیل اور تماشہ ہیں، نہ منزل مقصود۔ اسی لیے کوتاہ بین مسمریزم کی شعبدہ بازی کو بھی اس کی مثل خیال کرنے لگتے ہیں۔

گو مسمریزم بھی ایک طاقت خیال ہے جو مدت کی تنہائی میں مشق کا نتیجہ ہے لیکن ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کبھی کسی مسمریزم کے عامل سے ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا اور ہزارہا کوس پر فوراً پہنچنا یا پہنچا دینا سرزد ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی طاقت محض دماغی اثر ہے جو کسی آدمی پر پڑ کر اس کو بیہوش کر دے یا کسی چیز کو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اٹھا کر دیوار سے ٹکرا دے یا توڑ دے۔ یعنی جس قوت ارادی سے اعضا کے وسیلہ سے کام کرنا تھا، بلا جوارح کر دیا۔ کئی ایسے تماشے دکھا سکتے ہیں اور عوام کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ جب کسی آدمی کو سامنے بٹھا کر اثر ڈالتے ہیں تو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ ان کے بلانے سے بولتا ہے، جو کچھ پوچھتے ہیں، بتاتا ہے۔ کچھ پوشیدہ اشیاء سے خبر دیتا ہے وغیرہ۔ تو یہ بے ہوشی اصل بے ہوشی کی مانند نہیں ہوتی۔ کیونکہ محض ان کی دماغی توجہ کا اثر اس طاقت پر (جس کو ہمت کہنا روا ہے) پڑ کر کشش کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جوارح سے بے توجہ ہو کر جمع ہو جاتی ہے اور وہ آدمی چند منٹ کے لیے بے ہوش کی طرح ہو جاتا ہے۔ لیکن بعد میں خود بخود ہوش میں آ جاتا ہے اور کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

بعض جاہل لوگ اس کو بھی ولایت ربانی سے مشابہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یا فقرا اور اہل دین الحق کی کرامات کو اسی پر خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ بھی ایک مسمریزم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اور یہ سراسر دھوکا اور خطا ہے۔ کیونکہ ولایت دوستی اور محبت کو کہتے ہیں جو محض عنایات الٰہیہ پر

منحصر ہے۔ اور ان کی ہمت کا رُخ ہمت کی طرف اور توجہ روح کی جانب اور دوسرے وجود کے اثبات پر بلکہ اس سے بھی ورا بے انتہا، دنیا و مافیہا سے اعراض کیے ہوئے آخرت کی حیاتی کے حصول پر متصرف ہوتی ہے۔ اور مسمریزم والوں کی توجہ اس کے برعکس حصول دنیا اور عجیب و غریب تماشا دکھانے کی طرف ہوتی ہے ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

اور ایک بہت بڑا قابل غور فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام کا معاملہ قلب سے وابستہ ہے جو کسی کسب سے حاصل نہیں ہوتا مطلق ورودِ الہٰی اور ارادۂ الہٰی پر منحصر ہے۔ اور یہ سراسر کسب کا نتیجہ ہے، جو چاہے حاصل کرے۔ اور محض دماغی اثر ہے جس کا ثبات اور پائدار ہونا محال ہے۔

بندگانِ خدا کی توجہ کا اثر قلب پر ہوتا ہے۔ اس کی تاثیر اور نور سے یکسوئی بلاکسب پیدا ہوتی ہے۔ تڑپا دیتی ہے، حالت کو بدل دیتی ہے، روحانیت کو بڑھا دیتی ہے اور بہیمیت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ اتحادی توجہ سے تو بالکل صورت و سیرت ظاہر و باطن میں یکساں ہو جاتا ہے۔

جب حضرت باقی باللہ قدس سرہٗ نے نان بائی کو توجہ دی اور حجرہ سے باہر آئے تو ارادت مندوں پر مشکل واقع ہوئی کہ اب آداب و سلام کس کا بجا لائیں۔ کیونکہ حضرت صاحب اور نان بائی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن جلد ہی تفاوت نمایاں ہو گیا۔ کیونکہ آپ تو اپنے حسب معمول کاروبار میں مشغول ہوئے اور نان بائی گم صم بے ہوش پڑا تھا۔ نا استعدادی کے باعث ہوش و حواس بجا نہ رہے اور تیسرے دن مر گیا۔ اسی لیے تو آپ نے اس کے حسب

اشتیاق فرمایا تھا کہ میرے جیسا ہو جائے گا۔ مگر اس نے نہ مانا اور اسی وقت ہونا چاہا۔ عرض کیا کہ حضرت! اگر ہونا ہے تو ابھی ہو۔ ہرچند سمجھایا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دفعتہً توجہ سے یہ انجام ہوا۔ اگر آہستہ آہستہ تعلیم ہوتی تو برداشت ہو جاتی۔

ہزارہا ایسے واقعات بزرگان دین سے سرزد ہوئے ہیں لیکن میرا اس کتاب میں یہ تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ بہرکیف ان ہستیوں سے بحالت اضطراری اور اختیاری دونوں طرح سے خرق عادت واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ محض محبت کے پھول ہوتے ہیں، جو مومن کی صفت ہے۔ غیر و متعلقاتِ غیر، دنیا و مافیہا کو اپنے ظرفِ قلب میں جگہ دینا گناہ سمجھتے ہیں۔ اسی نشۂ توحید میں سرشار اور مستغرق رہتے ہیں ؎

کشف کیا چیز، کرامت کیا ہے! استقامت ہے ولایت ساری

کشف و کرامت کو بندگانِ خدا نے حیض و نفاس سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس کے معنی صرف حقیر اور ناپاک چیز نہیں بلکہ آثار بلوغت بھی ہے۔ لیکن عوام کو سوائے بظاہر امور (کرامت، دعا، دم وغیرہ) کے باطن سے کچھ علم و حصول نہیں ہوتا اس لیے وہ اسی کو معراج کمال تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ متقدمین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کرامت کا ظہور بہت کم پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا حوصلہ اور استعداد نہایت قوی اور بالاتر تھے۔

سوال: چاہیے تھا کہ جس قدر استعداد اور قابلیت زیادہ ہو اسی قدر خرق عادات بھی زیادہ ہوں؟

جواب: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں لیکن کرامت اضطراری اور اختیاری دو صورتوں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو جس قدر حوصلہ فراخ ہوگا، مطابق لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اضطرار نہ ہوگا۔ اور اختیاری کو وہ پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ پائے ہوئے تھے، ان کا حال ان خوارق عادات سے بالاتر تھا۔ اور اس وجہ پر جو کچھ ان سے ظاہر ہوا وہ ان کے معاملہ کی صحت سے ہے، اور وہ اس کو کرامت نہیں جانتے۔ مثلاً:

جب ایک عجمی شخص بُرے ارادے سے مدینہ شریف میں آیا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خرابہ میں تازیانہ سر کے نیچے رکھے سوئے ہوئے پایا تو کہا: اس شخص سے جہان میں اس قدر فتنہ ہے؟ اور دل میں امیرالمومنین کو مار ڈالنے کو آسان سمجھ کر تلوار کھینچی تو دو شیر ظاہر ہوئے، جو اس پر حملہ کرنے کو تھے چیخا، اور اس کے آواز سے امیرالمومنین جاگ اُٹھے۔ اور وہ اسلام لے آیا۔

یہ کرامت تھی جو نہ اضطراری ہے نہ اختیاری، محض حفاظت من اللہ تھی اور معاملگی سے حال کی صحت۔

۲: ایک صحابی فوج اسلام کے سپاہی بن کر قاصد کی حیثیت سے دشمن کی طرف جنگل میں جا رہے تھے۔ راستے میں شیر ملا اور حملہ کا ارادہ کیا۔ آپ نے جلدی سے پروانہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا اور فرمایا کہ اے کتے! اگر خداوند کریم کی طرف سے تجھے کھانے کا حکم ہو تو میں تیری خوراک ہوں۔ لیکن میں اس کام کے لیے بھیجا گیا ہوں جس کا حرج اسلام کا نقصان

ہے۔ شیر متواضع ہوا اور سر نیچا کر دیا۔ وہ صاحب اس پر سوار ہو کر فوج مخالف کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دشمن نے یہ صورت حال معائنہ کی تو صلح کر لی اور جنگ سے باز رہے۔

بہر کیف اصحاب خیر القرون میں بھی کرامات کا اس کثرت سے مذکور ہے کہ ان کے اندراج کے لیے یہاں گنجائش نہیں، اور نہ ہی میرا یہ مقصود ہے۔ بغرض اس سے صرف یہ ہے کہ جب انسان اپنے پروردگار کا فرماں بردار ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس کی نافرمان نہیں ہوتی۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

لیکن ان کا مقصود حصول دنیا نہیں بلکہ آخرت ہوتا ہے۔ دنیا و مافیہا سے منہ پھیرے ہوئے ہمہ تن ہمت اور طاقت سے اپنے مقصود و مطلوب کے حصول میں ساعی ہوتے ہیں۔ اور فرمان ذوالجلال والاکرام ہے:

اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۳۹:۵۳) یہ کہ نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جس میں وہ کوشش کرے۔ (پ ۲۷۔ ع ۷)

تو ان کے نزدیک حیات دنیا کوئی چیز نہ تھی، اور اگر تھی تو آخرت کی حیاتی کے لیے۔ ان کا مقصود آخرت اور مطلوب مولیٰ کریم۔

آج اسلام اور ایمان کے معانی اور مفاد دریائے حرص و ہوا میں غرق ہو رہے ہیں۔ اور وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ کو طاق نسیان میں رکھ کر اسی کے فریفتہ اور شیدا وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ سے اعراض کیے ہوئے لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ سے جاہل

ہو رہے ہیں تو علم الیقین نے ان کو کیا نفع دیا؟

تو نے نہیں دیکھا جب جادوگر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تو فرعون سے وعدہ کے طلب گار ہوئے کہ "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں انعام ملے گا"؟ فرعون بولا "ہاں بلکہ تمہیں مقرب بنا لیا جائے گا"۔ آخر جب مقابلہ میں حق ظاہر ہوا اور وہ مغلوب ہو گئے تو بے ساختہ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کا نعرہ بلند کر کے سجدے میں گر گئے اور ایمان والوں میں شامل ہو گئے۔ فرعون یہ دیکھ کر غیظ و غضب میں بھر گیا اور بولا:

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ
فرعون بولا کہ پیشتر اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ
تم اس پر ایمان لے آئے؛ بیشک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد)

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ تو میں تمہارے ہاتھ

خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ
اور پاؤں جانب خلاف سے کٹوا دوں گا اور کھجور کے

النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا
تنوں پر سولی چڑھا دوں گا۔ اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ

وَّاَبْقٰى ○ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا
ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر تک رہنے

جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا
والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو دلائل ہمارے پاس آ گئے

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ
ہیں ان پر اور جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اس پر ہم تجھ کو ہرگز ترجیح

هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۭ اِنَّآ اٰمَنَّا
نہیں دیں گے۔ تو جو تجھے کرنا ہے کر چک اور تو جو حکم دے

بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا
سکتا ہے تو صرف اسی دنیا کی زندگی میں۔ ہم اپنے پروردگار

عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ
پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف

وَّاَبْقٰى ○ (۲۰: ۷۱، ۷۲، ۷۳ - پ ۱۶ رکوع ۱۴)
کردے اور اسے بھی جو تم نے ہم سے زبردستی جادو کروایا ہے اور خدا بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

نہایت قابل غور، سبق آموز اور بصیرت افروز قصہ ہے کہ جب جادوگر مغلوب ہوئے اور دیکھا کہ ہمارے بنائے ہوئے سانپوں کو ایک اژدہا جس کا اصل عصا تھا، کھا گیا ہے تو انہیں کوئی شک و شبہہ نہ رہا کہ لوگوں کی نظروں میں نظر بندی کر کے لکڑیوں اور رسیوں کے سانپ متحرک بنا دکھانا تو جادو کا فعل ہے۔ بمصداق کلام الٰہی:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ
پس ناگہاں رسیاں ان کی اور لاٹھیاں ان کی خیال بندھا

مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ (پ ۱۶ - ۲۰)
تھا طرف اس کی جادو ان کے سے یہ کہ وہ دوڑتے ہیں۔

لیکن ایک لکڑی کا بحکم خدا سانپ بن کر ان رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل جانا جادو نہیں ہو سکتا۔ تب ان کو حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور ہارون علیہما السلام کی صداقت کا یقین ہو گیا۔ سجدہ میں گر پڑے اور رب موسیٰ و ہارون کا اقرار کر لیا۔ لیکن بعد از ایمان جب عنایت الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور معانی ان پر ظاہر ہوئے تو نور ایمانی سے دل زندہ ہو گئے۔ تب حیات الدنیا کو ہیچ سمجھے اور جذبۂ حقانی سے مست ہو کر ؎

خوردہ یک جرعہ از کف ساقی ہرچہ فانی ست کردہ باقی

دامن از فکر غیر افشاند لَيْسَ فِي الدَّارِ غَيْرَهٗ خواند

فرعون کو صاف جواب دیا کہ تو کیا کر سکتا ہے؟ بہت ہوگا تو حیات الدنیا میں ایذا دے گا،

یا قتل کرے گا تو اس کی ہمیں کچھ فکر نہیں اور نہ ہی ہمارا کوئی نقصان ہے۔ ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں ــــ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ ــــ دانش مند کے لیے ان آیات میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ پہلا اقرار اور ایمان دلائل کی رُو سے رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ اسلام کی مانند تسلیم کرنا تھا۔ لیکن جب انوارِ الٰہی کی بارش سے قلب سیراب ہوئے اور رویت کی روئیدگی سے عین الیقین حاصل ہوا تو اٰمَنَّا بِرَبِّنَا کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔

دلائل تو فرعون تک بھی ایسے ہی پہنچے تھے جیسے جادوگروں کو۔ بلکہ اس کی دعوت کے لیے مولیٰ کریم کی طرف سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو بالخصوص فرمان تھا کہ "ان نشانات اور دلائل کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ، شاید وہ غور کرے"۔ بلکہ جادوگروں سے زیادہ نشانات اس نے دیکھے تھے۔ مطابق فرمان فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ "یعنی نو نشانات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف داعی ہوئے۔ فرق یہ تھا کہ یدِ بیضا اور عصا بڑی نشانیاں تھیں۔ اور فرعون بلکہ اس کے اراکین کے دلوں میں یقین ہوچکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق لے کر آئے ہیں، اور یہ یدِ بیضا اور عصا جادو نہیں ہے، معجزہ ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ	دلوں نے تو ان کا یقین کرلیا تھا مگر انہوں نے
ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ (۲۷:۱۴۔ پ ۱۹ ۔ ع ۱۶)	بے انصافی اور غرور سے انکار کیا۔

لیکن جب فرعون نے اپنی طرف دیکھا تو اس کو اپنی خدائی اور شاہی نے راہِ راست پر نہ آنے دیا اور حق سے باز رکھا۔ اور اس کو تکبر میں ملبوس کردیا۔ اس نعمتِ عظمیٰ اور حیاتِ جاودانی سے جس کو کبھی زوال نہیں آسکتا، بے نصیب کردیا اور جان بوجھ کر دنیا کی حقیر زندگی اور ناپائدار

زینت و جاہ و حشمت پر ہی رہ گیا۔ جب غرق ہونے لگا تب ایمان لانا بھلا معلوم ہوا۔ بولا:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ	ایمان لایا میں یہ کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ کہ ایمان
بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ	لائے ہیں ساتھ اس کے بنی اسرائیل اور میں
(پ ۱۱ ۔ ع ۱۴ ۔ س ۱۰ : ۹۰)	فرماں برداروں سے ہوں۔

مگر بے سود۔ کیونکہ مہلتِ دنیا کے گزر جانے اور وعدۂ الٰہی آجانے اور عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لانا کام نہیں دیتا۔

آج ہماری تصدیق بھی فرعونی تصدیق سے بڑھی ہوئی نہیں ہے اور نہ ہی ہماری نفسانیت اس سے کسی طرح کم ہے ؎

نفس ما را کمتر از فرعون نیست! لیک او را عون ما را عون نیست

کیونکہ آج نام نہاد مسلمان بھی جان بوجھ کر لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کو طاقِ نسیان میں رکھ کر اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے نشہ میں مخمور اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ سے جاہل وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ کے دھوکا میں ایسے گرفتار ہوئے ہیں کہ نقصان کو فائدہ اور نفع کو نقصان، میدان کو کھنڈر اور کھنڈر کو میدان سمجھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے اپنی تمام ہمت اور طاقت سے فکر و کوشش حیات الدنیا ہی پر خرچ کیے جاتے ہیں اور ظاہر و باطن باخلاص تمام جان و دل سے فریفتہ ہوئے جاتے ہیں۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ کے مرتکب ہو کر دنیا و مافیہا سے محبت رکھنے والے اور آخرت سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ انجام سے بے خبر اور موت کے شکار، غفلت کے

میدان میں نفس کے رہوار پر سوار حرص وہوا کا چابک ہاتھ میں لیے حجاب کے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ جس حیاتی یعنی وقت معین میں حصول آخرۃ اور حیات جاودانی مقصود تھا اور جس میں قوت سے سامان معیشت اور ہمت سے رجوع الی اللہ ادنیٰ درجہ تھا، وہ سب کا سب دنیا ومافیہا ہی میں صرف ہوگیا۔ عبادت وریاضت، فکر وغم جو تمام تر سرمایہ آخرت کا موجب تھا، اس کا تو ذکر ہی کیا۔ اگر ہُوا بھی تو مقصود دنیا اور مافیہا۔ ہمارے رکوع وسجود اور قیام وقعود سب اغراض دنیا سے ملبوس اور ہماری دعا ومناجات ہماری خواہشات سے ملوث۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ	جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب وزینت
زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا	کے طالب ہوں ہم دنیا ہی میں ان کے اعمال کا
وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ	بدلہ دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں
الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں
اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا	آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور جو کچھ اعمال
فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝	انہوں نے اس میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ
(۱۱: ۱۵-۱۶ - پ۱۲ - ع ۲)	کرتے رہے سب ضائع۔

دنیا چند روزہ زندگی ہے اور انسان غفلت کی نیند میں مستغرق، اور ایسا جاہل کہ جس کے لیے مولیٰ کریم نے وعدہ فرمایا کہ:

مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى	نہیں کوئی چلنے والا زمین میں مگر اللہ کے ذمے
اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱: ۶ - پ۱۲ - ع ۱)	ہے رزق اس کا۔

اس کی طلب میں مارا مارا پھرتا ہے، خونِ جگر پیتا ہے، بے قرار ہو ہو جاتا ہے۔ اور جس کام کے لیے جس مدعا کے واسطے اس کو پیدا کیا گیا ہے، جس فائدہ کے لیے اس کو عالم امر سے عالم شہود میں لایا گیا ہے، جس غرض کے لیے مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ کی میعاد سے مطلع کر کے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ) فرمایا ہے اُدھر رجوع ہی نہیں ہے خواب خرگوش کی مانند بے ہوش ہو رہا ہے۔ لیکن موت کے بعد جب اس وجود سے انتقال کرتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے کہ آہ! جس کی طلب میں رات دن میں جان ودل سے عاشق تھا وہ میرے کام نہ آسکی، اور آخرت کا میدان خالی رہ گیا۔ جس میں بے سروسامان بلکہ گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے داخل ہونا پڑا۔ مثل خواب حیات الدنیا میں اصل مقصود کو بھول کر محض لہو ولعب ہی میں نایاب وقت کو کھو بیٹھا، اور آج حسرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہُوا۔

کاش! آج اس وقت کی جو ہوا سے تیز جا رہا ہے، قدر ہوتی۔ اپنی سعی کو گمراہ نہ کرتے اور اس بے بہا دولتِ ہمت کو راہ پر صرف کر کے ابدی فلاح حاصل کرتے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ہمت باطنی ارادہ، قدرت اور فکر ہے۔ ظاہر وباطن کے سب کام انہی سے وابستہ اور انہی پر منحصر ہیں۔ ہر ایک امر کے لیے پہلے خیال کا ہونا معروف ہے اور خیال سے فکر قوت پکڑتا ہے تو ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور سب ارادے اس کی قدرت کے محتاج ہیں اور ہر طرح کی قدرت روح سے ہے۔ تو جس وجود کی روح کا میلان جسمانیت (بشریت) کی طرف ہو، یعنی جس انسان کا رُخ طبیعت کی طرف ہُوا اس شخص سے متعلقات جسم یعنی دنیا ومافیہا کی طلب کے سوا اور کچھ سرزد نہیں ہوتا ہے، اور اس کا مقصود دنیا کی زندگی اور

اس کا مطلوب سامان عیش وآرام وغیرہ ہی ہوتا ہے اور یہی اصل گمراہی ہے۔ خواہ نمازیں پڑھے اور حج ادا کرے۔ کیونکہ یہ جو کچھ بھی بظاہر کرتا ہے اگر اس سے اس کے باطن میں کوئی اثر پیدا نہ ہو تو بے سود ہے۔ بلکہ درجہ ایمان میں جو شخص زبان سے بظاہر اسلام کا اقرار کرے اور دل میں تصدیق نہ رکھتا ہو وہ عنداللہ منافق ہے جو اس کافر سے جو کسی شبہہ کی بنا پر یا تصدیق نہ ہونے کی وجہ انکار کرتا ہو، بدرجہا بُرا ہے۔ کیونکہ اس کی نسبت امکان اور گمان ہے کہ تصدیق کے بعد مومن ہو جائے۔ لیکن منافق باوجود مسلمان ہونے کے انکار رکھنے والا (یعنی کافر) ہے۔ اسی لیے ان کے حق میں وعید فرمائی ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝

(۴:۱۴۵ - پ۵ - س ۱۸)

بیشک منافق آگ کے سب سے نیچے کے درجے میں ہیں، اور تو ان کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہ پائے گا۔

اور یہ نہ ٹلنے والی گمراہی اور نہ ہٹنے والا اندھیرا ہے جس کے لیے کوئی چراغ نہیں۔ کیونکہ راستہ پر جس کا رُخ اُلٹ جائے اور روشنی سے جس کو اندھیرا ہو، نور سے ظلمت نصیب ہو۔ دین کی آڑ میں دنیا کمانے والا، اسلام کے لباس میں کفر چھپانے والا کس بات پر ایمان لائیگا جب کہ عین بصارت سے اندھا رہنا پسند کرے؛

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

(۱۷:۷۲ - پ۱۵ - س ۷)

جو شخص اس (دنیا) میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے سخت بھٹکا ہوا ہے۔

اس اعمیت سے مراد باطن کی آنکھ کا اندھا ہونا ہے، نہ بظاہر آنکھ کا جو کسی عارضہ سے اندھی ہو گئی ہو۔ کیونکہ اگر اسی ظاہری آنکھ سے مراد لی جائے تو ضرور ہے کہ سب اندھے یقیناً آخرت میں اندھے ہوں، اور یہ محال ہے۔ اسی لیے مولیٰ کریم نے دوسرے مقام پر اس کی توضیح فرما دی ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝

(۲۲:۴۶ - پ۱۷ - س ۱۳)

پس بیشک وہ نہیں اندھی ہوتیں آنکھیں ولیکن اندھے ہو جاتے ہیں دل جو کہ سینوں کے اندر ہیں۔

دل کا اندھا ہونا انکار کے اندھیرے اور ایمان کی ضیا سے بے بصر ہونے کی وجہ سے ہے۔ مگر یاد رہے کہ وہ بصیرت ایمانی اور نور ایقانی جو دل کی آنکھ کے متعلق ہے اس کا ماخذ بھی یہی آنکھیں ہیں، اور اسی آلہ اور اسی راستہ ہی سے لقاء ربانی اور مشاہدۂ یزدانی اور نور سبحانی سے معرفت کا ہونا قرار پاتا ہے۔ خواہ بظاہر آلہ بگڑ کر بند ہو گیا ہو تاہم باطن کی روشنی کے منافی نہیں ہے۔ جیسے الہام اور وحی کے لیے کان ہی مخصوص ہیں اور کان کا بند ہونا اس کا منافی نہیں ہے۔ اے عزیز! دیکھ سورۂ کہف میں کیا تصریح ہو رہی ہے:

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ (پ۱۶ - س ۲)

اور اس روز دوزخ کو ہم کافروں کے سامنے لائیں گے جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

زبان سے ذکر کرنا تو عوام کو معلوم ہے، اور دل میں یاد کرنے کو بھی سمجھتے ہیں لیکن آنکھوں کا ذکر یا یاد جو دیدار اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے نہیں سمجھ سکتے۔ اور یہ بصیرت قلبی ہے بقول شخصے ذِكْرُ اللِّسَانِ لَكْلَكَةٌ وَذِكْرُ الْقَلْبِ وَسْوَسَةٌ وَذِكْرُ الرُّوحِ رَاحَةٌ۔ اور قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر عضو کی عبادت اس کے فعل سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور مطابق فرمان ایزد متعال قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کے طریقہ اور سنت الٰہی پر عمل ہوا کرتا ہے۔ جیسے ہاتھوں کی عبادت سخاوت کرنا، جہاد فی سبیل اللہ میں تلوار چلانا اور طاقت کا خرچ کرنا ہوتا ہے۔ پاؤں کی عبادت سوائے قیام اور چلنے کے اور نہیں ہوتی۔ اسی طرح کان کی عبادت سننے اور زبان کی عبادت پڑھنے یا بولنے یا ذکر کرنے کے سوا نہیں ہے۔ اسی طریقہ پر آنکھ کی عبادت سوائے دیکھنے کے محال ہے ـــــ کہا جاسکتا ہے کہ آنکھوں کی عبادت قرآن مجید کا پڑھنا اور دیکھنا، یا قدرت خدا پر نظر کرنا ہے۔ لیکن اس صورت میں اُمّی یا اندھا اس سے محروم ہوگا۔ اور یہ بعید از انصاف ہے، جو محال ہے۔ گو معانی بظاہر آنکھ کے عمل پر مبنی ہیں لیکن حقیقت بصارت قلبی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اندھا رہنا بموجب قرآن شریف: لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ قلب کے اندھا ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ بالکل عیاں ہے کہ کافر بظاہر اندھے نہیں ہوا کرتے۔ گو بصارت قلبی بھی انہی بظاہر راستوں کی مقید ہے یعنی اپنے محل پر ہی اس کا عمل درآمد ہوا کرتا ہے۔ لیکن بظاہر آلہ کی محتاج نہیں خواہ وہ بگڑ کر بیکار ہو جائے جیسے کہ اوپر گزر چکا ہے۔

بظاہر آنکھ سے قدرت کا معائنہ بغیر رویت گو کسی قدر عبادت میں داخل ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت کے یہ بھی خلاف ہے۔ کیونکہ مومن کی نظر میں خدا کی قدرت کا معائنہ اس کی صنعت پر دلیل ہوتا ہے اور کافر کی نظر میں صرف عجائبات کا ملاحظہ یا اشیاء کی حقیقت یا نشوونما کی ابتدا وانتہا اور بس، كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ط (۲۳:۸۴-۸۵) پ۱۸ - ع۵ -	کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ) زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا مال ہے؟ جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا۔

چونکہ یہاں ذکر سے مراد آنکھ کا مشاہدہ ہے اس لیے یہ معنی درست نہیں ہو سکتے ہیں۔ جو عوام مومن و کافر میں یکساں پائے جائیں۔ بظاہر آنکھ کا مشاہدہ موجودات تک محدود ہے لیکن بصارت قلبی جس کا انحصار حجاب کے دور ہونے کے سوا روا نہیں ہے حقیقت سے وابستہ ہے۔ جب حجاب قلب دور ہو جاتے ہیں تو ایسے شخص کی نظر بصارت میں ہر شے کے حجاب کی نفی ہو جاتی ہے اور اس کا مشاہدہ حق پر ہو جاتا ہے۔ اور موجودات کے وجود کا حجاب اس کی نظر میں نہیں رہتا ہے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درجۂ احسان کی تعریف میں فرمایا ہے۔ درجۂ احسان میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ گویا تو مولیٰ کریم کو دیکھ رہا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ کہ تو جانے کہ بہر حال تجھے مولیٰ کریم دیکھ رہے ہیں۔ درجۂ اول کا انحصار رویت پر ہے اور درجۂ ثانی کا مدار علم پر۔ اور علم الیقین کا حصول سماعت سے تعلق رکھتا ہے اور علم رویت بصارت سے۔ اسی لیے فرمایا ہے کہ "ان کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں تھیں اور وہ (اس لیے کہ) وہ سننے کی قوت نہ رکھتے تھے۔ یا دوسرے معنوں میں وہ سنتے ہی نہ تھے یعنی وہ ہدایت کی

طرف آنا نہیں چاہتے تھے، ورنہ کچھ سنتے جانتے۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ اگر اللہ جانتا ان میں نیکی تو ان کو سننے کی

(۸: ۲۳ - پ۹ - س ۱۷) توفیق دیتا۔

حواس خمسہ میں سب سے زیادہ موثّر سماعت اور بصارت ہے۔ انہی کے ذریعہ سے سماعت دماغی اور قلبی ہوتی ہے۔ کسی علم کا حصول ان دونوں قوتوں کے بغیر نہیں: صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ بچپن سے آخر عمر تک اسی سلسلہ سے نیک و بد اور خیر و شر کا دصول ہے۔ جب بچہ استاد سے الف پڑھتا ہے تو جب تک اسے الف کی شکل (ا) سے عارف نہ کر دیا جائے رویت الف سے جاہل رہتا ہے۔ ایسے ہی تمام حروف کا صرف وجود دیکھنے سے علم محال ہے جب تک سماعت سے حرف کا نام قوت حافظہ کے سپرد نہ کیا جائے۔ اسی لیے پہلے دعوت کے لیے سماعت کارآمد ہوتی ہے لیکن بعد میں حقیقت کا انحصار رویت ہی پر ہے۔ جیسے اندھا حافظ بن سکتا ہے، پڑھا بھی سکتا ہے لیکن حروف والفاظ کی شکل سے عارف نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو دل کا اندھا ہو وہ باوجود آنکھ رکھنے کے اندھا ہے۔ فرمان ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ اور ہم نے بہت سے آدمی اور جن دوزخ کے

وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے

بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے

وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر ان سے

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ سنتے نہیں۔ یہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ

هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷: ۱۷۹ - پ ۹ - ان سے بھی بے راہ، یہ وہی ہیں جو غفلت میں

رکوع ۱۲) پڑے ہوتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ باوجود بظاہر دیکھنے، سننے اور سمجھ رکھنے کے اندھے، بہرے اور بے سمجھ ہیں۔ یعنی وہ نور ایمان جو دل میں روشن ہو اور اس سے ہدایت پائیں، اس سے دل خالی ہیں۔ گو منافق عبادت کرے مگر اس کی عبادت بے نور اور ارادہ باطن اس سے دور ہے۔ مطابق کلام الٰہی:

لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى نہیں آتے نماز کو مگر وہ کاہلی کرتے

(پ۱۰ - رکوع ۱۳ - س ۹: ۵۴) ہیں۔

منافق کے علاوہ فاسق بھی اگرچہ شریعت کے حکم سے مومن ہے لیکن وہ بھی اس نور سے بے نصیب ہے جس سے ہدایت یاب ہو:

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت کرتا فاسقوں کی

(۹: ۲۴ - پ۱۰ - س ۹) قوم کو۔

منافق اور فاسق کا فرق صرف اتنا ہے کہ منافق تصدیق قلبی سے محروم ہے۔ اور فاسق باوجود تصدیق قلبی کے بے نصیب ہے اور باوجود راہ راست پر ہونے کے رجوع سے کاہل ہے اور ہدایت کی طرف نہیں آتا۔ یعنی جوارح سے احکام خداوندی کی فرماں برداری نہیں کرتا، سعی نہیں کرتا۔ تو جب تک انسان مولیٰ کریم سے طالب نہ ہو، التجا نہ کرے، وہ غنیٌّ عن العالمین بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ مِنْ دُوْنِ اللّٰہ سے جب کوئی شخص سوال

کرتا ہے، کچھ مانگتا ہے تو وہ اعراض کرتا ہے، اور بار بار سوال کرنے سے سخت ناراض ہوتا ہے رد کرتا ہے، حتیٰ کہ دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ برعکس اس کے مولیٰ کریم سوال کرنے والے پر خوش ہوتے ہیں، رد نہیں کرتے حتیٰ کہ بار بار التجا پر زیادہ خوش ہوتے ہیں اور قبول فرماتے ہیں۔ اور نہ مانگنے والے کی صرف یہ نہیں کہ پرواہ نہیں کرتے بلکہ ناراض ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۚ	کہدو میرے حبیب کہ اگر تم خدا سے التجا نہ کرو تو
فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا	میرا پروردگار بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں کرتا تو تم نے
(۲۵: ۷۷۔ پ۱۹۔ ع ۴)	تکذیب کی سو اس کی سزا تمہارے لیے لازم ہو گئی۔

منعم حقیقی سے نہ مانگنے میں دو نقصان ہیں۔ ایک تو دعا عبادت کی ایک قسم ہے۔ جس سے التجا نہ کرنے والا محروم ہے۔ دوسرا دین و دنیا اور آخرۃ میں اس کے سوا کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے اور وہ ایسا کریم ہے کہ مانگنے والا اس کے دروازہ پر صاحب وصول اور عزت والا ہے۔ تو وہ اس نعمت ابدی سے بے نصیب ہو رہا ہے۔ اور یہ اس کی بے توجہی کا ثمرہ اور سزا ہے کہ مالک حقیقی اس کے حال پر عنایت کرنے سے لاپرواہ ہیں۔ جو سخت گمراہی کا موجب ہے۔

لیکن "اس نے تکذیب کی اور اس تکذیب کی وجہ سے اس پر سزا لازم ہو گئی" میں عجیب نکتہ ہے۔ عوام کا قاعدہ اور فاسق کا دستور ہے کہ جب کسی کتاب سے یا کسی واعظ سے کوئی نصیحت سنتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ "جی درست ہے۔ سب حق اور سچ ہے، ہماری بدنصیبی ہے"۔ یا کہتا ہے کہ "جی دعا کرو! خداوند کریم مجھے بھی ہدایت دے"۔ لیکن یہ ایسا انکار ہے جو اقرار کے

رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ بعض کفار بھی ایسا کہتے کہ اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ہدایت یاب ہو جاتے۔ اور یہ رب العلمین پر سخت الزام ہے کہ وہ ہدایت نہیں دیتے۔ کیونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور وہ اس قول میں کاذب ہیں۔ چنانچہ مولیٰ کریم صاف ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص دل سے رجوع کرتا ہے اس کو ہدایت دینا ہمارے ذمہ ہے۔ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔ یا فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى۔ دوسری جگہ زیادہ تصریح کے ساتھ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ	اور جن لوگوں نے محنت کی بیچ راہ ہماری کے
سُبُلَنَا ؕ (۲۹: ۶۹۔ پ۲۱۔ ع ۳)	البتہ دکھائیں گے ہم ان کو راہ اپنی۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کو لغزش کی وجہ سے دنیا میں بھیجا تو فرمایا کہ تم اور تمہاری اولاد ایک مدت معینہ تک اسی جگہ رہا کرو گے۔ اور ساتھ ہی ارشاد ہوا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ	پھر اگر میری طرف سے، تمہارے پاس ہدایت آئے
اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى	تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو نہ گمراہ
وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ	ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔ اور جو میرے ذکر
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی تنگ ہو جائیگی
اَعْمٰى ۝ (۲۰: ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ پ۱۶۔ ع ۱۶)	اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

پھر سمجھ نہیں آتی کہ وہ ذات رحیم جو خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ میں نے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اپنے نفس پر رحمت کو لازم کر رکھا ہے تو کیسے ہدایت نہیں دیتے ہیں۔ بوجہ نادانی کے خود ہدایت سے گریز کر کے اپنے پر ظلم کر رہے ہیں۔ مولیٰ کریم مطابق فرمان خود وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ

أَحَدًا کسی پر ظلم نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ماں باپ سے زیادہ شفیق ہر رفیق سے بڑھ کر رفیق ہمارے وہم وگمان سے ورا، ہماری عقل سے بعید نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ؎

یار من نزدیک تر از من بہ من ست — وین عجب تر کہ من از وے دورم

چہ کنم، با کہ تواں گفت، کہ او! — در کنار من و من مہجورم

اگر قرآن شریف کو نظرِ عمیق سے دیکھا جائے تو اس منعم حقیقی نے انسان کو عین ہدایت پر پیدا کیا ہے۔ ہر چیز کو اس کا مسخر کیا ہے اور انسان کو اپنی فرماں برداری کے لیے حکم صادر فرمایا ہے۔ لیکن اس فرماں برداری کا پھل اور اطاعت کا مقصود، اس محنت سے حصول اور مراد مولیٰ کریم کی محبت اور عرف ہے، جو عین ہدایت اور ہدایت کا مقصد اور ثمر ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ چونکہ یہ میدان آزمائش ہے اور نفس کا حجاب ایسی بلا ہے کہ اس سے بچنا اور صراط المستقیم پر چلنا آسان کام نہیں۔ نفس کا سب حکم ظاہر پر ہے اور ایمان کی سب رویت اور حقیقت يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ پر ہے۔ آج کون ہے جو اسلام کے چہرے اور نورِ ایمانی سے عارف ہو کر انوار اور لینتِ قلب، کا بے بہا خزانہ پا سکے، جبکہ سراسر خواہشات اور حیات الدنیا کے فریفتہ اسلام اور قوم کی ترقی اور بہبودی کا انحصار مال وجاہِ دنیا ہی پر سمجھ رہے ہیں۔ اور فرمان مولیٰ کریم ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا — جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع ہی نہیں اور دنیا

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ — کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۙ — ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں۔ ان

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا — لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے

يَكْسِبُوْنَ ○ (۱۰: ۷-۸۔ پ۱۱۔ ع۶) — تھے، دوزخ ہے۔

گو اس کا شان نزول کفار کے حق میں ہے لیکن عمل اور حال کی رو سے کافر اور مومن اس میں برابر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مومن رب العالمین کے دربار میں حاضر ہونے کی اور اس کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اور کافر نہیں رکھتا۔ کافر حیات آخرہ اور ملاقات ربّ العالمین کا منکر ہے اس لیے وہ حیات الدنیا پر راضی اور مطمئن ہے۔ اگر مومن باوجود ایمان کا مدعی ہونے کے رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا ہے تو ایمان اور ایقان کس بات پر ہے؟ جبکہ وہ ذات قدیم حیاتِ دنیا کو کھیل تماشہ اور آخرت کو ہمیشہ کی اصل حیاتی فرما رہے ہیں، اور حسرت کے الفاظ سے غفلت کی نیند سے جگا کر لاعلمی سے مطلع کر رہے ہیں۔ کہ کاش! یہ لوگ جانتے ہوں۔

سواے بھائی! جب تک تیرے قدم اس دار فنا سے اُٹھ نہ جائیں اور آخرت یعنی دار بقا کی طرف استقامت نہ پکڑیں، طلب حق کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

دراصل لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا کسی اُمید پر دال ہے۔ اور قاعدہ کلیہ ہے کہ اُمیدیاب کا ہونا طلب کے سوا محال ہے۔ تو فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کا عمل کب ظہور پذیر ہو سکتا ہے؟ اور اُمیدِ لقائی الدنیا و آخرہ کہاں جب کہ ہم حیات الدنیا پر ہی راضی ہو گئے ہوں۔ اور ہمارے قلب اسی پر ہی مطمئن ہو بیٹھے ہوں؟ آج کون ہے جو اپنے مولیٰ کریم کے لیے بے قرار اور اپنے آپ سے بیزار ہو؟ ہاں! اپنے نفس کے لیے اس مالک پروردگار پر ناراض ہوتے رہتے ہیں ؎

ہر کہ او از خویشتن بیزار گشت   بیشک او از محرم اسرار گشت

اس مقام حصول پر بیدار اور ہوشیار ہونا چاہیے اور سر پر خاک ڈالنی چاہیے۔ وقت ہوا سے تیز جا رہا ہے۔ نہ معلوم کل کیا ہونے والا ہے۔ یہ قیمتی سرمایہ جو سانس کا سانس بن کر ہاتھ سے جا رہا ہے' واپس نہ آئے گا۔ انسان ایک دن واپس دنیا میں آنے کے لیے تڑپے گا' مگر بے سود' ہرگز نہ آسکے گا۔ تجھے جب قدر معلوم ہوگی' مگر بے حاصل۔ اُٹھ! آج اپنے کام کی فکر کر تاکہ تجھ پر رحم کیا جائے۔

حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ پر جب جلاد قتل کے لیے ہاتھ چلانے لگا تو آپ کے شاگرد نے جلدی سے نوری رحمۃ اللہ علیہ کو پیچھے ہٹا کر اپنی گردن جلاد کے آگے رکھ دی۔ پھر نوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ جلاد حیران ہوا اور یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ اس نے دریافت کیا کہ "یہ کیا ماجرا ہے"؟ فرمایا' "دنیا کی ایک گھڑی ہمارے لیے آخرت کے ہزار سال سے بہتر ہے' اور ہمارا مذہب ایثار ہے۔ ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ وہ سانس جو پہلے میرے قتل ہونے کی وجہ سے توقف ہوگا وہ میرے بھائی کے کام آئیں"۔

ہیہات! آج ہم کو اس طرف سے حصہ ہی نہیں۔ یہ دولت کہاں اور ہم کہاں۔ کافر' منافق اور فاسق تو درکنار' مومن اور مسلمانوں کا بھی آج عجیب حال ہے حقیقت اسلام اور روح ایمان سے جاہل ہو رہے ہیں۔ ایک رسم و رواج کی مانند عمل کا نام دین رکھ لیا ہے، قانون اسلام اور تعزیرات دین کا علم حاصل ہونے پر مولانا، نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ جبراً و قہراً ادا کر کے مومن' اور اجازت کو غنیمت جان کر معصیت اور دنیا و مافیہا کے شیدا، دین کے رنگ میں دنیا

کمانے کے لیے مسلم۔ گویا ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیل رہے ہیں۔ ہم کجا اور دین کا رستہ کجا۔

تو نے نہیں دیکھا، جب گنوار لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا تو اس عزیز الجبار کی طرف سے کیا ارشاد ہوا؟:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا	دیہاتیوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دو کہ
وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ	تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ اسلام لے
الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا	آئے اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہوا
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ	ہی نہیں۔ اور اگر تم خدا اور اس کے رسول کی فرماں
اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	برداری کرو گے تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ
رَّحِيْمٌ ۞ (۴۹:۱۴ ۔ پ۲۶ ۔ ۱۴/۱۴)	کم نہیں کرے گا۔ بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تو جب وہ اسلام لا چکے اور تسلیم کر چکے تو ضرور کسی تصدیق اور یقین کے بعد ہی کیا ہوگا۔ اور ایمان اور ایقان دو چیز نہیں۔ تو پھر یہ نفی من اللہ کیوں ہوئی؟ اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی ہے کہ جو تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری میں عمل کرو گے تو اس میں سے کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔ اور امر مسلمہ ہے کہ کوئی عمل بجز ایمان کے قبول نہیں ہوتا۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو وہ منافق تھے نہ کافر اور فاسق' بلکہ مسلمان تھے۔ لیکن ابھی مومن نہ تھے۔ جیسا کہ فرمایا ہے کہ ہنوز تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا	لائے پھر کچھ شک نہ کیا اور خدا کی راہ میں مال

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ جان سے مجاہدہ کیا۔ یہی لوگ صادق ہیں۔
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (پ ۲۶) (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۵)

اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ وہ منافق تھے اور ابھی ان کے دلوں میں تصدیق نہ تھی صرف زبانی اقرار کرنے والوں میں سے تھے۔ لیکن یہ خلاف حقیقت ہے۔ کیونکہ حکم ہو رہا ہے کہ اے میرے حبیب! ان سے کہو کہ تم خدا کو اپنی دینداری جتاتے ہو؟ نیز فرمایا کہ یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوگئے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ اپنی مسلمانی کا احسان مجھ پر نہ رکھو ایسا نہیں ہے:

بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ ۔ بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان کا رستہ
لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ۔ دکھایا۔ بشرطیکہ تم سچے ہو۔ (حجرات۔ آیت ۱۷)

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہدایت من اللہ ہے اور اس کو اپنے کسب یا مجاہدہ کے رو سے جاننا سخت خطا اور کذب ہے اس لیے فرمایا کہ اگر تم اپنے حال میں صادق ہو تو اللہ کا احسان مانو جس نے تمہیں ہدایت کا راستہ دکھا دیا، نہ کہ اُلٹا احسان خدا پر رکھو۔ یہ آیت نہ ایمان کی نفی کرتی ہے نہ اسلام کی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اے ایمان والو! ایمان لاؤ جس طرح حق ہے ایمان لانے کا اللہ اور اس کے رسول پر۔ یہ اسی طرح ہے جیسے فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۔ کہ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ مدارج ایمان میں ہر چند فرق ہے۔ جیسے حدیث شریف میں درجۂ احسان میں بیان فرمایا ہے: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ

تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ ۔ یعنی تو اس مالک حقیقی کی عبادت میں ایسا محو و مستغرق ہو کہ واقعی تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اور کم درجہ یہ ہے کہ تیرے دل کا دھیان اس درجہ تک ہو کہ وہ مالک تجھے دیکھ رہا ہے اور تیرے دل کے بھیدوں کا علیم ہے۔

یقین کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ علم الیقین ہے، دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین ہے۔ مثلاً ایک گھڑا جس میں پانی بھرا ہو، اور اس کا بظاہر (بیرونی حصہ) تر نظر آتا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ اس میں پانی ہے۔ لیکن یہ کہنا علم الیقین ہے کیونکہ تراوت کی وجہ سے گمان اغلب ہے کہ اس میں ضرور پانی ہے۔ اس کو علم اُصُول میں نسبت کہنا بجا و درست ہے۔ لیکن جب چپنی اُٹھا کر دیکھ لیا کہ یہ پانی اس میں موجود ہے تو یہ عین الیقین یا حکم ہو گیا کیونکہ پانی کی موجودگی میں کوئی شک و شبہہ نہ رہا۔ لیکن ابھی اس کے ذائقہ (تلخ یا شیریں) کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی۔ اور جب اٹھا کر پی لیا تو حقیقت کھل گئی، بلکہ واحد ہو گئی۔ اور یہ حق الیقین ہے۔ تو جب رویت ہو جاتی ہے گمان نہیں رہتا۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ۝ ۔ یعنی ظن یقین کے بعد کچھ کام نہیں دیتا۔

حضرت علی جرجانی قدس سرہٗ کا قول کیا ہی عجیب ہے۔ فرماتے ہیں کہ "خدا کا گمان اس کے بھید سے باہر نہیں ہوتا۔ مگر خدا کے جلال یا جمال کی رویت سے باہر ہے کیونکہ اس کے اظہار میں بالکل خدا کو دیکھتا ہے اور گمان فانی ہوتا ہے"۔ تو صاف ظاہر ہے کہ جب رویت ہوتی ہے گمان نہیں رہتا۔ اور یہ نور ایمانی دل میں داخل ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ عین خطراتِ قلب ہیں جن کا مایہ عین محبت الٰہی ہے۔

مردانِ راہِ خدا میں سے ایک بزرگ کسی جگہ بیٹھے اپنے مولیٰ کریم سے مناجات کر رہے تھے۔ کوئی شخص پیچھے سے آیا اور سلام دیا۔ آپ چپ ہو گئے اور سلام کا جواب دیا۔ اس نے دریافت کیا "آپ یہاں اکیلے بیٹھے ہیں"؟ فرمایا "تیرے آنے سے اکیلا ہو گیا ہوں"۔ پوچھا "آپ یہ مکالمہ کس سے کر رہے تھے"؟ فرمایا "اپنے پروردگار عزّ و جلّ سے"۔ وہ شخص بولا "مجھے تو آپ کے روبرو سوائے چند پتھروں کے کچھ نظر نہیں آتا"۔ فرمایا "او جاہل! میں اپنے دل کے خطرات دیکھ رہا تھا ــــ سبحان اللہ وبحمدہٖ! باوجود عارف یعنی مومن ہونے کے اپنے حال سے علم رکھنے والے تھے ــــ بس! اسی لیے فرمایا ہے کہ "ابھی تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے" یعنی وہ نور جس سے رویت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ فکر کی ہمیشگی اور محبت کے غلبہ کے سوا نہیں ہے۔ اور جب تک دنیا و مافیہا سے اعراض اور حُبّ الشہوات یعنی تمام مائل کی گئی چیزوں کی طرف سے دل کا انقطاع نہ ہو، یہ معنی ظاہر ہونے محال ہیں۔

آج جب کہ ظلمات کی گھٹائیں سمائے اوج پر چھا رہی ہوں اور نفی مُثبَت کے فلسفہ سے چمک کر گونج رہی ہوں، اور ایسی تاریکی کو نئی روشنی سے نامزد کرنے والے دانا اور عقلمند اپنے زعم اور خیال باطل میں مستغرق، دین الحق کے لیے مستہزئون، طولِ اَمَل کے میدان میں خواہشات کے ٹٹو پر سوار ہو کر هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کی تصدیق کر رہے ہوں تو آفتابِ معرفت کی کرنیں ان کے لیے کب صراط المستقیم پر جلوہ فگن ہو سکتی ہیں جس سے علم حق اور مشاہدہ سے رویت اور حقیقت سے حق الیقین حاصل ہو؟ اسی وجہ سے

معرفتِ الٰہی

میں سخت اختلاف ہو رہا ہے۔ اور انسان پر اس سے زیادہ اور سخت مشکل کسی امر میں واقع نہیں ہوئی ہے۔

اسلام میں ایک گروہ اس بات پر ہے کہ دیدارِ الٰہی دنیا میں ہونا روا نہیں ہے لیکن آخرت میں قیامت کے دن ضرور ہو گا۔ اور دوسرا گروہ قیامت کے دن بھی عرف و مشاہدہ ہونے سے منکر ہے۔ اور وہ اس دلیل پر ہیں کہ جب قرآن شریف میں صاف بیان ہے کہ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶:۱۰۴ - پ۷ - ۱۹)

نہیں ادراک کر سکتیں اس کا نگاہیں اور وہ ادراک کرتا ہے سب نگاہوں کا۔ اور وہ باریک بین ہے خبر رکھنے والا۔

تو پھر دیدار اور مشاہدہ کیسے روا ہو سکتا ہے؛ بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پروردگار سے سوال کیا:

رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (پ۹ - ۴۷)

اے میرے پروردگار! تو مجھے دکھا اپنے تئیں

تو جواب ملا:

لَنْ تَرٰىنِيْ (۷:۱۴۳ - پ۹ - ۴۷)

تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ پیغمبر اولوالعزم سب ہستیوں سے برگزیدہ اور بنی آدم میں سے افضل ترین اور خداوند کریم کی معرفت میں سب سے زیادہ عارف ہیں۔ تو جب ان کو یہ جواب ملا کہ "ہرگز نہ دیکھ سکو گے"۔ تو عام مومن کا مولیٰ کریم کو دیکھنا کس طرح ممکن اور روا ہو سکتا ہے؟

اے بھائی! (خداوند کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے) لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ سے مراد ادراک اور احاطہ ہے، جو واقعی ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ چگونگی ذات باری تعالیٰ میں حرام ہے اور جان کہ کوئی ایک چیز جب دوسری چیز پر محیط ہو تو وہ دوسری شے محیط پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ مثلاً ہوا ہر چیز پر محیط ہے تو یہ محال ہے کہ کوئی شے اس پر محیط ہو سکے۔ تو بھلا اس خالق کون و مکان، بے مثل و بے نشان کی کنہ یا اس ذات بے نہایت کا ادراک اور احاطہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جو خود بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ہے۔ اور یہ بھی سمجھنے کے لیے، ورنہ اس باری تعالیٰ کا عرف کس سے اور کس چیز سے جبکہ ہر چیز کی ہستی اور قدرت اسی مالک الملک سے ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا عَرَفْتُ رَبِّيْ بِرَبِّيْ۔ یعنی میں نے اپنے رب کو رب ہی سے پہچانا ہے۔ یعنی اسی کے نور سے ہی عرف ہوا ہے۔

اس میں تو کلام نہیں کہ یہ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور نہ ہی دیکھ سکیں گی۔ اور یہی ان صاحبان کی غلطی کا اصل اور سبب ہے۔ کیونکہ اگر یہ آنکھ مولیٰ کریم کے مشاہدہ اور دیدارِ الٰہی کا محل ہو سکتی تو ضرور تھا کہ سب آنکھ والے دیکھ سکتے اور ظاہر میں عارف ہوتے۔ اور یہ محال ہے۔

اے بھائی! سمجھ، جب آفتاب دنیا کسی سخت آندھی یا کالی گھٹا میں ایسا چھپ جاتا ہے کہ بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے تو یہ آلۂ بصارت یعنی آنکھ صحیح و سالم، تندرست بغیر کسی نقص کے اندھی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب تک آفتاب کی روشنی اس کو ضیا نہ بخشے یہ آفتاب وغیرہ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح جب تک آفتابِ معرفت قلب پر جلوہ فگن نہ ہو اور اس کے نور سے آنکھ

روشن نہ ہو، چشم بصیرت کو عرف کیسے ہو سکتا ہے؟ ؎

چو تو پنہاں شوی از من ہمہ تاریکی و کفرم
چو تو پیدا شوی بر من مسلمانم بجان تو

اُوپر گزر چکا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ جس کو واضح کرنے کے لیے تصریح فرمائی ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ یعنی جو یہاں اندھا ہے وہی آخرت میں اندھا ہوگا۔ اور یقیناً یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن جو دل سینوں کے اندر ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بینائی اور اعمیت سب قلب سے وابستہ ہے نہ بظاہر۔ کافروں کے حق میں ارشاد ہو رہا ہے کہ دوزخ ان کے سامنے ہم اس سبب سے لائیں گے کہ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ ان کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں تھیں۔ اور آنکھوں کی یاد سوائے دیکھنے کے محال ہے۔ جیسے زبان کا ذکر بولنے سے اور کان کا سننے سے۔ تو جب کفار کے لیے آنکھ کا پردہ یادِ الٰہی سے جو مشاہدہ اور دیدار کے سوا نہیں ہو سکتا، روا ہے تو ضرور مومن کے لیے آنکھ سے دیکھنا روا ہے۔ اور نورِ معرفت سے مومن دیکھنے والا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ	بھلا جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے (دین)
فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ	اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور اپنے پروردگار
لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ	سے روشنی پر ہے (تو کیا وہ سخت دل کافر کی
اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (پ ۲۳، ر ۱۷)	طرح ہو سکتا ہے؟) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل

(۲۲ : ۳۹) خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہوں یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

رہا سوال حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام رَبِّ اَرِنِیْ تو اس سے ان کا مطلب کما حقہٗ دیکھنا تھا جس کے جواب میں لَنْ تَرَانِیْ کا ارشاد ہوا۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ ورنہ نبوت کی پہلی ہی رات جب جنگل میں روشنی دیکھی اور آگ سمجھ کر رستہ معلوم کرنے یا آگ لینے کے لیے وادیٔ مقدس میں پہنچے تو پروردگار عالم نے فرمایا اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ۔ یعنی بیشک یہ تو میں اللہ ہوں، تو یہ عین حضور تھا اور رویت ظاہر۔ کیونکہ مومن یا ولی بھید میں جاتا ہے جو کچھ پاتا ہے ستر میں پاتا ہے، اور نبی جو کچھ پاتا ہے ظاہر میں پاتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ید بیضا اور عصا وغیرہ جو کچھ پایا ظاہر میں پایا، اور سب کو دکھا دیا۔ اور وہ اس لیے کہ نبی اپنی نبوت کا مدعی ہوتا ہے اور دعویٰ اس کے لیے لازم۔ برعکس اس کے ولی کے لیے دعوی کی کوئی صورت درست نہیں ہوتی۔ اس کے لیے اخفا ہی بہتر اور اولیٰ ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی کے واسطے اس بظاہر آنکھ سے دیدار و رویت مولیٰ کریم روا ہے۔ لیکن اب لَنْ تَرَانِیْ (تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا) ایسا اشکال ہے کہ یہ سب معنی فوت ہوئے جاتے ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ ہمیں نبی و مرسل کے حال سے کچھ حصہ نہیں۔ بلکہ نبی تو درکنار، ہم کو ولی کے حال سے مطلع ہونا محال ہے۔ اور ایسا ہی ولی کے لیے نبی کے حال سے۔ تو جب ولی نبی کے حال سے جاہل ہوتا ہے، تو ہم تو اس ترازو کے پاسنگ بھی نہیں۔ رہا دلیل و قال سے، تو وہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سوال چگونگی ذات باری تعالیٰ پر تھا جس کے لیے لَنْ تَرَانِیْ کا جواب ملا۔ ورنہ تجلی تو اس وقت بھی ہوئی۔ فرمان مولیٰ کریم:

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ — پھر جب تجلی کی رب اس کے نے طرف پہاڑ کے کیا

خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (۹ پ - ۱۰) — اس کو ریزہ ریزہ اور گر پڑے موسیٰ علیہ السلام بے ہوش۔

اس لیے تجلیات، مشاہدہ، دیدار، یہ سب روا بلکہ مقصود ہے، اور چگونگی یا کما حقہٗ محال۔ اور یہ ہو بھی کیسے، جب (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اللہ تعالیٰ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ تو سب ہستی اور نور من اللہ ہے۔ تو پھر حباب دریا کو کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ اور ذرہ آفتاب کو کیا پا سکتا ہے؟

حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ وصول خداوند تعالیٰ کا وصول ایسا نہیں ہے جیسا جسم کا وصول جسم سے ہوتا ہے، یا جوہر کا عرض سے، یا علم کا معلوم سے، یا عقل کا معقول سے، یا شے کا شے سے، تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔

اسی طرح دیدار الٰہی بھی کسی دیدار کی مانند نہیں ہے۔ نہ ہی یہاں ادراک اور احاطہ کو کوئی دخل ہے۔ جو شخص حادث سے قدم کا فرق نہیں جانتا اس کا سمجھنا نہایت مشکل بلکہ اسے صاحب عرف کو سمجھانا بھی دشوار ہے۔ مشاہدہ اور دیدار یہ جو کچھ بھی ہے، حال کے تغیر اور حجاب کے دور ہونے کے سوا نہیں ہے:

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

اور یہ حال ہے جو تحریر و قال سے باہر ہے، اور یہ ایک حیاتی ہے جو باطن سے وابستہ ہے۔ اور یہ وہ علم ہے جس کے لیے کوئی حرف نہیں۔ لیکن جو شخص یہ علم نہ رکھتا ہو وہ سب علموں سے جاہل ہوتا ہے، اور عارف خواہ ظاہری علم سے ایک لفظ بھی نہ پڑھا ہو سب علموں سے

عالم ہوتا ہے۔ جو شخص اس حیاتی سے محروم ہو خواہ بظاہر زندہ نظر آتا ہو عند اللہ وہ مُردہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى۔ (تم مُردے کو نہیں سنا سکتے) اور جو زندہ ہے وہ مر کر یعنی عالم برزخ یا آخرت کی طرف منتقل ہو کر بھی زندہ ہے اور جو مُردہ ہے حیات الدنیا میں بھی مُردہ ہے۔ اور یہ زندگی حیات الآخرہ ہے نہ کہ دنیا۔ اور یہ بصارت و سماعت حیاتِ اُخروی ہے۔

زندہ اور مردہ

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ وَ	اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں، اور نہ اندھیرا اور
لَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۝ وَلَا الظِّلُّ	روشنی، اور نہ سایہ اور دھوپ، اور نہ زندے
وَلَا الْحَرُوْرُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ	اور مُردے برابر ہو سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ جس کو
وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ	چاہتا ہے سنا دیتا ہے۔ اور جو لوگ قبروں
يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي	میں ہیں تم ان کو نہیں سنا سکتے۔
الْقُبُوْرِ ۝ (۳۵: ۱۹-۲۲- پ۲۲- ر۱۵)	سورۂ فاطر۔ رکوع ۱۵۔

شاید بلکہ اغلب اُمید ہے کہ بعض کوتاہ اندیش اس کے معنی قبرستان والے مُردے ہی سمجھیں گے۔ لیکن یہ سخت جہالت اور کوتاہ فہمی ہے۔ کیونکہ یہ سماعت تو تبلیغ دین و اسلام ہے جو زندہ کے لیے ہے۔ اصحاب القبور مُردہ کے لیے نہیں بلکہ اصحاب القبور دنیوی زندگی میں چلتے پھرتے مُردے مراد ہیں جو قرآن شریف سے ثابت ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ	یہ تو نصیحت اور قرآن صاف ہے تاکہ اس شخص کو
مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى	ڈرایا جائے جو زندہ ہو اور کافروں پر بات پوری

الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳۶: ۶۹-۷۰- پ۲۳- ر۴)	ہو جائے۔

جیسے فرمایا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (ڈر جانے والوں کے لیے ہدایت ہے) تو جب متقی زندہ ہے تو کافر مُردہ ہے۔ اور اس قبر کی حقیقت کو اپنے فضل و کرم کے رو سے مومنین کے لیے واضح طور پر اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرما رہے ہیں:

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا	اور کی ہم نے آگے ان کے سے ایک دیوار اور پیچھے
وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ	ان کے سے ایک دیوار پس ڈھانکا ہم نے ان کو
فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (۳۶: ۹- پ۲۲- ر۱۸)	پس وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمان ہو رہا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا	بھلا جو شخص پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ
لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ	کر دیا اور اس کے لیے روشنی کر دی کہ وہ اس کے
مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ	ذریعے سے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس
مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا	شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶: ۱۲۳- پ۸- ر۲)	سے نکل ہی نہ سکے۔ اسی طرح کافر جو عمل کر رہے ہیں
سورۂ انعام۔ رکوع ۲	وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

ظاہر کے مقید اس حیات اور موت سے بھی پیدائش اور بطن مادر ہی مراد لیں گے لیکن اس کور چشمی کے لیے كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ کا کحل کافی ہے جس سے حجابِ بصارت رفع ہو کر اشکال دفع ہو جائے گا کہ یہ کافر اپنے عملوں کی وجہ سے مردہ ہے۔ اور اس کو

ظاہری حیاتی جو سراسر موت اور حیاتِ اُخروی جو سراسر حیاتی ہے اُلٹی نظر آ رہی ہیں محققین کے نزدیک یہ موت خواہش نفس کے سبب سے ہے اور حیات محبتِ الٰہی کے باعث سے۔ یا موت محرومی کے سبب سے ہے اور حیات معرفت کے باعث سے۔

حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش صاحب لاہوری قدس سرہٗ نے کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ "معرفت کے سبب سے جو حیات ہوتی ہے وہ اور ہے اور حیات بشریت اور اہل عالم حیاتِ بشریت سے زندہ ہیں اور اولیا حیاتِ معرفت سے۔ ایک دن ہوگا کہ حیاتِ بشریت تمام ہو جائے گی، کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۔ اور حیات معرفت ہرگز ختم نہ ہو گی۔ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔" اور یہی مضمون ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ حَیٌّ فِی الدَّارَیْنِ ؎

نمیرد ہر کرا جانش تو باشی	خوشا جانے کہ جانانش تو باشی

شاہ کرمانی قدس سرہٗ نے یہ آیت اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ الآیۃ پڑھی تو فرمایا کہ اس حیات کی تین علامتیں ہیں۔ خلق سے عزلت، حق تعالیٰ کے ساتھ خلوت اور زبان و دل سے ذکر پر ہمیشگی کرنا ؎

در روی خلائق در صحبت مکشای	مے باش بکلی متوجہ بخدای
غافل مشو از ذوق دل و ذکر زبان	تا زندہ جاوید شوی در دو سرای

لیکن اس موت سے یہ سمجھ لینا کہ مُردہ مثل جماد ہے سراسر غلط ہے۔ ایسا مردہ تو کافر بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ موت حجاب اور حجاب کا سخت عذاب ہے

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ　　یقیناً وہ اپنے رب سے اس دن حجاب میں

لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (پ ۳۰ - ۸۳)　　ہوں گے۔

اس دن اس ہزار موت سے بھی یہ حجاب سخت ہو گا۔ بلکہ قرآن شریف میں ہے کہ کافر اس دن اپنے تنگ مقام کو دیکھیں گے تو موت کو پکاریں گے تو جواب ملے گا کہ:

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ　　تم آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی

ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝ (۲۵:۱۳۔ پ ۱۸)　　موتوں کو پکارو۔

مثل جماد مر جانے کے لیے کافر التجا کرے گا اور اس حیات اخروی سے جس پر ایمان نہ رکھتا تھا سخت بیزار اور بے قرار ہو کر کہے گا:

يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (۷۸:۴۰۔ پ ۳۰)　　کاش! میں مٹی ہو جاتا۔

مگر کہاں، کیونکہ یہ زندگی انسان کبھی فنا ہونے والی نہیں، اور نہ ہی ہو گی۔ حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ فنا اور بقا کے بیان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "بقا بقا بقا، جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ویسا ہی رہے گا۔ اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ ۔ تو یہ اس باری تعالیٰ لم یزال ولا یزال بے مثل و بے مثال ذوالجلال والاکرام کی شان ہے۔ دوسرا فنا بقا فنا، جو پہلے نہ تھا، اب ہے، اور پھر نہ رہے گا۔ تو یہ حدث یعنی دنیا و مافیہا ہے۔ تیسرا فنا بقا بقا، پہلے نہ تھا، اب ہے، اور باقی رہے گا۔ یہ آخرت، دوزخ، بہشت و مافیہا ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان جو پہلے نہ تھا، اور اب ہے، اور نہ رہے گا، کیا یہ بھی حدث کی طرح ہے؟ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ دنیا و آخرت میں نعمت و عذاب کے رُو سے جو کچھ بھی ہے سب انسان کے لیے ہے اس لیے اس کی ہستی حدث کی طرح نہیں ہے جس کا اوّل و آخر فانی ہو۔ کیونکہ یہ اس دار فنا میں آیا، اور اس حدث

سے پہلے بھی تھا، اور باقی رہے گا۔ فرمان مولیٰ کریم ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ	بے شک انسان پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے
لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ (الدہر: ۱)	کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔

لفظ علیٰ کا اطلاق انسان پر ہے، کہ یہ تھا تو سہی لیکن ذکر کے قابل نہ تھا۔ کیونکہ ذکر تو خارجی وجود سے شروع ہؤا۔ اس سے پہلے ذکر ہوتا تو کس طرح؟ کیونکہ نہ ذہنی وجود رکھتا تھا نہ لفظی۔ تو پھر خارجی وجود اور ذکر کہاں کا؟ ذکر تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہؤا۔ یعنی جب انسان کو پُتلا خاکی یا دوسرے لفظوں میں خالقِ کون ومکان خلقت کے وجود میں لائے تو ذکر شروع ہؤا۔ اس سے پہلے نہ ذکر تھا اور نہ ہی یہ ذکر کے قابل۔

ذخیرۃ الملوک میں بیان ہے کہ انسان پر چھ منزلیں گزرتی ہیں (۱) عالمِ ارواح سے پشتِ پدر (۲) بطنِ مادر (۳) میدانِ دنیا (۴) لحدِ قبر (۵) میدانِ قیامت (۶) بہشت یا دوزخ۔ لیکن اس کو ماقبل حیات الدنیا والآخرہ کا علم اسی وجود میں آنے سے معلوم ہؤا۔ وہ بھی عقلی اور نقلی وجہ سے۔ ورنہ حالی علم سے اس کو سوائے حال کے کچھ علم نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن مبین میں ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	اور تمہیں کیا ہؤا ہے کہ خدا پر ایمان نہیں لاتے۔
الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ	حالانکہ پیغمبر (خدا) تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے پروردگار
وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	پر ایمان لاؤ۔ اور اگر تم کو باور ہو تو وہ تم سے اس
مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۵۷: ۸۔ پ۲۷۔ ع۱۷)	بارہ میں عہد بھی لے چکا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس وجود یعنی حدث میں آنے سے پہلے بھی تھا جس کا اس کو علم نہیں تھا، اب کلام الٰہی سے معلوم ہؤا۔ ورنہ کہاں کا عہد و اقرار اور کیسا یقین و علم۔ (ہاں علم اور حال انبیائے کرام اس برزخ میں کلام الٰہی سے ثابت ہے) تو مولیٰ کریم نے اس کو اس وجود میں ظہورِ تام اور علمِ کُل کے لیے نازل کیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ تو یہ عرف اور علم انسان کے لیے نہایت ضروری بلکہ فرض ہے۔ کیونکہ جو اپنے سے جاہل ہوتا ہے وہ غیر سے زیادہ اجہل ہوتا ہے۔ لیکن ایک جہان اس علم سے جاہل ہے۔ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور اب کس جگہ ہیں، اور کہاں جا رہے ہیں۔ دنیا و مافیہا کے شیدائی اسی کی محبت میں سرشار

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ	لوگوں کو اُن کی خواہشات کی چیزیں یعنی عورتیں
مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ	اور بیٹے اور سونا اور چاندی کے بڑے
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ	بڑے ڈھیر اور نشان کیے ہوئے گھوڑے
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ	اور مویشی اور کھیتی بڑی مزے دار معلوم ہوتی
الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ	ہے۔ مگر یہ سب دنیا کی زندگی کے سامان
الدُّنْيَا ج (۳: ۱۴۔ پ۳۔ ع۱۰)	ہیں۔

دنیا کی حیاتی کے دیوانے، اور وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (اور خدا کے پاس اچھا ٹکانا ہے) کی سی نعمت سے اندھے اور اُخروی حیات سے مُردہ ہو رہے ہیں، علم و عُرف کہاں کا؟ وقت ہاتھ سے جا رہا ہے اور میعادی حیاتی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ تب آنکھ کھُلے گی جب

موت آگھیرے گی۔ جیسا ارشاد مولیٰ کریم:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَ
تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ
اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ كَلَّآ اِذَا
بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ ۝
وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ
السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰى رَبِّكَ
يَوْمَئِذِ ۣالْمَسَاقُ ۝ (۷۵: ۲۰-۳۰)

(پ ۲۹۔ س ۱۷۔ س قیامت)

ہرگز نہیں یوں بلکہ دوست رکھتے ہو تم جلدی کو
اور چھوڑ دیتے ہو آخرت کو۔ کتنے منہ اس دن
تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کی دیکھنے والے
ہیں، اور کتنے منہ اس دن بُرے ہیں گمان کرتے
ہیں یہ کہ کی جاوے گی ان سے کمر توڑنے والی یعنی
معاملت۔ ہرگز نہیں یوں جس وقت پہنچی ہے جان
ہانس کو اور کہا جائے کون ہے جھاڑنے پھونکنے والا
اور جانا اس نے کہ یہ ہے جدائی، اور لپٹ جاوے گی
ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے طرف پروردگار اپنے
کی ہے اس دن چلنا۔

باب سوم

عالم برزخ

کیفیات برزخ فی الدنیا

تو یہ چلنا اور جانا جسم کے سوا ہے۔ اور اگر جسم ہے تو ایسا جو نظر نہیں آتا ہے۔ ہاں! بندگانِ خدا کے ارشادات مبارکہ سے ثابت ہے کہ ہم نے اپنا دوسرا وجود دیکھا۔ چنانچہ حضرت غوث علی شاہ صاحب پانی پتی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "مراقبہ میں چند بار ہم نے دیکھا کہ ایک مجسم صحیح و سالم ہو بہو میرے، سامنے آ کھڑا ہوا، اور وہ میں خود تھا"۔ زیادہ طوالت و وضاحت یہاں رائگاں ہے۔ یہ حال ہے، کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے، تب پتہ لگے جب حال کھلے۔ صرف اتنا سمجھ کے لیے ہو سکتا ہے کہ خواب ہر ایک انسان دیکھتا ہے، بدن بالکل بے حس و حرکت مُردہ کی مانند پڑا ہے اور دوسرا وجود کہیں کا کہیں کام کرتا پھرتا ہے۔ اور یہ عوام کا حال ہے۔ چونکہ رُوح بدن کی طرف سے غیر متوجہ ہو کر دوسرے وجود بطن کی طرف راغب ہوتی ہے اور یہ بدن سو جاتا ہے، صرف نیند کے غلبہ سے بے ہوش کی مانند ہو جاتا ہے، مولیٰ کریم نے اس حالت کو بھی اپنے کلام پاک میں موت فرمایا ہے، اور یہ عارضی موت ہے حقیقی موت اس سے قوی ہے۔ کیونکہ موت کے بعد اس وجود کی محافظت بھی ترک ہو جاتی ہے۔

گویا لباس کی طرح انسان اس وجود سے باہر ہوگیا، یا سانپ کی طرح کینچلی اتار کر چلا گیا لیکن یہ مثال اس حال سے پوری نہیں اتر سکتی۔ اسی لیے اولیائے کرام کا حال عالم برزخ کی طرح ہو جاتا ہے اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا کے مصداق ہو جاتے ہیں۔

حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کو جب دار پر کھینچنے لگے تو ان کا ایک بازو کاٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تب جانوں جو دوسرا بازو بھی کاٹو۔ دوسرا کاٹا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے، اور فرمایا کہ میرے تو دونوں بازو صحیح وسلامت ہیں۔

حضرت غوث علی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں دیکھا ہے کہ دو مجذوب تھے۔ کسی شریر نے ان کی رانوں پر انگارے رکھ دیے۔ ایک کی تو جل گئیں، اور دوسرے کی رانوں پر آگ کا اثر تک نہ تھا۔ کسی نے سوال کیا کہ ان میں کا اعلیٰ کون تھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک ابھی بظاہر وجود کی حفاظت پر تھا، اور دوسرا اس سے مبرا اور وہی زیادہ صاحب حال اور صاحب مدارج ہے۔

برزخ فی الآخرہ

یہ وجود بطن قرآن کریم اور حدیث شریف کے حکم سے ثابت ہے، اور قرین عقل ہے کہ اگر اسی وجود ہی سے حیاتی اور حساب اور ثواب و عذاب ہو تو جل کر راکھ ہونے والا اور دریا میں غرق ہونے والا، مگرمچھ اور مچھلیوں کی غذا بننے والا وجود مستثنیٰ ہونا چاہیے۔ اور یہ محال ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

اَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (پ ۱۷۔ ع ۸) یہ کہ اللہ اٹھائے گا ان لوگوں کو کہ بیچ قبروں کے ہیں

تو جب کہ سب لوگ قبروں میں دفنائے ہی نہیں جاتے بلکہ اکثر جلائے جاتے ہیں تو پھر یہ سب یعنی کل آدمی قبروں سے کیسے اُٹھائے جائیں گے؟ اور یہ لازمی امر ہے کہ بنی نوع انسان سب کے سب عالم برزخ کی طرف مقیم ہوں گے اور قیامت کے دن اُٹھائے جائیں گے۔ اس لیے اس سے مراد عالم برزخ ہے۔ گو قیامت کے دن ہر ایک انسان اسی موجودہ اور ظاہری وجود کے ساتھ اٹھایا جائے گا، اور اسی سے حساب لیا جائے گا۔ اور قبر میں عذاب اور ثواب جنت اور دوزخ کی طرف سے کھڑکی کھلی رہے گی۔ اس کی تفصیل میں بہت طول ہے اور میرا مقصود انسان فی القرآن محض ہے اس لیے اب پھر مقصود کی طرف ہی لوٹا جاتا ہوں، تاکہ اصل معیار سے مخالف سمت پیدا نہ ہونے پائے۔

جب جنگ بدر کے دن کفار کی نعشوں کو جُبّ میں ڈالا گیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "جو وعدہ رب العالمین نے ہم سے کیا تھا وہ ہم نے پورا پا لیا ہے، کیا تم سے جو وعدہ ہوا تھا، تم نے بھی پورا پایا ہے یا نہیں"؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ تو بے جان دھڑ اور مُردے ہیں"۔ تو آپ نے فرمایا کہ "تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو"۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کافر ہو یا مسلم، موت کے بعد یعنی اس وجود سے منتقل ہونے کے بعد بھی زندہ اور مثل ہمارے سنتے دیکھتے ہیں، بلکہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ حیات الدنیا سے انتقال کر کے یعنی میدان دنیا سے گزر کر عالم برزخ میں مقیم ہو گئے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (۲۳: ۱۰۰ - پ۱۸ - ع۶)

اور ورے ان سے ایک پردہ ہے اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔

اور قیامت تک عالم برزخ ہی میں رہیں گے۔ اس روز یعنی یوم القیامۃ کو اٹھا کھڑے کیے جائیں گے۔ انسان کے لیے یہ ایک منزل اور ایک میعاد ہے جو کہ اس وجود سے جدا ہو کر یوم القیامۃ تک مقرر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

هُوَالَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (۶: ۲ - پ۷ - ع۷)

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کی اجل۔ اور ایک اجل مقرر کی ہوئی ہے نزدیک اس کے۔ پھر تم شک کرتے ہو۔

دراصل یہ بھی ایک عالم دنیا ہی کا حصہ ہے۔ محض اہل دنیا اور موتیٰ کے درمیان ایک برزخ یعنی آڑ ہے کہ آپس میں رل مل نہیں سکتے ہیں سوائے اُن صاحبان کے جن کا حال دنیا میں برزخ کی مانند ہو۔ ان کے لیے یہ برزخ یعنی پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ وہ آپس میں بات چیت، ملاقات بلکہ استمداد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ حالت وجود کے حجاب کے دور ہونے کے سوا نہیں ہو سکتی جو محض بتوفیق عزّوجل مجاہدات اور فضل ایزد متعال لم یزلی ولایزال سے وابستہ ہے ؎

گر نیفتادم ندیدم کعبۂ مقصود را
درمیان ماہمیں استادگی دیوار بود

لیکن انبیائے کرام روزِ ازل سے اس وجود کی آفت سے مبرا اور مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ فرمان ایزد متعال وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ کے تحت میں اوپر بیان ہو چکا ہے اس لیے

دوبارہ تحریر کرنا لایعنی ہے۔ ہاں صرف اتنا کہ برزخ دو وجہ پر ہے۔ ایک میدان دنیا سے قبل روحانیت میں جس پر کلام اللہ کی شہادت کافی ہے اور دوسرا بعد از موت جس کا ثبوت نص قطعی سے ثابت ہو چکا ہے۔ برادران اسلام میں سے ایک گروہ اس برزخ پر عجیب طرح کا ایمان رکھنے والے ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ فرقان حمید میں بیان ہو رہا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۹: ۴۲ - پ۲۴ - ع۲)

اللہ قبض کر لیتا ہے جانوں کو نزدیک موت ان کی کے اور جو نہیں مرے قبض کر لیتا ہے ان کو بیچ نیند ان کی کے پس بند کر رکھتا ہے جن کو کہ مقرر کی ہے اوپر اُن کے موت۔ اور بھیج دیتا ہے اور وں کو ایک وقت مقرر تک۔ تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے اس قوم کے کہ فکر کرتے ہیں۔

قبض رُوح یعنی موت (نیند) جس کو صغیرہ موت سے تعبیر کرنا روا اور درست ہے، ہر ایک شخص (خصوصاً مومن) اس سے حالی طور پر عارف ہونے کے باوجود جو اس کے عنصری وجود اور روحانیت کے درمیان برزخ ہے، یہ گروہ اس کا انکار کرنے والا ہوتا ہے، اور کم فہمی و جہالت کی وجہ سے عوام الناس تو در کنار انبیائے کرام کی نسبت بھی ایسا اعتقاد رکھنا سعادت مندی خیال کرتے ہیں کہ وہ مر کر مٹی ہو گئے ہیں، نعوذ باللہ من ذٰلک۔ اور اس کو اثبات التوحید سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس گروہ کے نزدیک خداوند کریم ذوالجلال والاکرام کے سوا حیات ابدی کا ہونا شرک ہے۔ اور یہ سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ مولیٰ کریم نے انسان کو حیات ابدی سے حصہ دیا ہے۔

بعض کم فہمی کی وجہ سے آیات بینات کو دلیل پکڑتے ہیں، مثلاً:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا	کیونکر کفر کرتے ہو تم ساتھ اللہ کے اور تھے تم مُردے
فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ	پس جلایا تم کو پھر مُردہ کرے گا تم کو پھر جلائے گا تم کو
ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞ (۲:۲۸۔ پ۔۳/۱)	پھر طرف اسی کے پھیرے جاؤ گے۔

اس آیت سے ان کا مفاد انسان کے معدوم ہو جانے یا مر کر مٹی ہو جانے، نیست و نابود اور حیات سے منقطع ہو جانے کے سوا نہیں ہے اور ان کی غلطی کا یہی سبب ہے۔

جاننا چاہیے کہ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا کی حقیقت دو وجہ پر واقع ہوئی ہے۔ ایک تو حضرت آدم علیہ السلام کا بُت رُوح پھونکنے سے پہلے یعنی خلق الاوّل اور نطفے سے لے کر رحم مادر میں طفل بننے تک حیات سے قبل خلق الآخر۔ اور دوسری موت زندہ ہونے کے بعد میدانِ دنیا سے عالم برزخ کی طرف انتقال جو ہر عام و خاص کے نزدیک معروف ہے۔ اور پھر دوسری حیاتی صور کا پھونکا جانا اور قبروں سے اُٹھنا ہے۔ رُوح کے پھونکے جانے سے تغیر و تبدل کی صورت وجود کے بے رُوح ہونے اور زندہ ہونے سے ہے۔ یعنی پہلے بُت کا رُوح سے زندہ ہونا پھر بُت کا رُوح سے جدا ہونا، مطابق فرمان ایزدمتعال:

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۞ (۸۱:۷۔ پ۳۰)	اور جب جانیں ملائی جائیں گی۔

پھر اسی وجود کا زندہ ہونا نص سے ثابت ہے، تو حیاتی رُوح کے آنے سے اور موت رُوح کے چلے جانے سے ہے۔ اور اس کا مردہ اور زندہ ہونا وجود عنصری کے متعلق ہے، نہ کہ روحی سے؛ جو انسان اور اس کا اصل ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ صاحب قبر کو سلام دینا چاہیے اور اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ جانتا ہے کہ میری قبر پر چڑھا ہے یا مادہ۔ فرمان ایزدمتعال:

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا	وہ آگ ہے کہ حاضر کیے جاتے ہیں اوپر اس کے
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا اٰلَ	صبح اور شام اور جس دن کہ قائم ہوگی قیامت کہا
فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞ (پ۲۴۔ ع۱)	جائے گا کہ داخل کرو لوگوں فرعون کے کو سخت عذاب میں

اس پر دال ہے کہ کافر بھی عالم برزخ میں وجود عنصری کے سوا وجود رکھتے ہیں۔ اس عزیز الحکیم نے انسان کو جامع الصفات بنا کر دونوں جہان کے نشانات سے مزین فرمایا ہے۔ پھر اس کو مطلع کرنے کے لیے اپنی کلام مبارک سے علم دیا ہے۔ جیسا کہ نیند کو موت فرمایا ہے۔ دراصل اس کو صغیرہ کہیں یا کبیرہ، موت یعنی اس وجود سے منتقل ہو کر عالم برزخ میں قیام کرنے کی منافی نہیں ہے۔ صغیرہ اور کبیرہ کا فرق صرف اتنا ہے کہ روح کا وجود میں رہ کر عالم برزخ کی طرف سیر کرنا صغیرہ کے مترادف ہے جو رؤیا اور خواب کے نام سے موسوم ہے۔ اور نیند کے غلبہ اور کیفیت سے وجود مثل مردہ کے ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لیے قادر مطلق نے روح کو قبض کر لینے ہی کا ارشاد فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی تفصیل کر دی ہے کہ واپس کر دیا جاتا ہے تاکہ مدت حیات پوری کی جائے۔ اور جن کی حیات پوری ہو جاتی ہے، روک لیا جاتا ہے۔ اس لیے صغیرہ ہو یا کبیرہ کیفیت عالم برزخ یعنی موت کے بعد کے زمانہ میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ ہاں! مومن اور کافر کے حالات میں بہت بڑا فرق ہے اور مومنین کے حالات بھی ہر چند مختلف ہیں، جس قدر روحانیت قوی ہوتی ہے، وجود کا تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ اولیائے کرام کا حال اور طرح کا ہے اور عام مومن

کا اور طرح۔ اس کے سمجھنے کے لیے ہر روز کے خوابوں کی مختلف کیفیت اظہر من الشمس ہے۔

خواب انسان دراصل مملکت انسانیہ کی سیر ہے جو کئی نوع پر منقسم ہے: ہر ایک کی سیر اس کے حال کے مطابق ہوتی ہے۔ ہر ایک قسم کے تاثرات جو انسان کے بطن میں مؤثر ہوتے ہیں تخم کی مانند انسانی بسط کے میدان میں شجر کی صورت میں متشکل ہو کر معائنہ میں آتے رہتے ہیں جو ابتدا میں بالکل کمزور اور ناپائدار سے ہوا کرتے ہیں۔ ایسی خوابوں کو تخیلی یا صوری کہا جاتا ہے۔ لیکن متواتر اثرات پڑنے اور خیال کو قوی اور مثبت کر دینے سے نسبتی صورت اختیار کر لیتے ہیں یعنی عادت کیے گئے انسان کے ضمیر میں العادۃ طبیعۃ الثانیۃ کے مصداق نیک ہو یا بد ایک قوی طاقت اور بسط کے ساتھ مختلف وجوہات پر عجیب و غریب کیفیات کا معائنہ ہوتا رہتا ہے جس کی تعبیر اور حقیقت سے انسان اکثر جاہل ہی رہتا ہے۔

ایک شخص بچپن سے شریف الطبع نیک سرشت، متقی اور پرہیزگار، مجاہد اور شب خیز ورد و وظائف کا دیوانہ، عبادت کا شیدا، طالب خدا، مجاہد بے ریا، تصنع سے دور اپنے کام میں مسرور بستر خواب سے اُٹھتا ہی دیوانہ وار ہاتھ میں لاٹھی لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ اہل ہنود کی رسوئی میں داخل ہو کر برتن توڑنے لگا اور کئی وجہ پر از قسم تبلیغ باتیں بنانے لگا کہ "بادشاہ مسلمان آگیا ہے اور تم ابھی تک ہندو ہی ہو"۔ عوام میں مشہور ہو گیا کہ فلاں آدمی کیسا نیک کردار اور پرہیزگار تھا، افسوس کہ پاگل ہو گیا ہے۔ واقعی بظاہر اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی تھی، ہوش و حواس درست نہ تھے۔ کانسی کا ایک برتن پانی سے بھرا ہوا، اس میں دو پتلی پتلی خشک ٹہنیاں اور ایک چھوٹی سی پتلی لکڑی ہاتھ میں لیے اس برتن کو ڈھول

کی طرح بجاتا ہوا اپنے والد کے ہمراہ حضرت اعلیٰ صاحب کی مسجد میں آنکلا۔ دراصل اس کا والد اسے اپنے ہمراہ قطب زمان کی خدمت میں اس غرض سے لایا تھا کہ اس کے حال پر توجہ فرمائیں۔ خیر! اس پاک ہستی کی نظر سے وہ چند روز میں اچھا بھلا ہو گیا اور اپنے کام کاج، نماز و عبادات میں پہلے کی طرح مشغول ہو گیا۔ چونکہ میرے دل میں اس کے متعلق کچھ تشویش سی تھی، اس لیے میں نے اس سے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے دریافت کیا کہ "تجھے کیا ہوا تھا؟" بولا "کچھ پتہ نہیں، ہوش ہی بجا نہ رہے تھے"۔ اس سے زیادہ کچھ بیان نہ کرتا تھا۔ آخر بہت اصرار اور کرید کے بعد اس نے بتایا کہ "میں سویا پڑا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ بادشاہ مسلمان آگیا ہے۔ ہر شہر کے ہر گلی کوچہ بلکہ ہر گھر میں اسلام کا جوش ہے، قال اللہ و قال الرسول کے سوا کوئی کلام نہیں، سوائے دین الحق کے کسی کو کوئی کام نہیں۔ اس حیرت انگیز منظر کو دیکھتے ہی میرے ہوش و حواس درست نہ رہ سکے۔ اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کیا کرتا تھا"۔ میرا مقصود پورا ہو گیا اور میں نے دریافت کا سلسلہ بند کر دیا۔

دراصل اس نیک بخت نے جہاں کہیں سے کچھ سنا جس ورد و وظیفہ کی تعریف سے عارف ہوا پڑھنا شروع کر دیا۔ اور اس کا اثر اس کے بطن پر مؤثر ہوتا رہا۔ سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری و ساری رہے گی کہ ہر فعل اور حال کے لیے کوئی رہنما ہو، استاد ہو، استاذ ہو۔ فرمان مولیٰ کریم ہے:

يَاۤ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوۤا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو طرف اس کے وسیلہ اور محنت کرو

فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (پ۶)　　　بیچ راہ اس کی کے تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اگر بموجب قرآن شریف صحیح وسیلہ کے ذریعہ کسی طریقہ سے سلسلہ میں داخل ہو کر یہ وردو وظیفہ کیا جاتا تو یہ حال مطابق نسبت ولایت کے مترادف ہوتا، جو دیوانہ اور مجنون کے موافق ہوگیا۔ یہ مملکت انسانیہ کی سیر تھی، اور وردو وظیفہ کا اثر اس کے بطن میں یعنی مملکت انسانیہ کی بادشاہت کا مترادف تھا مطابق اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً بطن میں مُلْکًا کَبِیْرًا کا شہنشاہ بحیثیت نائب احکم الحاکمین، اور بظاہر فی الدنیا حسب وعدہ عزیز الحکیم:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا	وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو کہ ایمان لائے
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ	ہیں تم میں سے اور کام کیے اچھے البتہ خلیفہ کرے گا
کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ	ان کو بیچ زمین کے جیسا کہ خلیفہ کیا تھا ان لوگوں
وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی	کو کہ پہلے ان سے تھے اور البتہ ثابت کر دے گا واسطے
لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ	ان کے دین ان کا جو پسند کر دیا ہے واسطے ان کے
اَمْنًا ۝ (۲۴:۵۵۔ پ۱۸۔ ع۱۳)	اور البتہ بدل دے گا ان کو پیچھے خوف ان کے کے امن۔

کا مصداق ہوتا۔ لیکن وہ برداشت نہ کر سکا۔ اور تعلیم اور عمل بھی طریقت کے خلاف تھا۔ ورنہ ایسا نہ ہوتا۔

سنت الٰہی کے مطابق ہر نیک و بد عمل کا اثر انسان کے باطن پر مؤثر ہوتا ہے۔ اور استقامت کے بعد اس کا ثمر اور ظہور فی الدنیا والآخرہ ہویدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ سرشت انسانیہ کا خاصہ ہے جو اس مالک حقیقی نے پر از حکمت فطرت سے انسان کو مزین فرمایا ہے۔ اور یہی عالم

برزخ اور اس کا اصل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ مظہر العجائب والغرائب شاہ ولایت، محبت کے پھول، محرم اصل الاصول نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا ہی اچھی تعلیم فرمائی ہے کہ فِکْرُکَ فِیْکَ یَکْفِیْکَ۔ گو ایک حد تک سعی انسان بتوفیق الٰہی ہے لیکن مدارج دینی و دنیوی عنایت الٰہی سے وابستہ ہیں جن کا انحصار محض فضل ایزد متعال ذوالجلال والاکرام پر ہے۔

حکایت: (از تذکرہ غوثیہ)

حضرت غوث علی شاہ صاحب پانی پتی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے پیر و مرشد حضرت میر اعظم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قصبہ ہم سے دہلی کو واپس آتے ہوئے اثنائے راہ میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دوپہر کے وقت ایک درخت کے سایہ میں گاڑی ٹھیرا دی تاکہ ذرا آرام لے کر اور نماز ظہر پڑھ کر بعد فرو ہونے تمازت آفتاب کے آگے کو چلیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک فقیر صاحب وارد ہوئے۔ ہم نے روٹی پانی کی تواضع کی۔ کھاپی کر وہ بھی سو گئے اور ہم بھی۔ جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری گاڑی ایک سرائے میں کھڑی ہے۔ بیل گھاس کھا رہے ہیں، بھٹیاری کھانا پکا رہی ہے اور فقیر صاحب پڑے سوتے ہیں۔ ہماری حالت سکتہ کی سی ہو گئی کہ الٰہی! یہ کیسی سرائے اور کونسا شہر ہے؟ اور ہم یہاں کیونکر پہنچے؟ بھٹیاری سے دریافت کیا کہ "اس شہر کا نام کیا ہے"؟ کہا کہ "حیرت افزا"۔ پوچھا کہ "ارے نیک بخت! یہ سرائے کس کی ہے"؟ کہا کہ "انہی فقیر صاحب کی، اور جتنے روز تم یہاں ٹھیرو گے سب خرچ بھی ان کے ذمہ ہے"۔ آٹھ روز تک ہم اسی شہر میں رہے، نہ اس کی ابتدا معلوم ہوئی نہ انتہا۔ حقیقت میں وہ شہر حیرت افزا تھا۔ آدمی وہاں کے نیک سیرت، پاکیزہ صورت، مرفع حال،

مکانات خوش قطع اور مصفا، اشیا رنگا رنگ موجود، بازار نہایت مکلف و پر بہار، جدھر جاتے صورت تصویر بن جاتے۔ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی، اسلام کا زور و شور پایا، ہر شخص کو یادِ خدا میں مشغول دیکھا۔ قال اللہ و قال الرسول کے سوا کچھ ذکر نہ تھا۔ غرض آٹھویں رات کو جب ہم سو کر اُٹھے تو گاڑی اسی درخت کے تلے کھڑی ہے اور وہی وقت ہے، فقیر صاحب بھی سوتے ہیں۔ ہم نماز پڑھ کر روانہ ہوئے۔ فقیر صاحب بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ رستہ میں جس شخص سے پوچھا وہی تاریخ وہی دن وہی مہینہ بتلایا۔ ہم کو حیرت ہوئی کہ یہ آٹھ دن کہاں گئے۔ آخر بہادر گڑھ پہنچے، وہاں ایک مکان میں ٹھیرے۔ فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نماز عشا ہماری روٹی اس مسجد میں لے آنا جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب ایک گدھی سے مصروف ہیں۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ پھر جو دیکھا تو نماز پڑھتے ہیں۔ بعد فراغت کھانا کھایا۔ باتیں کرنے لگے۔ جب آدھی رات گئی تو فرمایا کہ شہر کے دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں، جاؤ ہمارا لنگوٹ دھلوا لاؤ"۔ میں نے کہا کہ "حضرت! آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، بھلا اس وقت کون کپڑے دھوتا ہوگا"؟ فرمایا کہ "ذرا تم لے تو جاؤ"۔ میں چلا اور شہر کے دروازے سے باہر نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ دو گھڑی دن چڑھا ہے اور دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ جب دروازہ کے اندر آتا ہوں تو نصف شب معلوم ہوتی ہے اور جب باہر جاتا ہوں تو وہی دو گھڑی دن چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ غرض دھوبیوں کے پاس پہنچے۔ ایک دھوبی نے کہا کہ لاؤ میاں صاحب کا لنگوٹ میں دھو دوں"۔ اس نے دھویا، صاف کیا، دھوپ میں سوکھا کر حوالہ کیا۔ میاں صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ مجھ کو ان باتوں کا نہایت تعجب تھا۔ فرمایا

کہ "تعجب نہ کرو، یہ بھان متی کا سانگ ہے اور ایسی شعبدہ ہم بہت دکھلا سکتے ہیں لیکن فقیری کچھ اور ہی چیز ہے، ان باتوں کا خیال مت کرو۔ صبح کے وقت ہم دہلی کو روانہ ہوئے اور وہ فقیر صاحب غائب ہو گئے۔ جب ہم دہلی میں پہنچے تو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ شخص خضر وقت یا ابوالوقت تھا"۔

ایسا شخص اپنے برزخ میں تصرف کرنے والا ہوتا ہے، مختار من اللہ ہوتا ہے اور کسی صاحبِ استعداد و صاحبِ حال کو اپنے برزخ کا سیر بھی کرا سکتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

عالم برزخ سے عالم تو ابن الوقت بھی ہوا کرتا ہے لیکن اس کو یہ قدرت نہیں ہوتی کہ جب چاہے حالت طاری کر لے۔ عوام تو اس عالم برزخ سے (جس کی خواب کے سوا کچھ واقفیت نہیں رکھتے ہیں) جاہل ہیں۔ اور خاص اس سے علم اور اس کی تعبیر سے واقفیت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور خاص الخاص کا حال اس عالم برزخ کے مطابق ہوتا ہے۔ بزرگان دین سے گفت و شنید کرتے ہیں، روحانی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ استمداد فی الدنیا والآخرہ کا مفاد ان کے لیے زندہ اور موتیٰ سے برابر ہوتا ہے۔ حضرت غوث علی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ایک دوست عبدالصمد خاں نے مجھ سے اپنے دو واقعات بیان کیے۔ جن میں سے ایک اسی برزخ کے حال کے مطابق ہے، لہٰذا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

یہ کہ میں ایک مولوی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ قضارا ان کا انتقال ہو گیا۔ سخت رنج و الم ہوا کہ ایسے استاد شفیق اب کہاں ملیں گے۔ جب ان کو غسل دیا، کفن پہنایا تو میں خوشبو لینے ان کے حجرہ میں آیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولوی صاحب اندر موجود ہیں۔ میں نے متعجب ہو کر

پوچھا کہ "حضرت! جنازہ تو باہر رکھا ہے اور آپ یہاں"؟ فرمایا کہ "میاں! تمہارا غم واندوہ گوارا نہ ہوا۔ اب خاطر جمع رکھو، ان شاء اللہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی مگر افشائے راز نہ کرنا۔ چلو اب جنازہ کی نماز پڑھو، مگر ہم اور لوگوں کی نظر سے غائب رہیں گے"۔ چنانچہ جب تک دفن کیا وہ ہمارے ساتھ رہے۔ قبرستان سے پھرے تب بھی ہمراہ تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ "مولوی صاحب! آپ تو یہاں ہیں، بھلا قبر میں منکر نکیر کو جواب کون دے گا"؟ فرمایا کہ "میاں، یہ بات نہ پوچھو کچھ اور گفتگو کرو"۔ دو گھڑی بعد سلام علیک کرکے تشریف لے گئے۔ من بعد ہر روز صبح کے وقت قدم رنجہ فرماتے رہے۔ چند روز اسی طرح گزرے۔ ایک رات میں نے حجرہ کی موری میں پیشاب کر دیا۔ صبح کو مولوی صاحب ناک چڑھائے آئے اور کہا کہ "آج تمہارے حجرہ میں بدبو ہے، شاید تم نے یہیں پیشاب کیا ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ "فی الواقعہ یہ قصور مجھ سے ہوا ہے"۔ اس وقت فرمایا کہ "میاں، تم اور عالم میں ہم اور عالم میں، بھلا ہماری تمہاری ملاقات کیا۔ بھائی، اب ہم نہیں آئیں گے"۔ ہر چند میں نے عذر و معذرت کی لیکن پھر کبھی نہیں آئے۔

اور خواب کی تعبیر موافق حال مختلف ہوا کرتی ہے۔ اس لیے ان خواص کی خوابوں کی تعبیر دوسرا شخص صحیح نہیں بتا سکتا۔ خود ان کا حال اور ورود اور ہر روز کے نشانات ظہور پذیر ہونے سے تعبیر کا حل ہوا کرتے ہیں۔ گاہے تمثیلی صورت میں ممثل ہوا کرتا ہے گاہے عینی۔ عینی تو رؤیا کے مترادف ہوا کرتا ہے۔ کبھی بیداری میں میدان استغراق سے اور کبھی اُونگھ میں خواب کی حالت سے۔ رہا تمثیلی، سو اس کے بیان میں بہت طول ہے۔ اختصار کی صورت میں صرف چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

مثلاً کبھی خواب میں مرد کو عورت سے یا عورت کو مرد سے مباشرت باعثِ حظ ہوتی ہے۔ بعض محتلم بھی ہو جاتے ہیں لیکن نیک سرشت قوی الضمیر محتلم بھی نہیں ہوتے۔

زبیدہ خاتون نے خواب دیکھا کہ تمام نوع انسان بلکہ حیوان، درند، پرند، چرند ہر قسم نے میرے ساتھ مباشرت کی ہے۔ صبح اس کیفیت خواب سے سخت حیران اور پریشان تھی۔ آخر ایک کنیز سے یہ خواب نہایت متحیر ہو کر بیان کیا اور کہا کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جا کر اس کی تعبیر دریافت کر، لیکن میرا نام نہ لینا، اپنا خواب بتانا۔ اس کنیز نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تیرا خواب نہیں ہے۔ جس کو یہ خواب آیا ہے اس کو بھیج۔ آخر چار و ناچار زبیدہ خاتون نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ حضرت! یہ خواب میں نے دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو مبارک ہو۔ آپ سے کوئی ایسا فعل ہوگا کہ تمام قسم کے جاندار آپ کے فیض سے حظ اُٹھائیں گے اور آپ کو عنداللہ اجر عظیم نصیب ہوگا چنانچہ اس نیک بخت نے ایک نہر نکلوائی جو حجاز میں دور تک پھیلی ہوئی ہے اور علاوہ حجاج اور انسانوں کے ہر قسم کے صحرائی اور فضائی جانور اس سے اپنے پیاسے جگروں کو سیراب کرتے ہیں، اور تا قیامت یہ صدقہ جاریہ اس سعیدہ کے لیے باعث ازدیاد برکت رہے گا۔

حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا کہ ستارے، چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں، یہ مثال عزت و تکریم کی تھی جس کا ظہور اظہر من الشمس ہے۔

بعض اوقات خواب میں یا معمولی سی اُونگھ میں کوئی شخص دیکھتا ہے، یا الہام کی صورت میں آواز سنتا ہے کہ تیرا اُستاد فوت ہو گیا ہے۔ وہ گھبرا کر اُستاد کے پاس پہنچتا ہے اور اس کو

بخیریت تمام پاتا ہے۔ لیکن بعد از ملاحظہ حال اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جو فیض و برکت اس کے وجود یا برزخ میں اس کی طرف سے منسوب تھی کسی خطا کی وجہ سے وہ مفقود ہو چکی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ معانی میرے حال کی عبارت ہی سے نمایاں ہوئے ہیں۔

ہر ایک کا برزخ اس کے حال کی رویت پر واضح ہوتا ہے۔ مثلاً ایک عام دنیا دار آدمی خواب دیکھتا ہے کہ میں اور میرا حریف دونوں کسی پانی تالاب یا دریا یا نہر سے پار جا رہے ہیں۔ حریف تو کشتی پر سوار ہو کر پار چلا گیا ہے اور میں نے ہر چند کوشش کی ہے لیکن پار نہیں جا سکا۔ بعد میں وہ دونوں کسی کام کے لیے اپنی اپنی جگہ پر سعی کرتے ہیں۔ وہ کشتی پر پار جانے والا کامیاب ہو جاتا ہے اور یہ ناکام رہ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی طالب خدا خواب میں دریا کو عبور کرتا ہے، خواہ کشتی پر یا بغیر کسی سہارے کے تیرتا ہوا دریا سے پار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے یہ معائنہ توحید الٰہی کا مترادف ہوتا ہے۔ قصہ مختصر ہر ایک کا دریا سے پار ہونا اس کے ضمیر کی مراد کے سفر کو طے کرنے کے سوا نہیں ہوا کرتا۔

گو حال کے رو سے برزخ فی الدنیا اور آخرہ کا کوئی فرق نہیں ہے لیکن مقام کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے۔ اس کی کیفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی دیوار یا مکان میں آئینہ لگا ہوا ہو۔ اور اس کے سامنے دروازہ کھلا ہوا ہو تو باہر کی ہر چیز اس آئینہ میں سے عیاں ہوتی ہے۔ جو کچھ انسان دیکھتا ہے درست دیکھتا ہے، ہر چیز کی حرکات و سکنات شکل و شباہت میں کوئی فرق نہیں پاتا ہے۔ لیکن موت کے بعد اس مکان سے باہر نکل جاتا ہے اور جو کچھ پہلے عکسی صورت میں دیکھتا تھا، اب عینی صورت میں معائنہ کرنے والا ہوتا ہے۔ ہر نیک و بد عمل جو

مثل تخم کے دل کی زمین میں پوشیدہ تھا، شجر کی مانند ہویدا ہو گیا ہے۔ مثلاً معصیت مثل آگ جلانے والی کے اور نیکی مثل جنت کے ٹھنڈک اور تفریح پہنچانے والی ہو گئی۔ لیکن اس میں بھی عوام کے مانند خواص کا حال نہیں ہوتا ہے۔ خواص کو فی الدنیا یہ کیفیت پنہاں نہیں رہتی ہے۔ وہ ذرا سی غلطی کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی غیر موافق تاثیر ان کے بطن یعنی برزخ میں مؤثر ہوتی ہے، تڑپا دیتی ہے، آگ لگا دیتی ہے، کمزور کر دیتی ہے۔ جب تک وہ اللہ کے فضل و کرم سے دور نہ ہو جائے، ہوش و حواس ہی بجا و درست نہیں ہوتے ہیں۔ اور انبیا و مرسلین کا حال تو ان سب کیفیات سے بدرجہا ورا ہوتا ہے۔ ان کا برزخ دراصل ہوتا ہی نہیں ہے یا صحیح معنوں میں فی الدنیا ان کا حال برزخ کی طرح ہوتا ہے۔ ان حجابات سے یہ ہستیاں منزہ و مبرا ہوتی ہیں، اور دراصل مرسلین کے حال سے مومن تو درکنار کسی اولیا۔ اللہ کو بھی کما حقہٗ واقفیت ہونا محال ہے اس لیے کلام سوء ادبی ہے۔

جس طرح خاص کی حالت اور کیفیت پنہاں ہی رہتی ہے اسی طرح نسبت منکرین کا غلبہ بھی ان کے حال پر غلبہ رکھتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:

وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ	اور اگر دیکھیں راہ بھلائی کی نہ پکڑیں اس کو
سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ	راستہ اور اگر دیکھیں راہ گمراہی کی پکڑیں اس کو
يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ (۷:۱۴۶-پ-۹)	راستہ۔

ان کی حالت اس کے مترادف ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے میرے پاس آ کر شکایت کی کہ جب میں نماز پڑھنے لگتا ہوں تو میرے جوڑوں میں درد ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔

چھوڑ دیتا ہوں تو پھر دو چار دن کے بعد آرام ہو جاتا ہے۔ دراصل انسان اپنے حال سے اکثر جاہل ہی رہتا ہے۔ میں نے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیا کہ یہ بے نمازیت تیرے جوڑوں سے نکل رہی ہے، نماز نہ چھوڑنا، ان شاء اللہ تعالیٰ بالکل صحت ہو جائے گی، لیکن وہ صبر و استقامت نہ رکھ سکا۔

حاصل مطلب، انسان اپنے بطن اور حال کے تغیر و تبدل سے گھبرا جاتا ہے اور غلطی کھا جاتا ہے۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا، صاحب حال بھی اس تغیر و تبدل، قبض و بسط، آرام و تکلیف اور راحت و رنج میں غلطی کھا جاتے ہیں کیونکہ جس نسبت میں اس کا حال مناسبت پیدا کرتا ہے اسی کو حال سمجھنے لگتا ہے، اور دراصل ہر ایک کا وہی حال ہوتا ہے، دوسرے حال یا نسبت سے جاہل ہوتا ہے۔ کوئی لاکھوں میں کا ایک جو قریباً سب نسبتوں سے علم رکھتا ہو، تمام احوال کے میدان سے گزرا ہوا ہو، تمیز کرنے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض صاحب حال جب شریعت غرا اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اپنے حال سے محظوظ ہوتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ہمارا حال خلاف سنت ہے تو وہ اپنے حال کے متوالے دو حال سے خالی نہیں ہوتے۔

(۱) یا تو اس حال کو شریعت اور سنت سے ارفع اور اعلیٰ خیال کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ اسی پر ہوتا ہے۔

(۲) یا اپنے حال کو قضا و قدر خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

پہلے گروہ کے حال کے اسباب و وجوہات ان کی مناسبت کے مترادف ہوتے ہیں چونکہ باری تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو بیحد متاثر بنایا ہے اور یہی اس کی ہر قسم کی ترقی کا باعث

ہے۔ خواہ ناری طبقات سے ہو یا نوری، پاکی ہو یا پلیدی، نیکی ہو یا برائی، خیر ہو یا شر، نفع ہو یا نقصان، ہر ایک فعل سے متاثر ہر ایک نسبت سے مناسبت کر جانے والا اور العادۃ طبیعۃ الثانی کے مصداق ہر رنگ میں رنگا جانے والا اور مطابق كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ ہر ایک اپنے حال میں خوش ہوتا ہے۔ (جس کی تفصیل[1] پہلے گزر چکی ہے) اس لیے طبیعت کی قبض و بسط کو ضمیر کے ترازو میں موازنہ کرنے سے مامور من اللہ اور رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے ورود پر فیصلہ کر لیتا ہے اور اپنی حالت کو درست اور اپنی نسبت کو صحیح خیال کرتا ہے۔ اور نامطابقت کی وجہ سے شریعت غرا اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلا درجہ اور اسفل خیال کرتا ہے اور اپنے حال کو ولایت اعلیٰ پر دال کرتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش صاحب ہجویری لاہوری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جو شخص شریعت غرا کی حدوں کو توڑے اور احکام خداوندی کو فنا کرے لوگوں کے نزدیک ولی ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک وہ شیطان ہے۔

دوسرا گروہ باوجود اسی حال سے مناسبت رکھنے کے برائے نام آداب شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اپنے حال کو قضا و قدر خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور سے

درکوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

کے مضمون سے مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن تقدیر میں انسان مطلق جاہل ہے جس کا علم اس قادر مطلق کے سوا کماحقہٗ کوئی نہیں جانتا۔ گو میری کم استعدادی اتنی وسعت کی مالک نہیں ہے کہ میں اس کو

[1] تفصیل دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۱۱۲ زیر عنوان خواص لبشریہ

تفصیل کے ساتھ تحریر کر سکوں۔ ایسے شخصوں کی حقیقت حال سے تامل ہی ہے لیکن میرا مسلک اس کتاب میں محض انسان فی القرآن ہے، اس لیے

تقدیرِ انسان

میں قلم کو تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم تشریف لائے اور صحابۂ کرام میں سے چند صاحب کچھ تقدیر میں گفتگو کر رہے تھے۔ آپ کا چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا اور فرمایا کہ اس بارہ میں زیادہ کلام نہ کرو۔ قبل ازیں کئی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔

دوسری حدیث شریف میں ہے کہ ازل سے ابدالاباد تک جو کچھ ہونے والا تھا، ہو چکا ہے۔ اور فرمایا کہ جَفَّ الْقَلَمُ یعنی قلم سُوکھ گیا اور سیاہی خشک ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس مسئلۂ تقدیر میں عوام تو درکنار بڑے بڑے علمائے دین کی عقلیں بھی قاصر ہیں۔ بزرگانِ دین میں سے جن پاک ہستیوں کو اس علیم الحکیم نے جس قدر علم بخشا ہے مشیت ایزدی کے مطابق اس کی تفصیل و اظہار سے سکوت اختیار کرنے والے ہیں۔ ہاں حسب استعداد تعلیم سے دریغ کرنے والے نہیں ہوتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کسی شخص نے عریضہ ارسال کیا جس میں بعد حمد و صلوٰۃ کے مسئلۂ تقدیر کا جواب چاہا۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ ہمارا ایمان جبر اور قدر کے درمیان ہے، نہ ہم قدریہ ہیں اور نہ جبریہ، اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا تیری ماں تجھ پر روئے اندھیرے چاہ میں بغیر روشنی کے داخل نہ ہو۔

ان ارشادات سے ثابت ہو رہا ہے کہ سائلوں کی استعداد اور سمجھ کے مطابق یہ جوابات تھے کیونکہ ہر ایک کا بطن اس لقمہ کے قابل نہیں ہے۔ ہر ایک کی استعداد اس کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ اعتقاد صحت کی رو سے نہایت بجا و درست ہے کہ نہ ہم جبریہ ہیں اور نہ ہی قدریہ۔ قدریہ وہ ہیں جن کا یہ اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اس عمل کی جزا یا سزا کے مرتکب ہوتے ہیں یعنی جزا من اللہ نیک اعمال کے رو سے اور سزا معصیت کی وجہ سے۔ اس کے سوا خداوند کریم نہ ہم کو کوئی ثواب عطا فرماتا ہے اور نہ ہی سزا دیا کرتا ہے۔ اور جبریہ کا اعتقاد یہ ہے کہ خواہ ہم عمل کریں یا نہ کریں جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا گیا ہے وہی حصول ہے۔ ہماری کوشش ہمارے عارضہ کی وجہ پر ہے اور مجاہدہ بے سود ہے

قومے بہ جد و جہد گرفتند وصل یار

قومے دگر حوالہ تقدیر می کنند

بلکہ ان کا یقین ہے کہ تدبیر بھی تقدیر کی طرف لے جاتی ہے

سوزنِ تدبیر گر ساری عمر سیتی رہے

رخنۂ تقدیر کو ممکن نہیں کرنا رفو

اور قدریہ اور جبریہ کے درمیان صحت اس وجہ پر ہے کہ ہم قدریہ تو اپنے اعمال کی وجہ پر ہیں اور جبریہ من اللہ جزا یا سزا کی رو سے۔ اور یہ اس لیے کہ اس صورت کے سوا ہر دو وجوہات کلام الٰہی

کے خلاف کی مقتضی ہیں، کما قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط (۴: ۷۹۔ پ ۵۔ س ۸)

جو پہنچتا ہے تجھ کو بھلائی سے پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہنچتا ہے تجھ کو برائی سے پس تیرے نفس سے ہے۔

اس لیے بھلائی اور برائی دونوں کو اس عزیز الحکیم کی طرف منسوب کرنا خطا ہے اور جبریہ کا مذہب باطل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ومثلہا آیات سے قادریت ٹپک رہی ہے۔ لیکن سارے قرآن شریف سے بے محل یا بلاوجہ ایک آیت کا ہونا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ الٓمّٓ سے والناس تک ایک آیت تو درکنار ایک لفظ بھی سوائے اس کے نہیں ہے کہ اصولِ نزول ہمارے حال کی وجہ پر ہے اور شانِ نزول ہمارے اعمال کی وجہ پر۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے کلام کی پوری سمجھ عطا فرمائیں، اس خالقِ کائنات نے انسان کو جامع صفات بنایا ہے اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ فرما کر ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ یعنی میدانِ دنیا میں مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ کی میعاد کی قید لگا کر خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط کا ارشاد فرمایا ہے۔ اس خاکی پتلا میں دونوں جہان کے نشان ہیں۔ پھر فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کی تعلیم عالیہ اس کے ضمیر میں سرشت کی رُو سے گوندھ رکھی ہے۔ بعدہٗ بتوسّل مرسلین اپنی آیات سے یوں تعلیم فرمائی:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ

پس اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پس جس نے پیروی کی ہدایت میری کی پس نہ گمراہ

اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰: ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ پ ۱۶۔ س ۱۹)

ہوگا اور نہ ایذا کھینچے گا۔ اور جس نے منہ پھیرا یاد میری سے پس تحقیق واسطے اس کے ہے معیشت تنگ اور اٹھائیں گے ہم اس کو دن قیامت کے اندھا۔

اور وعدہ اور وعید کی رو سے آگاہ فرما دیا ہے کہ:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ج (۱۸: ۲۹۔ پ ۱۵۔ س ۱۹)

اور آپ کہہ دیجیے کہ یہ حق ہے پروردگار تمہارے کی طرف سے، پس جو کوئی چاہے پس ایمان لائے اور جو کوئی چاہے پس کفر کرے۔

مذکورہ حدیث شریف کا ارشاد مبارک عمل کے میدان میں قانون کے رو سے وعدہ اور وعید کی وجہ پر اس آیت کے مترادف ہی ہے کہ جَفَّ الْقَلَمُ یعنی قلم سوکھ گیا ہے، اور سیاہی خشک ہو گئی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ پھر ہم کس پر عمل کریں؟ فرمایا اعمال نیک میں از حد سعی کرو۔ اب ارشادات کے مطابق تغیر و تبدل خلاف قانون نہیں ہو سکتا۔

یہ قاعدۂ کلیہ اور قرینِ عدل و انصاف ہے کہ ہر شخص کی آزمائش اس کے حصول یعنی طاقت، ہمت اور وصول ہی پر ہوا کرتی ہے۔ تو انسان کو جو صفات من اللہ توفیق ہوئے ہیں اور جس وسعت تک مختار کیا گیا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے مطابق بلا میں مبتلا کیا گیا ہے یعنی آزمایا گیا ہے۔ اس بلا کے میدان میں انسان مفتون اور مولیٰ کریم ممتحن ہیں۔ مطابق ارشاد ذوالجلال والاکرام:

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا

کیا گمان کیا ہے لوگوں نے یہ کہ چھوڑے جائیں

اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ (۲۹: ۱-۲ ۔ پ۲۰ - ع ۱۳)

اتنے ہی پر کر منہ سے کہہ دیں کہ ایمان لائے ہم اور وہ نہ آزمائے جائیں۔

تو انسان اس مقام میں دو حال سے خالی نہیں رہتا۔ یا فرماں بردار، یا نافرمان۔ اور ذات پاک کا معاملہ اس حال میں بھی اپنے بندوں کے ساتھ عجیب ہی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا ۝ (۳۵: ۴۵ - پ۲۲ - ع ۱۷)

اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا لیکن ڈھیل دیتا ہے ان کو ایک وقت مقرر تک۔ پس جب آوے گا وقت مقرر ان کا پس تحقیق اللہ ہے ساتھ بندوں اپنے کے دیکھنے والا۔

تاہم لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ کے مطابق فرمان صادر ہو رہا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَھَا وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۶: ۱۶۱ - پ۸ - ع ۷)

جو کوئی لاوے بھلائی پس واسطے اس کے ہے دس برابر اس کے اور جو کوئی لاوے برائی پس نہیں بدلہ دیا جاوے گا مگر مانند اس کی اور وہ نہیں ظلم کیے جاویں گے۔

وہ مالک حقیقی نیکی کو پسند فرماتے ہیں اور برائی سے بیزار ہوتے ہیں۔ ایک حد تک انسان اسی حال میں حائل رہتا ہے۔ اس مقام سے عبور کرنے کے بعد اس قادر مطلق کی تقدیر انسان کے لیے توفیق سرشتی سے بدل کر اضافیہ تصرف کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ

فرمان مبارک ہے:

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ۭ کَذٰلِکَ یَجْعَلُ اللّٰہُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسْتَقِیْمًا ۭ (۶: ۱۲۶-۱۲۷ ۔ پ۸ ۔ ع ۲)

تو جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔ اور یہ ہی تمہارے پروردگار کا سیدھا رستہ ہے۔

اب یہ دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا ہے جو جبریہ کے مترادف ہے۔ یعنی ارادۂ الٰہی نیک شخص کے لیے ہدایت اور شرح صدر اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی کے مطابق کسی قدر مشیت ایزدی کا تصرف انسان کے ضمیر میں توفیق ہوتا ہے۔ اسلام اور اعمال اس کے لیے آسان تر اور محظوظ ہو جاتے ہیں۔ وہ کشاں کشاں صراط المستقیم کی طرف دوڑا چلا جاتا ہے اور فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کی تعلیم کا راستہ پا لیتا ہے۔ برکات اور نصرات اس کے قدم چومتی ہیں، عجز و الحاح کی دولت اس کا نصیب ہو جاتی ہے۔ پہلا طبقہ سرشت انسانیہ نیک و بد اعمال کی وجہ آزمائش میں تھا جس کو معلق تقدیر سے منسوب کرنا بجا و درست ہے۔ اور یہ حالت یعنی دوسرا طبقہ نسبت اضافیہ از راہ شفقت و کرم نوازی من اللہ تقدیر مبرم کے مترادف ہے، تاہم اس کا تعلق کسی قدر معلق سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ بلعم باعور کی نسبت کلام الٰہی شاہد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا
فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ
فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى
الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ (پ ۹ - س ۱۲)
(سورۂ اعراف ۷ : ۱۷۵-۱۷۶)

اور پڑھ اوپر ان کے قصہ اس شخص کا کہ دیں ہم نے اسکو
نشانیاں اپنی پس نکل گیا ان میں سے پس پیچھے لگایا اسکو
شیطان نے پس ہو گیا گمراہوں سے۔ اور اگر چاہتے
ہم البتہ بلند کرتے ہم اس کو ساتھ ان کے یعنی نشانیوں کے
و لیکن وہ لگ گیا طرف زمین کی اور پیروی کی خواہش
اپنی کی پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ
رکھے تو اوپر اس کے زبان لٹکائے یا چھوڑ دے اس کو
زبان لٹکائے۔

دوسرا شخص اس مقام میں بوجہ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ناراضگی اور غضبی صورت کا شکار ہو رہا ہے یعنی اس میں تصرف حق کسی قدر مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا کے مطابق مردودیت کی طرف ہو جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ
قَلْبِهٖ (۸ : ۲۴ - پ ۹ - س ۱۷)

اور جانو یہ کہ اللہ حائل ہوتا ہے درمیان آدمی
کے اور دل اس کے کے۔

اس کی عقل ماری جاتی ہے، سمجھ اُلٹ جاتی ہے، تکبر و رعونت کا پتلا بن کر مطابق ارشاد كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ (گویا آسمان پر چڑھ رہا ہے) کا مصداق بن جاتا ہے۔ اسلام اور نیک اعمال اس کے لیے کٹھن ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بُرائی کو بھلائی اور بھلائی کو بُرائی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ تاہم کسی قدر اس کی تقدیر معلق سے علاقہ رکھتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ
مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝
اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا
بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴ : ۱۴۶ - پ ۵ - س ۱۸)

بیشک منافق بیچ درجے نیچے کے ہیں آگ سے
اور ہرگز نہ پائے گا تو واسطے ان کے مددگار۔
مگر جنھوں نے کہ توبہ کی اور صلاحیت کی اور مضبوط
پکڑا خدا کو اور خالص کیا دین اپنے کو واسطے اللہ
کے، پس یہ لوگ ساتھ مسلمانوں کے ہیں۔

اور رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے) کے مطابق تغیر و تبدل سے امید باقی ہوتی ہے۔ اب اس طبقہ سے عبور کرنے کے بعد مبرم مطلق ہو جاتی ہے۔ تصرف حق اس کے لیے خواہ شقی ہو یا سعید، ہر دو وجہ پر اس کے حال کے موافق منصرف ہو جاتا ہے۔ کما قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ
ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝
(۲ : ۶-۷ - پ ۱ - س ۱)

بیشک جو لوگ کہ کافر ہوئے برابر ہے اوپر ان کے
کیا ڈرایا تو نے اُن کو یا نہ ڈرایا تو نے ان کو نہیں
ایمان لائیں گے۔ مُہر کی اللہ نے اوپر دلوں ان کے
کے اور اوپر کانوں ان کے کے۔ اور اوپر آنکھوں
ان کی کے پردہ ہے۔ اور واسطے ان کے عذاب
ہے بہت بڑا۔

اس کو مفصل کرنے کے لیے اور اشکال کو رفع کرنے کے لیے دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ

یہ بسبب اس کے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ (۶۳: ۳ - پ ۲۸ - ع ۱۳)

ہوئے پس مُہر رکھی گئی اوپر دلوں ان کے کے پس وہ نہیں سمجھتے۔

اما بعد سرکشوں اور بد نصیبوں کو از رُوئے غیرت و غضب فرمایا:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۸: ۱۹ - پ ۲۸ - ع ۳)

غالب آیا ہے اوپر ان کے شیطان پس بھلادی ان کو یاد خدا کی۔ یہ لوگ گروہ شیطان کے ہیں خبردار ہو تحقیق گروہ شیطان کے وہی ہیں زیان پانے والے۔

اسی طرح سعیدوں کے لیے، نیک نصیبوں کے واسطے از راہ رحمت و ہدایت ارشاد فرمایا:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ

نہ پائے گا تو کسی قوم کو کہ ایمان لاتے ہوں ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے دوستی کریں ساتھ اس شخص سے کہ مقابلہ کرتا ہے اللہ کا اور رسول اس کے کا اگرچہ ہوں باپ ان کے یا بیٹے ان کے یا بھائی اُن کے یا کنبہ اُن کا۔ یہ لوگ لکھ دیا ہے اللہ نے بیچ دلوں ان کے کے ایمان اور قوت دی ہے ان کو ساتھ رُوح کے اپنی طرف سے اور داخل کرے گا ان کو بہشتوں میں کہ چلتی ہیں نیچے ان کے سے نہریں ہمیشہ رہنے والے بیچ ان کے۔ راضی ہوا اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے اور

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۸: ۲۲ - پ ۲۸ - ع ۳)

راضی ہوئے وہ اس سے۔ یہ لوگ ہیں گروہ خدا کے خبردار ہو تحقیق گروہ اللہ کے وہی ہیں فلاح پانے والے۔

یہ احکام اور ان کا اُصُولِ نزول ہمارے حال کے موافق وارد ہے اور شانِ نزول ہمارے افعال کے مطابق۔ بعض جُہلا اور متکبر جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسی آیات کو بلا حجت ذات باری تعالیٰ کی طرف الزام کرتے ہیں اور یہ سراسر خطا اور کم فہمی ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝ (۲۵: ۷۷ - پ ۱۹ - ع ۴)

کہہ کہ نہیں اختیار دیتا تم کو رب میرا اگر نہ ہوتی التجا تمہاری پس تحقیق جھٹلایا تم نے پس البتہ ہوگا وبال اس کا لگ جانے والا۔

کے مطالعہ اور غور سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ ایسی خطا ہے جس کے لیے سزا لازم ہو جاتی ہے۔ ایسے اشکال کو رفع کرنے کے لیے اور حق کو ثابت کرنے کے لیے کیا ہی فیصلہ دیا ہے:

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ

البتہ کہیں گے وہ لوگ جو شریک لاتے ہیں اگر چاہتا اللہ نہ شریک کرتے ہم اور نہ باپ ہمارے اور نہ حرام کرتے ہم کچھ۔ اسی طرح جھٹلایا اُن لوگوں نے کہ پہلے ان سے تھے یہاں تک کہ چکھا انھوں نے عذاب ہمارا۔ کہہ کیا ہے تمہارے پاس کچھ علم پس نکالو گے اس کو واسطے ہمارے؛ نہیں پیروی کرتے تم مگر گمان کی اور نہیں تم مگر اٹکل کرتے۔ کہہ پس واسطے

الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ
أَجْمَعِيْنَ ٥ (۶: ۱۴۹ - ۱۵۰ - پ ۸ - ر ۵)

اللہ کے ہے دلیل پہنچی ہوئی ۔ پس اگر چاہتا ہدایت
کرتا تم کو سب کو۔

بالکل عیاں ہو رہا ہے کہ بلا وجہ اور سوائے حجت کے مالک حقیقی کی طرف افعال سیئہ یعنی شرک کروانے یا توحید کو ثابت کرنے یعنی شرک سے باز رکھنے کو منسوب کرنے والوں کو کذاب فرمایا ہے۔ اور فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کی رُو سے عزت کی وجہ پر بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے تحت میں اپنی مشیت کو نسبت کیا ہے۔ ایسی آیات بینات قرآن المجید میں کثرت سے موجود ہیں جن سے مشیت ایزدی کے سوا کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ کم فہمی اور کم استعدادی کی وجہ سے بلا حجت ذات باری تعالیٰ کی طرف الزام کرتے ہیں اور یہ سخت جہالت اور نادانی ہے۔ ان سب آیات کا یہاں درج کرنا لاحاصل ہے اس لیے سب سے قوی اور مشیت کی دلیل روشن فیصد کے لیے درج کی جاتی ہے تاکہ تمام اشکال کے رفع کرنے کے لیے کافی ہو جائے۔ فرمایا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا
وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ٥
(۳۲: ۱۳ - پ ۲۱ - ر ۱۵)

اور اگر چاہتے ہم البتہ دیتے ہم ہر ایک جی کو ہدایت
اس کی ولیکن ثابت ہوئی بات میری طرف سے
کہ البتہ بھروں گا میں دوزخ کو جنوں سے اور
آدمیوں سے اکٹھے۔

اب حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ ایسا اشکال ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ بات خداوند کریم کی طرف سے قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھروں گا۔ لیکن وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ٥ کی بساط پر غور و تعمق سے عجز و الحاح کے راستہ توفیق من اللہ کا

طالب ہونا بعید از رحمت نہ ہوگا کہ تفسیر القرآن بالقرآن سے یہ اشکال حل ہو جائے۔

اے عزیز! خداوند جل وعلا تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے، حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ (یعنی میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے) کی علت اور اس کی حجت دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ واضح ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ جب خالق کائنات نے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کو سجدہ کا حکم فرمایا تو سب سجدہ میں گر پڑے۔ لیکن ابلیس اکڑ بیٹھا۔ فرمایا مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ، جواب دیا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔ فرمایا دور ہو جا میری درگاہ سے۔ قیامت تک کے لیے تیرے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا گیا ہے۔ تو ابلیس نے کہا کہ میری ایک عرض قبول کی جائے کہ مجھے اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ تک کی مہلت مل جائے۔ ارشاد ہوا فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ تب اس ملعون نے حصول مہلت کے بعد عناد کی وجہ پر کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ٥ فرمان ہوا کہ:

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۚ لَاَمْلَئَنَّ
جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ٥ (۳۸: ۸۴ - ۸۵ - پ ۲۳ - ر ۱۴)

کہا کہ بس سچ بات ہے یہ، اور سچ کہتا ہوں میں:
البتہ بھر دوں گا میں دوزخ کو تجھ سے اور ان سے جو
پیروی کرتے ہیں تیری ان میں سے اکٹھے۔

پس اس قصہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ کا وعدہ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ کے لیے لازم ہوا۔ جو فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کے مترادف ہے۔ نہ کہ بلا وجہ اور بلا حجت جنوں اور انسانوں سے دوزخ کو بھر دے گا کا الزام جو ذات پاک کے لائق نہیں ہے، روا ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایسا گمان کرنا بھی سراسر خطا ہے۔ رہا سوال علم

قضا وقدر

تو جاننا چاہیے کہ علم خداوندی ایک صفت بالذات ہے جو ذات پاک سے منفک نہیں ہے اور نہ ہی ہوئی ہے اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ اور نہ ہی اس کی وسعت کی کوئی حد ہے نہ حصر۔ جو کچھ ظہور میں آیا اور جو آنے والا ہے، اور جو آچکا ہے، اس علیم و خبیر کے علم میں ذرہ بے مقدار کی مانند بھی نہیں ہے۔ جب کچھ نہ تھا اور ہر شے کے ظہور کا علم اس حکیم و قدیر کی ذات معلیٰ میں متحقق تھا، اور اب بھی ویسا ہی علم اس کی ذات میں مانند ذات کے الآن کما کان کے مترادف ہے۔ دراصل ظہور کا علم یا قبل از ظہور متحقق بالذات ہماری تفہیم کے لیے عبارت ہے۔ ورنہ مشیت ایزدی اور قدرت لامتناہی کے تصرف کے میدان میں ان کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ اور وہ اس لیے کہ صفات ذاتیہ کا حصول ذات کے لیے جاننا روا نہیں ہے۔ بلکہ ان صفات ذاتیہ کو حصول بالذات ہے، جو تابع ذات ہیں۔ تو جب اس خالق کائنات نے ظہور کا ارادہ فرمایا تو اوّل خلقت نوری یعنی عالم امر کی طرف مرید ہوئے اور اپنے علم میں سے جس قدر چاہا لوح و قلم کی طرف محفوظ سے منسوب کیا۔ کما قال اللہ تعالیٰ فی القرآن الحمید:

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (۶:۵۹۔ پ۷۔ ع۱۳)

نہیں کوئی تر اور نہ خشک، مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ

نہیں پوشیدہ اس سے برابر ایک ذرے کے بیچ آسمانوں کے اور نہ بیچ زمین کے اور نہ چھوٹا اس

مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ (۳۴:۳۔ پ۲۲۔ ع۸)

سے اور نہ بڑا مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے۔

لیکن یہ علم خداوندی مخلوق میں سے کسی کے علم کی مانند نہیں ہے۔ اور وہ اس لیے کہ علم خداوند کریم ہر شے سے معیت کی رُو سے ہے، اور یہ مخلوق کے لیے کسی وجہ سے بھی روا نہیں ہے۔ مولیٰ کریم کی ہر صفت ذاتیہ اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے بلکہ ہر وصف واصف کل لامحدود ہے، اس لیے ان حرفوں، لفظوں اور عبارتوں سے جو ہماری فہمید کے لیے حق سے نزول کی طرف اصل سے فرع کی طرف اور مرکز سے دائرے کی طرف مبذول کیا گیا ہے اور اجل وراء سے بھی وراء ہے جس کا کما حقہٗ سمجھنا بھی ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ تو اس صورت میں ازلی سعید اور ازلی بدبخت جس کی نسبت ذوالجلال والاکرام کی طرف روا ہے لیکن اس کا علم اور حکم ہماری طرف سے گمراہی کے سوا نہیں ہے۔ اور رب العلمین پر الزام بلاحجت کرنا خطا ہے۔ اور یہ جبریہ کا مذہب ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

مولیٰ کریم اپنے کسی فعل میں عاجز نہیں، بہر وجہ قادر ہیں۔ ہاں باوجود قدرت رکھنے کے لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ کے مطابق وعدہ کا ایفا کرتے ہیں۔ اور یہی قدرت اور تادریت کی صریح دلیل ہے۔ کیونکہ ہر وعدہ کا ایفا خواستہ قدرت کا مظہر ہے استقلالی نہیں رکھتا۔ سارے قرآن مجید میں کسی کے ازلی بدبخت ہونے کا حکم پایا نہیں جاتا۔ ہاں حدیث شریف میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے اور آپ کے ہر دو ہاتھ مبارک میں دو کتابیں تھیں۔ فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کتابیں کیا ہیں، اور ان میں کیا درج ہے"؟ سب نے عرض

کیا "ہمارے ماں باپ قربان ہوں، اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں"۔ تو آپ نے فرمایا ان میں ہر جنتی، اس کے ماں باپ اور اس کے قبیلے کا نام درج ہے۔ اور ہر دوزخی اس کے ماں باپ اور اس کے قبیلے کا نام درج ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور اس پر مُہر چسپاں کی گئی ہے"۔

گو اس حدیث کی صحت میں تامل ہے۔ لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تاہم اللہ جل شانہٗ کی قادریت کی منافی نہیں ہو سکتی کما قال اللہ تعالیٰ:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَ — مٹا دیتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اور ثابت کرتا ہے۔

عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (۱۳: ۔۔۔ پ ۱۳) — اور نزدیک اس کے ہے اصل کتاب۔

اس آیت شریف کے مطابق کمی و بیشی، تغیر و تبدل روا ہو سکتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝ (پ ۲۷ ۔ س ۱۲) — تمہارے فارغ ہوں گے ہم واسطے تمہارے اے دو ثقلین جن و انس کی۔

ان آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ قضا و قدر کا لکھا جانا اور کسی کام کا مقرر ہونا اس امر کا مقتضی نہیں اور نہ ہی ہو سکتا ہے کہ قادریت خداوند تعالیٰ کے کسی امر کا منافی ہو سکے۔ اس خالق حقیقی اور قادر مطلق کا امر ہر وقت، ہر آن، ہر زمان مخلوق کے لیے مفعول ہے۔ عالم امر سے لے کر عالم موجودات تک کوئی چیز خواہ نوری ہو یا ناری، روحی ہو یا اجسادی؛ اپنے ارادہ اور حال میں قادر نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ اس قادر مطلق کے ید قدرت میں عاجز اور طوعاً و کرہاً بندہ کی حیثیت میں ہے۔ تو اس صورت کے ضمن میں قضا و قدر کا

لکھنا جس کی کیفیت اور حال سے علم اس ذات پاک کے سوا محال ہے اور مطابق: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ اس کا مٹانا اور ثابت رکھنا قادر مطلق کی قدرت اور اختیار میں محویت اور مثبت عاجز اور لاچار ہے، اس لیے کسی حکم کے لیے بھی تعین کا مدار روا نہیں ہو سکتا۔

اور یہ ہماری رجا و خوف کی حالت کو درست رکھنے اور اس سے مفاد حاصل کرنے اور صحت کے ساتھ رجوع الی اللہ حاصل کرنے کے واسطے ثبت اور نسخ کو قادریت کے تصرف کا مسخر بنا دیا ہے تاکہ بہر حال رضائے الٰہی کے میدان میں ثابت قدمی سے مقصود حاصل کرنے والے ہوں ◆

ولایت، کرامت اور استدراج

ولایت

حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ خداوند کریم ان کا ہونا چاہتا ہے اور یہ خدا کو چاہنے والے ہوتے ہیں۔ اصل مقصود کے معنوں کو پانے ہوئے، محبت کے شجر کو معرفت کے باغ میں سجائے ہوئے، من دون اللہ سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔ انگوریاں ان کے قدوم کی برکات سے اگتی ہیں، مسلمان ان کی دعاؤں سے فتح حاصل کرتے ہیں، يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کی دولت انہی ہستیوں کے لیے مخصوص ہے جس کے لیے مولیٰ کریم نے انسان کو

تخلیق کیا ہے۔

اے بھائی! سمجھ کہ یہ محبت مخلوق کی محبت کی طرح نہیں ہے کیونکہ اس کا حصول حجابات کے دور ہونے کے سوا درست نہیں ہو سکتا۔ اور ماسوی اللہ کی محبت سراسر حجاب ہے اس لیے مائل کی گئی چیزوں سے اعراض کرنے کے سوا اس کا حصول ناممکن ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ	اور بعضے لوگوں میں سے وہ ہے کہ پکڑتا ہے سوا
اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ	اللہ کے شریک محبت کرتے ہیں ان سے جیسا کہ
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ	محبت خدا کی۔ اور جو لوگ کہ ایمان لائے ہیں،
(پ۲ - ع۴)	زیادہ ہیں محبت میں واسطے اللہ کے۔

اس آیت شریف سے صاف ظاہر ہے کہ کسی غیر خدا سے محبت شرک ہے اور شرک دو وجہ پر ہے۔ ایک شرک جلی اور دوسرا شرک خفی۔ شرک جلی تو کسی غیر کے سامنے سجدہ یا اس کی عبادت کرنا، یا اس سے خداوند کریم کی مثل مدد مانگنا، یا اس لم یزل ولا یزال بے مثل و بے مثال کی مانند کسی کو جاننا ہے لیکن شرک خفی محض کَحُبِّ اللّٰہ کا مصداق ہے یعنی کسی غیر خدا سے اس طرح محبت کرنا جیسی اس محبوب حقیقی سے چاہیے تھی۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تک آدمی اپنی جان سے بھی زیادہ محبت مجھ سے نہ رکھے مومن نہیں ہو سکتا۔ تو اس کا حل بھی کلام الٰہی میں ہے چنانچہ سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ	سوائے اس کے نہیں کہ دوست تمہارا اللہ ہے، اور
آمَنُوا (پ۶ - ع۱۲)	رسول اس کا اور وہ لوگ کہ ایمان لائے۔

بظاہر تو دونوں آیات بھی آپس میں متضاد سی نظر آتی ہیں۔ لیکن مذہب کے میزان اور نور ایمانی کے ترازو میں جانچنے سے نہ صرف تطبیق ہو گی بلکہ معاملہ کی صحت منکشف ہو جائے گی۔

عزیزا! دو چیزیں ان آیات سے صادر ہوتی ہیں۔ (۱) مِنْ دُونِ اللّٰہ (۲) فِی سَبِیْلِ اللّٰہ۔ تو جان کہ ہر مِنْ دونِ اللہ شرک ہے اور ہر فی سبیل اللہ حق۔ بلکہ سبیل کے سوا اصل مدعا کا ملنا دشوار، اور ولایت مذموم، اور دوستی لاحاصل ہے۔ دراصل کسی نبی، ولی یا مومن کی محبت بالنسبت کے سوا یا دوسرے معنوں میں نور رسالت کے سوا محبت سراسر گمراہی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ عزوجل:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ	اللہ دوستدار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے،
مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ	نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے طرف نور کے۔ اور
كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ	جو لوگ کہ کافر ہوئے دوست ان کے شیطان
يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ	ہیں۔ نکالتے ہیں ان کو نور سے طرف اندھیروں کے
أُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا	یہ لوگ ہیں رہنے والے آگ کے، وہ بیچ اس کے
خَالِدُونَ (پ۳ - ع۲)	ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

ہیہات! آج عوام الناس کے نزدیک جو کوئی اسلام کے برخلاف راستہ اختیار کرے، اور ایمان کے حکموں کو فنا کرے ولی ہوتا ہے لیکن عند اللہ و عند الرسول ایسا شخص شیطان ہے۔

اس عزیز الحکیم نے حق سے باطل کو مٹانے کے لیے، سچ سے جھوٹ کو نابود کرنے کے لیے، نار کو نور سے بجھانے کے لیے، اس غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے، صراط المستقیم پر چلانے کے لیے مشعل ہدایت کو سُجھانے کے لیے کیا ہی اچھا فیصلہ دیا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳: ۳۱۔ پ۳۔ ع۱۲)

کہہ اگر ہو تم چاہتے اللہ کو پس پیروی کرو میری چاہے گا تم کو اللہ۔

یعنی اے میرے حبیب! ان لوگوں سے فرما دو، سنا دو، سمجھا دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، اس کے محب بنتے ہو، یعنی اپنے زعم میں بساط محبت پر عشق کا دم بھرتے ہو، تو آؤ میری اتباع کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے۔

اس سے ثابت ہوا کہ سوائے اتباع حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہماری محبت محل قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر سکتی ◆

کرامت

کرامت اکرام من اللہ ہے جو اللہ کے بندوں سے کئی وجوہات کی بنا پر ظہور پذیر ہوا کرتا ہے اور یہ کئی نوع پر منقسم ہے: اضطراری، اختیاری، استقراری۔

جب کسی مصیبت کے وقت مومن کو اضطرار واقع ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے، اور مطابق:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ

آیا کون ہے کہ قبول کرتا ہے دعا مضطر کی جب کہ پکارتا ہے اس کو اور کھول دیتا ہے برائی اور

الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ (پ۲۰: ع۱۴)

کرتا ہے تم کو جانشین زمین کا۔ آیا ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے، تھوڑے سے نصیحت پکڑتے ہو۔

ہر مضطر کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ اس کی التجا رد نہیں کی جاتی اور اس کو تسکین اور قرار دینے کے لیے مناسب مدد دی جاتی ہے۔ حسب استعداد اس کرامت کا ظہور من اللہ ہوا کرتا ہے۔ اولیائے کرام کے ہاتھوں بڑے بڑے زبردست کارنامے معروف ہیں لیکن ان کے ظہور میں مطلق ان کا دخل نہیں ہوتا محض اکرام من اللہ ہی ہوا کرتا ہے اور یہ اس محبت کے صلہ میں سے ہے جو مولیٰ کریم کو اپنے بندوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ فرمان مولیٰ کریم ہے:

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ (پ۲۴۔ ع۱۸)

ہم ہیں دوست تمہارے بیچ حیاتی دنیا کے اور بیچ آخرت کے۔

دوسری کرامت اختیاری ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک اختیار من اللہ ہے اور دوسری تصرف بذات خود سے جس میں مطلق اختیار ہے۔ اختیار من اللہ انبیائے کرام کے لیے خاص ہے۔ جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا اور شیاطین (جن وغیرہ) مسخر کرنے کے بعد فرمایا:

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (پ۲۳۔ ع۱۲)

یہ ہے عنایت ہماری، پس بخش دے یا بند کر بغیر حساب کے۔

جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں، اور حساب کا ڈر بھی نہ رکھیں۔ اور مومنین میں سے بھی کسی قدر ایسے اختیار کا دیا جانا روا اور ثابت ہے چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام

نے بلقیس کا تخت منگانے کے لیے اپنے درباریوں سے خطاب فرمایا کہ کون اسے جلد از جلد میرے پاس لا سکتا ہے؟ تو:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ	کہا اس شخص نے کہ نزدیک اس کے تھا علم کتاب سے
اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ	میں لے آتا ہوں تمہارے پاس اسے پہلے اس
طَرْفُكَ ط (پ۱۹ - ۱۸)	کہ پھر آوے طرف تمہاری نظر تمہاری۔

حضرت ابوالحسن عُرف حضرت غوث علی شاہ صاحب پانی پتی قدس سرہٗ تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ "جب ہم بارادۂ حج بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے تو اس کے معلّم سے ہم نے پوچھا کہ "میاں! کبھی کوئی مردِ خدا بھی ملا ہے"؟ اس نے کہا کہ "ہاں دو مرد ملے ہیں۔ ایک تو اس زمانہ میں تشریف لائے تھے جب میں عمر دس سال تھا اور میرا باپ معلّم تھا۔ اور دُوسرے اب ملے ہیں"۔ ہم نے کہا کہ "بھائی! ان کو تم نے کیونکر پہچانا تھا"؟ کہا کہ "جس وقت ہمارا جہاز حاجیوں کو لے کر چلا تو ایک فقیر ڈبہ سے نکل کر میرے والد کے پاس آن بیٹھا اور کہنے لگا کہ "اس میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے، بھلا منزل مقصود پر کب پہنچیں گے"؟ انہوں نے جواب دیا کہ "سوا مہینہ میں"۔ اس نے کہا "یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ہمارا جی متلاتا ہے۔ اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کبھی سوار نہ ہوتے"۔ والد نے کہا "صاحب! میں مجبور ہوں۔ اگر آپ کچھ ہمت رکھتے ہوں تو زور لگا دیجئے تاکہ جہاز ساحل جدہ پر جا لگے"۔ فقیر نے کہا "اچھا یہ تو بتلاؤ پہلے کونسا بندر آتا ہے"؟ کہا "عدن"۔ پوچھا پھر؟ جواب دیا مخہ۔ کہا اور؟ جواب دیا حدیدہ۔ بولا اور؟ کہا جدہ۔ تب فقیر نے فرمایا کہ بس لنگر ڈال دو اور خود اُٹھ کر ڈبہ

کے اندر چلے گئے۔ میرے والد نے سمندر کی طرف نگاہ کی تو کنارہ پر چراغ روشن نظر آئے اور جدہ کے آثار معلوم ہوئے۔ نہایت حیرت ہوئی کہ الٰہی! یہ کیا معاملہ ہے۔ پندرہ دن تک تو بمبئی سے چل کر کنارہ کا پتہ بھی نہیں لگا۔ ایک خلاصی کو حکم دیا کہ جلد ہوڑے پر سوار ہو کر جا اور کنارہ کی خبر لا"۔ وہ دیکھ کر واپس آیا اور کہا کہ "صاحب! بندر جدہ آگیا"۔ والد نے جہاز کو لنگر کروایا اور فقیر کو ڈھونڈا تو کہیں پتہ نہ لگا۔ اللہ اکبر! بڑا زبردست بزرگ تھا مگر افسوس ہے پھر اس کی زیارت نہ ہوئی"۔ ہم نے کہا "دوسرا کہاں ہے"؟ بولا کہ "میرے پاس بیٹھا ہے"۔ ہم نے کہا کہ "تم نے کیونکر جانا"؟ کہا کہ "مجھ کو ہزارہا آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے فقرا کی زیارت کی مگر کسی نے یہ سوال نہ کیا اور مردِ خدا کا حال نہ پوچھا۔ آپ کے سوال سے میں جان گیا۔ کیونکہ مرد کو مرد پوچھتا ہے"۔

اولیا را می شناسد اولیا دزد را ہم دزد داند بے ریا

غیر جنسیت نے داند کسے می شناسد جنس خود را ہر کسے

لیکن ایسا شخص ابوالوقت یا خضرالوقت ہوا کرتا ہے۔

دوسرا تصرف بذاتِ خود ہے، جو کسی حد تک اختیاری ہوا کرتا ہے اور بشری قوت کے تصرف فی الضمیر کا نتیجہ ہوتا ہے (جس کی مثالیں عالم برزخ کے بیان میں ذکر کی گئی ہیں) لیکن باوجود طاقت رکھنے کے بھی یہ تصرف بذاتِ خود کو پسند نہیں فرماتے ہیں۔ کیونکہ اپنے حال کو پاتے ہوئے "نزدیکاں را بیشتر حیرانی" کے تحت میں اتقا کو اختیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور چونکہ یہ تصرف بذاتِ خود

استدراج

کی مانند ہوتا ہے اس لیے ایسے تصرف کو مذموم کہا ہے اور بندگان خدا نے اس سے اجتناب کیا ہے۔

اے بھائی! وہ ہادی مطلق تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، اس قادر مطلق خالق موجودات نے انسان کو جامع الصفات بنایا ہے اور اس کی قوت کو طاقت اور ہمت دو حصوں پر منقسم فرمایا ہے۔ طاقت جسمانیت سے علاقہ رکھتی ہے اور ہمت رُوحانیت سے۔ اور انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اور هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا کا ارشاد فرما کر سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وغیرہ یعنی سب کی سب مخلوق اور اس کا مفاد انسان ہی کی خاطر بنایا اور اس کو اپنے لیے۔ چونکہ اس بیان میں بہت طول ہے اور اس باب میں تفصیل اصل مقصود کے خلاف کی مقتضی ہے۔ اس لیے اختصار کے راستہ اصل کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

فرمان ذوالجلال والاکرام ہے کہ:

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (پ۱۴ - ۵)

اور اوپر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی ان میں سے کج ہیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (پ۱۵ - ۱)

بیشک یہ قرآن راہ دکھاتا ہے طرف اس راہ کی کہ وہ بہت سیدھی ہے۔

اور یہ قصد السبیل اور اصل مقصود لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ لیکن سعی انسانی کئی وجہ پر ہے۔ تو مطابق فرمان لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے جدھر انسان سعی کرتا ہے، ذات پاک اس کو اُدھر ہی چلنے دیتے ہیں، اور نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کی سنت کے مطابق اُدھر ہی چلاتے ہیں۔ انہی جائر میں سے ایک کج راہ قبولیت خلق ہے جس کو بزرگان دین نے لوہے کے زنّار سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بہت بڑا حجاب ہے بلکہ شیطانی تصرف کا آلہ اور بہت بڑی گمراہی کا سبب، نفس کا سرمایہ، نہ ٹلنے والی بلا اور شہد میں ملی ہوئی زہر ہے جو اخلاص کی زندگی کو ہلاک کر دینے والی اور اعمال صالحہ کو مثل خس و خاشاک کے جلا دینے والی ہے۔ اسی مرض کے مبتلا مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا کے فریفتہ نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ سے بے خبر اور شیدا میدان دنیا ومافیہا کے شجر اور ثمر تک پہنچنے والے سخت ترین مجاہدات سے نفس کا خلاف کرتے ہیں اور اسی وابستہ رُوحانیت کو قوت دینے والے ہوتے ہیں۔ چونکہ مولیٰ کریم نے انسان کی سرشت میں رُوحانیت کا دار و مدار اسی پر رکھا ہے، اس لیے ایسے شخص بھی مطابق ارشاد مولیٰ کریم:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (پ۹ - ۱۳) (۷ : ۱۸۲ - ۱۸۳)

اور جنہوں نے جھٹلایا نشانیوں ہماری کو البتہ درجہ بدرجہ کھینچیں گے ہم ان کو گمراہی میں جس طرح کہ نہیں جانتے۔ اور ڈھیل دوں گا میں اُن کو تحقیق تدبیر میری مضبوط ہے۔

غیرت کی رُو سے ہی سہی کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیتے ہیں، اور خلقت کے کاموں میں تصرف رکھتے

ہیں چنانچہ نقل ہے کہ:

"دہلی میں ایک ہندو فقیر تھا سلب مرض میں بہت کمال رکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک بار سلطان جی سخت مریض ہوئے۔ اپنے مریدوں کو فرمایا کہ مجھ کو اس کافر کے پاس ہرگز نہ لیجانا۔ جب مرض کا غلبہ ہوا اور حضرت بے ہوش ہو گئے تو مرید گھبرائے۔ ناچار اس کے پاس حضرت کو لے گئے۔ اس نے فوراً مرض سلب کر لیا۔ آپ ہوش میں آئے، اور دیکھا کہ اس کافر نے سلب مرض کیا ہے۔ اس کو کچھ انعام دینا چاہیے۔ فرمایا کہ تم کو یہ کمال کس طرح حاصل ہوا؟ اس نے کہا کہ نفس کے خلاف کرنے سے۔ آپنے فرمایا کہ بھلا تمہارا نفس اسلام کو قبول کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا کہ پھر یہ بھی تو خلاف نفس کرو۔ وہ اول تو خاموش ہوا، پھر اسلام لایا۔ اور حضرت نے اس کو تعلیم فرمایا"۔

یہی استدراج کا اصل ہے۔ اور مسمریزم بھی اسی شجر کی شاخ ہے۔ جاہل لوگ اس کو بھی ولایت کی مانند یا اس کا کچھ حصہ سمجھ لیتے ہیں لیکن کرامت محض اکرام من اللہ اور محبت الٰہی کی وجہ پر ہے اور استدراج اس کے برعکس مردودیت کی وجہ پر ہے:

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ	اور جو کوئی چاہے سوائے اسلام کے دین پس
يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ	ہرگز نہ قبول کیا جائے گا اس سے، اور وہ بیچ
الْخٰسِرِيْنَ ٥ (پ ۱۰۔ س ۱۷)	آخرت کے ٹوٹا پانے والوں میں سے ہے۔

دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نور اور نار کا سا حال ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَ	اور نہیں برابر ہوتا اندھا اور دیکھنے والا، اور

لَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۙ وَلَا الظِّلُّ	نہ اندھیرا اور نہ روشنی، اور نہ سایہ اور نہ
وَلَا الْحَرُوْرُ ۚ (پ ۲۲۔ س ۱۵)	دھوپ۔

علم غیب

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ	وہی ہے اللہ جو نہیں کوئی معبود مگر وہ، جاننے
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ	والا ہے پوشیدہ کا اور حاضر کا۔ وہی ہے
الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ٥ (۵۹:۲۲۔ پ ۲۸۔ ع ۶)	بخشش کرنے والا مہربان۔

اصُول نُزول کے مطابق یہ بھی ہمارے حال ہی سے عبارت ہے، ورنہ خداوند کریم کے لیے کوئی غیب نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس خالق کائنات کی شان کے لائق ہی نہیں۔ تمام مخلوقات سے جو ہمارے لیے ظاہر ہے اور جو مخفی ہے، فعل کے رُو سے یا حال کی وجہ پر اس سب سے علیم ہے۔ اور جس قدر وہ کسی کو عطا کرے، عنایت کرے اسی قدر وہ اس کا جاننے والا ہوتا ہے۔ اور یہ کئی نوع پر منقسم ہے:

جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خلقت فرمایا اور ملائکہ کو متنبہ کرنے اور اپنی قدرت کاملہ کے ظہور کے لیے علم لدُن سے اُن کے قلب اطہر میں القا کیا تو انہوں نے موجودات کے نام بتلا دیے۔

یہ وہ عبارت ہے جس کے لیے کوئی لفظ نہیں اور یہ وہ کلام ہے جس کے لیے کوئی

ضرورت نہیں۔ اور یہ وہ علم تھا جس کے لیے ظاہری تعلیم کی احتیاج نہیں محض القائے ربانی تھا جس کو علم لدُن کہنا روا ہے۔ اور بڑی دلیل اس کی شاہد ہے کہ اگر کوئی ظاہری مروجہ تعلیم سے یا کسی کتاب سے، یا حفظ کی وجہ سے جن میں محض کلام بغیر عبارت ہی کی احتیاج ہے ہوتی تو آج تمام بنی آدم کی ایک زبان ہونا چاہیے تھی۔ لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اہل عرب کے لیے فارسی زبان بمنزلہ غیب کے ہے لیکن عربی لسان ان کے لیے ظاہر۔ اسی طرح ہر زبان مثلاً ہندی، پنجابی، سندھی، انگریزی، افریقی، امریکی، عبرانی وغیرہم سب ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ اور ہر ایک ملک کے لیے دوسرے ملک کی زبان بمنزلہ علم غیب کے ہے۔ اور اس عزیز الحکیم نے اس اختلاف اَلسنہ کو اپنے نشانات سے تعبیر فرمایا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور نشانیوں اس کی سے ہے پیدا کرنا آسمانوں کا
وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ	اور زمین کا، اور اختلاف زبانوں تمہاری کا اور
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ○	رنگوں تمہارے کا۔ تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں
(۳۰: ۲۲۔ پ ۲۱۔ ر ۶)	ہیں واسطے عالموں کے۔

خواہ انسان جہالت کے سبب سے انکار ہی کرے، اس میں کلام نہیں کہ انسان کے علم کی ابتدا مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا سے ہوئی ہے۔ جیسے اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بے بہا دولت سے جس کو ذوالجلال والاکرام نے نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ سے نامزد کیا ہے، عامل ہوتے ہی موجودات کے نام بتا دیے۔ یہ علم موجودات سے ہے جیسا کہ ہر فرد بشر مختلف زبانوں اور ناموں سے واقف اور عالم ہے۔ اور اس موجودات

میں سے کسی چیز کی بھی علم غیب کی طرف نسبت نہیں اور وہ اس لیے کہ ان اشیاء کا غیب اس علم کے ذریعے جس کو مروجہ صورت میں مادۂ انسانی کہنا درست ہے ظاہر ہو چکا ہے۔

اس موجودات سے استعداد انسانی کے راستہ عقل کے میدان میں عالم محسوسات کا علم ہے۔ جیسے گرمی سردی اور تمام اشیاء کے اثرات کا اخذ کرنا اور تجربہ کے بساط پر ان تاثیرات کے فعل کا معائنہ اور ان کی طاقت کا تجربہ اور عقلی تجربات سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ	اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے مسخر کیا واسطے تمہارے
الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ	دریا کو تو کہ چلیں کشتیاں بیچ اس کے ساتھ حکم اس کے
وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (۴۵: ۱۲۔ پ ۲۵۔ ر ۱۸)	کے اور تو کہ ڈھونڈو فضل اس کے سے اور تو کہ تم شکر کرو۔

پانی اور معدنیات کی رگڑ سے برقی طاقتوں کا عمل معروف ہے۔ بے تار برقی سے خبروں کا دور دراز سے تصرف فی زمانا اظہر من الشمس ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں لاحاصل ہے، سوائے اس کے کہ ان محسوسات اور تجربات سے ان کی تاثیرات و افعال کے علم سے معلومات کا حاصل ہونا ثابت ہے، جو محسوسات سے معلومات کا حفظ دماغ میں اخذ کرنا ہے گویا موجودات سے محسوسات اور محسوسات سے معلومات تک کا تو علم سیکھنے سے حاصل ہو سکتا ہے، اس لیے ایسے علوم کو کسبی کہنا روا اور درست ہے، بلکہ ان کی حقیقت ہی یہی ہے۔ لیکن معروفات کے میدان میں عقل کا ادراک مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

جن اشخاص کی سعی اور ہمت کی دوڑ ان عوالم تک محدود رہی اور اس طاقت اور استعداد

کا فائدہ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ہی پر محدود رہا۔ وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کی غفلت اور جہالت نے ان کے عقلوں کو ڈھانپ لیا۔ عالمِ معروفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہی کو انتہائے علم اور مقصود جان لیا، نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی کی عادت الٰہی نے اُن کو مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ۝ کا مرتکب کر دیا اور مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ (پ۔۲۵) کی دولت سے محروم رہ گئے۔

اے بھائی! خدائے کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی کی رحمت سے اصل مقصود کی طرف راستہ دے، اہلِ دنیا تو درکنار، اہلِ دین کا علم بھی جو ظاہر پر حکم رکھتا ہے، عالمِ معلومات سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ گو اجر کے لحاظ سے مغفرت اور عملی جامہ کے رُو سے نعمت کا سبب ہے، مگر اسی کو معراجِ کمال سمجھ لینا اصل مقصود سے محجوب رہنے کے باعث ہے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جو لوگ اسی علم کو جو محض نظامِ دنیا اور ثوابِ الآخرہ تک محدود ہے، لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ کی وجہ پر اس سے آگے کے منکر ہو رہے ہیں، جو سخت نقصان کا باعث اور العلم حجاب الاکبر کا مصداق ہے۔

عزیزا! اس سے آگے عالمِ معروفات کا علم حجابات کے دور ہونے کے سوا نہیں ہے جس کا حصول دائمی فکرِ صحیح اور فضلِ ایزدی کے بغیر ناممکن ہے، اور جس کا توسل بموجب ارشادِ ایزد متعال فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا، کاملان و عارفانِ خدا کے خاکِ زیرِ پا ہونے اور صحیح اتباع کرنے کے سوا محال ہے ؎

علم انوار است اندر دلِ رجال — نے ز راہ دفتر و نے قیل و قال

علم در سینہ بسینہ آمدہ — علم بے کینہ خزینہ آمدہ

"علم درسی نہ بود، در سینہ بود"

عالمِ معروفات کا علم سراسر رویت اور عالمِ معلومات کا علم محض ظن۔ تو اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کے مطابق جب رویت کا حصول ہو، ظن باقی نہیں رہتا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص نارنگی (سنگترہ) کے علم کا طالب ہے اور اس کا بالتفصیل علم حاصل کرتا ہے کہ سنگترہ ایک پھل ہے جس کا درخت درمیانہ، برگ درمیانہ لمبوترے، پھول سفید، اور خام پھل سبز ہوتا ہے۔ جب پختہ ہوتا ہے تو گہرا زرد رنگ اختیار کر لیتا ہے چھال نرم سی اور اس کے اندر آٹھ نو پھانکیں زرد رنگ، رس بھریاں ایک دوسری سے ملحق ہوتی ہیں، جن کا ذائقہ ترش و شیریں ہوتا ہے، وغیرہ سب صفات سے عالم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے شخص کو نارنگی کے درخت کے پاس لے جاتے ہیں، اور ظاہری علم سے ایک سبق یا ایک لفظ بھی نہیں پڑھایا جاتا۔ صرف ایک سنگترہ درخت سے توڑ کر اس کو کھلا دیا جاتا ہے۔ اب پہلا عالم ہے اور یہ دوسرا عارف۔ عالم کے متعلق احتمال ہے کہ بجائے سنگترہ کے کھٹے یا مالٹے کو سنگترہ سمجھ لے۔ لیکن دوسرا شخص جو سنگترہ سے عارف ہو چکا ہے، یہ غلطی نہیں کھا سکتا۔ اس لیے بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف عالم، عارف نہیں ہوتا لیکن عارف عالم ہوتا ہے۔

ہر علم کا حامل روح ہی ہے، جو حیاتی کا اصل، وجودی دائرے کا مرکز، ہر فرع کا اصل اور ہر فعل کا متصرف ہے۔ گو یہ وجود اس کے علم کا مظہر ہے لیکن اس کے چہرے کا

نقاب اور حجاب بھی ہے۔ یہ جس حجاب میں محجوب ہوتا ہے اسی کا حکم رکھتا ہے۔ مثلاً موجودات کا علم اس کے لیے حجاب اکبر ہے۔ اور عالم محسوسات جو موجودات سے بالاتر ہے، موجودات کے حجاب سے بری ہے۔ اسی طرح معلومات کے لیے محسوسات ایک حجاب ہے۔ باوجود ایک دوسرے سے متعلق ہونے کے ان عالموں کو آپس میں کوئی نسبت نہیں۔ لیکن جب بفضل الٰہی معروفات کے میدان میں قدم زن ہوتا ہے تو موجودات، محسوسات اور معلومات کے حجابات سے خلاصی پانے والا ہوتا ہے۔ تب مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللہ کی رضا کے راستے عالم امر سے مطلع ہو کر اس عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ سے اپنی ذات کو پہچاننے والا، مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کے راز کو پانے والا، وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کی بصارت سے بینا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس میدان یعنی عالم امر سے جو آمر کے امر سے وابستہ ہے، عارف ہوتا ہے۔ مگر اس کے حال اور کیفیت کا بیان از حد مشکل ہے تاہم اتنا کہ ایسے شخص کی نظر میں ہر مخلوق کا فعل فعل خداوندی ہی ہوتا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ جب حجابات دور ہو جاتے ہیں تو اس کی نظر میں مخلوقات کے حجاب بھی نہیں رہتے۔ اور یہ عبارت حال کے غلبہ کے رُو سے ہے۔ اپنے حال کے مطابق نفی حجاب اور اثبات امر و فعل کا معائنہ کرنے والا ہوتا ہے اُ

حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

کے دریا میں مستغرق۔ گو لاکھوں میں کا کوئی ایک اس مقام تک پہنچتا ہے۔ لیکن یہاں تک پہنچنے والوں میں سے اکثر اس مقام ہی پر ڈیرہ ڈال دیتے ہیں، اور اسی کو معراج کمال سمجھ لیتے ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ ذاتِ معلّیٰ نے اس فعل کو جو محض امر الٰہی یعنی عالم امر سے ہے، روح (جس کو

مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ سے تعبیر کیا ہے) کی طرف معرفت کو اجرا رکھا ہے، عین فعل ذات بلکہ عین ذات ہی سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ بھی ایک حجاب ہی ہے۔ مشیت ایزدی اور فضل ربّانی سے جن کا یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے وہ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللہ کے مطابق سعی اور ہمت کے قدموں سے محبت کی وادی میں سرگردان پھرنے والے اور محبوب کی طلب میں جان پر کھیلنے والے ہوتے ہیں۔ اگر مشیت ایزدی ان کی یاوری کرے تو لقائے الٰہی کی دولت سے مشاہدہ کی رویت نصیب ہو جائے، تو بعید از رحمت نہیں ہے اور یہی انسان کے علم و عرف کی انتہا ہے۔ اس سے آگے اس کی رسائی نہیں۔

اب یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، جس کی سمجھ اور حل انسانی طاقت سے باہر ہے کہ علم کا حصول موجودات سے شروع ہو کر لقائے الٰہی و مشاہدہ لامتناہی تک بس ہے، اور علم کے معنی کسی شے سے واقف ہونے اور اس کے جاننے کے سوا نہیں ہیں۔ تو قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے تحت بلقیس کا تخت لانے میں ارشاد مولیٰ کریم ہے:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ	کہا اس شخص نے کہ نزدیک اس کے تھا علم کتاب سے
اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ	میں لے آؤں گا تمہارے پاس اس کو پہلے اس سے
طَرْفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ	کہ پھر آوے طرف تمہارے نظر تمہاری پس جب دیکھا
قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (۲۷: ۴۰)	اس کو ٹھیرا ہوا نزدیک اپنے کہا یہ ہے فضل پروردگار
(پ ۱۹۔ ع ۱۸)	میرے کے سے

اتنی مسافت سے عرش عظیم کی رویت تو ایک بڑے علم کشف سے ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو

آنکھ جھپکتے میں لاکر حاضر کرنا کسی علم کے عمل کا نتیجہ خلاف عقل و ادراک ہے جس کا انحصار دو وجہ پر ہے۔ ایک تو اتنا بڑا کہ اس کو عرش عظیم فرمایا ہے اُٹھانا اور آناً فاناً لے آنا۔ اور دوسرا اس کا حفاظت اور حراست شاہی سے نکالنا۔

مَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ جواب اور حل اس کا اس طرح ہے کہ سب طاقتوں کا مرجع ذات باری تعالیٰ کی طرف ہے اور ان کا فعل اسی کی جانب رواہے۔ اور یہ بھی دو نوع پر منقسم ہیں۔ ایک تو وہ طاقت ہے جو انسان کی طرف اپنی عطا سے ودیعت فرمائی ہے جس میں اس کو کسی قدر اختیار دیا ہے۔ اور اس میں یہ حسنات و سیئات کے رُو سے مختار ہے اور ان کی جزا و سزا کا مستحق اور حامل۔ مثلاً حیاتی جو محض عطائے الٰہی ہے لیکن ودیعت ہونے کے بعد انسان کے لیے ذاتی کا حکم رکھتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہ ہوگی۔ خواہ یہ اس کے صرف کرنے میں کافر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ دوسرا فعل جو ذات باری تعالیٰ کے لائق ہے جس میں کسی فرد بشر کو طاقت نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کے تصرف کی مجال۔ اور وہ تصرفات رُوحی کے متعلق ہے۔

گو ہر فعل نیک و بد کا مقتضی رُوح ہی ہے۔ لیکن بارشاد رب العالمین مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کی تقسیم لازم ہے۔ مِن بعد بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے باعث اور اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی وجہ پر حسب ارشاد ذوالجلال و الاکرام يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ غضبی اور رحمی شان سے رُوح کی جانب متصرّف ہونا۔ مطابق قرآن مجید سنت اللہ جاری ہے۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ فی الدنیا اور كَلَّآ اِنَّهُمْ لَمَحْجُوْبُوْنَ فی الآخرہ ہے۔ اور يَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ کا نتیجہ قرب خداوندی اور

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کے سایہ میں تخلقوا باخلاق اللہ سے حجاب کا دور کرنا ہے جو اصل مقصود ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ حدیث قدسی کس امر کی دلیل ہے:

وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ عَادٰى لِىْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَىَّ عَبْدِىْ بِشَىْءٍ اَحَبَّ اِلَىَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَىَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اَحْبَبْتُهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِىْ يَمْشِىْ بِهَا (فَبِىْ يَسْمَعُ وَبِىْ يُبْصِرُ وَبِىْ يَبْطِشُ وَبِىْ يَمْشِىْ)[1] وَاِنْ سَاَلَنِىْ لَاُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِىْ لَاُعِيْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَىْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ

اور روایت ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص کہ ایذا دے میرے ولی کو پس بے شک خبردار کرتا ہوں میں اس کو ساتھ لڑائی کے اور نہیں نزدیکی حاصل کی طرف میری بندے میرے نے ساتھ کسی چیز کے کہ بہت محبوب ہو طرف میری اس چیز سے کہ فرض کیا میں نے اس پر اور ہمیشہ رہتا ہے بندہ میرا نزدیکی ڈھونڈتا طرف میری ساتھ نفلوں کے یہاں تک کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو اور جس وقت کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو پس ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی کہ سنتا ہے ساتھ اس کے اور ہوتا ہوں میں آنکھ اس کی کہ دیکھتا ہے ساتھ اس کے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے ساتھ اس کے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے ساتھ اُس کے (پس میرے ساتھ سنتا ہے اور میرے ساتھ دیکھتا ہے اور میرے ساتھ پکڑتا ہے اور میرے ساتھ چلتا ہے)

[1] خطوط کے اندر کے کلمات ایک دوسری حدیث کے ہیں۔ جو الگ سند سے مروی ہے۔

تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَہُ — اور اگر مانگتا ہے مجھ سے یہ بندہ البتہ دیتا ہوں میں اس کو اور

الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَہُ مَسَآءَتَہٗ وَلَا — اگر پناہ پکڑتا ہے ساتھ میرے البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو

بُدَّ لَہٗ مِنْہُ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ۔ — اور نہیں توقف کرتا اور تردد کرتا میں کسی چیز سے کہ کرنے والا

ہوں میں اس کو مانند تردد میرے کے قبض کرنے جان مومن کے سے ناخوش رکھتا ہے وہ موت کو اور حال یہ ہے

کہ میں ناخوش رکھتا ہوں ناخوشی اس کی کو اور چارہ نہیں اس کو مرگ سے۔ روایت کی یہ بخاری نے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ اس ذات پاک کا ہاتھ پاؤں بنانا یا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ کسی میں حلول کرنا تو درکنار ایسا گمان بھی کفر بلکہ شرک مطلق ہے۔ ہاں صوفیائے کرام کے نزدیک یہ فنا فی اللہ کی عبارت سے ہے۔ اور اس سے مقصود صفات انسانیہ کے فنا ہونے اور حجابات کے دور ہونے اور صفات خداوندی سے متصف ہونے کی رُو سے ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ — رنگ دیا ہے ہم کو اللہ نے اور کون ہے بہتر خدا سے

صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۞ — رنگ میں۔ اور ہم اسی کے لیے عبادت کرنے

(۲: ۱۳۸۔ پ۱۔ ع۱۶) — والے ہیں۔

بمصداق ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس مقام پر عبداللہ کی حقیقت اپنے رب کریم سے واحد ہو جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اپنے مکتوبات شریف[1] میں فرماتے ہیں کہ اس مقام پر انسان صفات بشریت سے

[1] دفتر سوم، مکتوب ۵۰ تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ صفحہ نمبر

مکمل کر صفات الٰہیہ سے متصف ہو جاتا ہے یعنی کہ انسان کا اختیار مطلق اُٹھ جاتا ہے اس کے ارادے فنا ہو جاتے ہیں اور مامور من اللہ ہو جاتا ہے۔ ولی کے لیے یہ مقام محفوظات سے ہے اور مرسلین کے لیے معصومیت سے۔ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مولیٰ کریم کی صفات ذاتیہ سے انسانی صفات ذاتیہ کو ایسا اتحاد ہے جس میں تمیز دشوار ہے۔

عزیزا! یہ ارشادات بندگان خدا تیری تسلی کے لیے مرقوم ہیں، ورنہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا اس بات کی دلیل ہے کہ مولیٰ کریم نے انسان کو اپنی صفت پر تخلیق کیا ہے۔ اور صِبْغَةَ اللّٰهِ اس پر شاہد ہے کہ انسان زکیٰ حاصل ہونے کے بعد خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اب علم جو ذات باری تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سے ایک صفت بالذات ہے، انسان کے علم کی تاریکی کو دور کر کے اپنے نور کا علم اس کے صدر میں نصب کر دیتے ہیں۔ تب اس علم سے جو علم حقیقی ہے، اور سب علوم اس اصل کے بمنزلہ ظل اور فرع کے ہیں، ایسا فعل ظہور میں آتا ہے۔

پہلے روح کے بیان میں گزر چکا ہے کہ ہر صفت ذاتیہ اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے بلکہ واصف کُل لا محدود ہے، اس لیے یہ علم کسی علم کی مانند نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے صفات اور طاقت کا مخلوق کی طرف نسبت کرنا سراسر جہالت ہے کیونکہ ان صفات کا فعل سب کا سب من اللہ ہے اور یہی صراط المستقیم ہے۔ لیکن یہ اصول نزول ہے کہ جب اصل فرع کی طرف فاعل ہو، اسی کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ سے مُرشد ہے، جیسا اوپر گزر چکا ہے۔ گو حقیقت فاعل حقیقی اور نسبت اصل اور حق کی طرف ہے لیکن حکم اس مَن کی طرف منسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو حضرات حدث اور قدم کا فرق

نہیں جانتے اور فرع سے اصل کو نہیں پہچانتے، صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید جو کلام الٰہی اور صفات ذاتیہ سے ہے، جب اس کا حکم قطعۂ قرطاس پر حرفوں اور لفظوں کی طرف منسوب ہوا، مخلوق کے قائل ہوئے۔

اس راقم کے وقت میں بھی حلف بالقرآن پر علمائے دین میں تقاضا ہوا، مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ عنوان[1] کے تحت میں کچھ تحریر کیا گیا ہے تاکہ اس سے مقصود حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے خاص علم سے بینا کرے جس طرح علم کو کلام کے لباس سے ملبوس کرنے کے لیے اسباب مخلوق کو ملازم کیا ہے، اسی طرح اپنے علم کو قلوب انسانیہ کی طرف ودیعت فرمانے کے لیے ملفوف بنایا ہے۔ اب ذرا عدل و انصاف کے ترازو میں نور ایمانی سے موازنہ کرنا بعید از ہدایت نہ ہوگا کہ مرسلین کا حال اور تعلق اس ذوالجلال والاکرام کے ساتھ کیا ہوگا؟ اس میں کلام نہیں کہ مرسلین کے حال سے مومن تو درکنار خاص اولیاء اللہ کو بھی کوئی علم نہیں ہے اور اس کی مثال دریا کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی سی ہے۔ عجب یہ ہے کہ باوجود نادانی کے برادران اسلام اس میں مناظرے بلکہ مجادلے کے لیے یہاں تک کمربستہ ہیں کہ الامان۔ کیا انہوں نے ارشاد مولیٰ کریم وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ کو مطالعہ نہیں کیا ہے؟ یا حبط اعمال سے بے خوف ہو رہے ہیں، یا انہوں نے خداوند کریم سے اس کی صریح سند پکڑ لی ہے؟

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۳۴۴ زیر عنوان حلف بالقرآن۔

اے بھائی! یہ معنی جو اوپر بیان ہو چکے ہیں یہ نکتہ عبداً پر بس ہیں اور یہی عقیدہ اس کے لیے کافی ہے۔ اگر اس سے بڑھ کر کوئی عزیز مرتبہ ہوتا تو لازم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر فائز ہوتے۔ اس لیے اس سے بڑھ کر کوئی مدارج ہی نہیں ہے۔ فہم من فہم۔ دیکھو فرمان مولیٰ کریم:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا	تحقیق وہ لوگ کہ بیعت کرتے ہیں تجھ سے سوائے
يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۚ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ	اس کے نہیں کہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ ہاتھ
اَيْدِيْهِمْ ۚ (۴۸: ۱۰۔ پ ۲۶۔ ع ۹)	اللہ کا ہے اوپر ہاتھ ان کے کے۔

کی حقیقت کیسی واضح ہے جس کو اپنے عبد کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عبارت فعل خداوندی کی طرف منسوب ہے جو غیر کے فعل کی نفی پر دلالت کرتی ہے جس طرح کہ عام مومنوں کے لیے فرمایا ہے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ یعنی نہیں قتل کیا تم نے ان کو ولیکن اللہ نے قتل کیا ہے ان کو۔

جواب:- اس میں کلام نہیں کہ یہ واقعی فعل مومنین کی نفی ہے کہ یہ تمہارا فعل نہیں بلکہ یہ توفیق من اللہ ہی ہے اور یہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ اس سے ورا ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک تو يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ یعنی یہ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں یعنی بظاہر اقرار و عہد جو تجھ سے کرتے ہیں دراصل وہ وعدہ اللہ سے ہے۔ گو دوسری صورت بھی اسی کے مترادف ہے۔ لیکن اس میں ایک بین فرق ہے جو اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ہاتھ پر اللہ جل شانہٗ کا ہاتھ ہے۔ چاہیے

تھا کہ اس جگہ بھی ایسا ہی ارشاد ہوتا کہ تیرا ہاتھ جو ان کے ہاتھ پر ہے' وہ تیرا نہیں ہے بلکہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن فرمان یہ ہے کہ یہ ہاتھ اللہ کا ہے ان کے ہاتھوں پر جس سے عبدہٗ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ ثابت ہو رہی ہے۔ اور وہ اس لیے کہ ذات باری تعالیٰ اعضاؤں سے پاک ہے' اور ایسا خیال کرنا شرک ظاہرہ ہے اور مطلق مکابرہ۔ مولیٰ کریم ایسے گمان سے محفوظ رکھیں۔ ہاں یہ نسبت خاص ہے ذات باری تعالیٰ کی اپنے عبد کے ساتھ، جس کی مختصر تشریح اوپر گزر چکی ہے +

عِلمُ الانسان وعلمُ الرحمٰن

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر علم کا اصل الاصول اور مرجع وہ ذات باری تعالیٰ ہے اور ہر قسم کے علم کا حصول من اللہ ہی ہے۔ فرمان علیم حکیم ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا
لَمْ یَعْلَمْ ۙ (۹۶: ۳-۵۔ پ۳۰۔ ۲۱)

پڑھ اور رب تیرا بہت کرم کرنے والا ہے جس نے
علم دیا ساتھ قلم کے، علم دیا انسان کو جو کچھ کہ
نہیں جانتا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا علم رب العالمین کی طرف سے عطائی ہے اور مولیٰ کریم کا علم ذاتی۔ مولیٰ کریم کا علم کُل اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۔ کی تعریف سے معروف ہے اور انسان کا علم جزوی اور محدود' اور یہ کسی حد تک درست ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ حصول من اللہ میں سے جو کچھ بھی انسان کو حاصل ہوا ہے وہ اس کے ضمیر میں ذاتیہ کا حکم

رکھتا ہے۔ کیا اس علم اور حصول میں ذات معلیٰ اور انسان کی مساوات ہے یا نہیں ؟ مثلاً کلام کی رُو سے قرآن المجید میں سے خالق موجودات اور رب العالمین نے کلام اور معانی کے لحاظ سے جس قدر علم انسان کو سمجھایا' بعد جاننے اور پہچاننے کے انسان اور رحمٰن کے علم میں کوئی فرق نہیں ہے ؟ لیکن یہ حقیقت کے خلاف اہل معانی کے برعکس بلکہ ظاہر مکابرہ اور سراسر شرک ہے۔ اور یہ دو وجہ پر ہے۔ ایک تو کسی حالت میں بھی پروردگار عالمیاں کے ساتھ کوئی مساوات رکھنا یا سمجھنا کسی غیر کے لیے روا نہیں ہے۔ بے مثل و بے مثال کے لیے مساوات و مماثلت کا ہونا ناممکن اور ممتنعات سے ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اس رب العلمین کا علم ہر چیز کے ساتھ معیت کی رُو سے ہے' اور انسان خواہ ولی ہو خواہ نبی یا مرسل' اور کل علوم ظاہری و باطنی سے من اللہ عالم اور عارف بھی ہو' اسرار الٰہیہ میں پوری دسترس رکھتا ہو' باوجود ان سب حقائق و معارف اور کمال انکشاف کے کسی چیز کا علم معیت کی رو سے روا نہیں ہو سکتا ہے۔ اور معیت کا ہونا انسان کے احاطہ سے باہر ہے اور ایسا گمان کرنا بھی جہالت اور ظاہرہ مکابرہ ہے' کیونکہ یہ اس ایزد متعال ذوالجلال والاکرام ہی کی شان ہے:

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ
مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا
یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا
كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۔
(۵۷: ۴۔ پ۲۷۔ ع۱۷)

جانتا ہے جو کچھ کہ داخل ہوتا ہے بیچ زمین کے
اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو کچھ کہ اترتا ہے
آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں اور وہ ساتھ
تمہارے ہے جہاں ہو تم۔ اور اللہ ساتھ اس چیز کے
کہ کرتے ہو تم دیکھنے والا ہے۔

ہیں تو نظروں میں میرے لاکن نظر آتے نہیں
مثل بُوئے گل ہیں پنہاں صاف دکھلاتے نہیں

گو یہ غیب ظاہر سے بڑھا ہوا ہے لیکن اس کا حکم ظاہر پر محال ہے۔ تاہم دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ اور معیت کی وجہ پر نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کا ارشاد اظہر من الشمس ہے اس لیے علم انسان اور علم رحمٰن میں مساوات کا اعتقاد رکھنا یا سمجھنا بلاشبہ شرک اور ظلم عظیم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کا علم کسی جہل کے دفع ہونے اور حجاب کے رفع ہونے کے سوا نہیں ہے۔ مولیٰ کریم ان عیوب سے پاک ہیں۔ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ۔ اور یہ اس لیے کہ انسان کا علم خارجی حصول سے ہے اور ذات پاک کا علم ذاتی۔ گو انسان کا علم بھی حصول کے بعد اس کی ذات میں ذاتیہ ہی کا حکم رکھتا ہے لیکن مولیٰ کریم کے ذاتیہ علم سے ہرگز کوئی نسبت نہیں ہو سکتی کیونکہ مطابق فرمان ایزد متعال ذوالجلال والاکرام اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا کی تعریف اس عزیز الحکیم ہی کے لیے ہے جس میں غیر کو ہرگز دخل نہیں ہے۔ اور یہ احاطہ علم بالذات سے ہے۔ کیونکہ اگر احاطہ سوائے ذات کے سمجھا جائے تو اَحَاطَ کی نسبت ذات سے برطرف ہو جاتی ہے۔ اور یہ محال ہے ــــــــ اور یہ احاطہ کسی غیر کی مانند نہیں ہے۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ہی کے مترادف ہے۔ گو مثالیں یہاں بیگانگی ہیں اور اس لم یزل ولایزال کے لیے کوئی مثال درست نہیں آسکتی، تاہم فہم کے لیے اس سے چارہ نہیں۔ اس کو یوں قیاس کرنا چاہیے کہ ہر چیز کا اصل رُوح ہے اور ظہور

کے اسباب کے لیے جسد لازمی ہے۔ ہر جسد کی نشوونما، بقا اور فنا رُوح کے تصرف سے ہے اور روح کی آمد و رفت، نزول و عروج اس رب العٰلمین کے حکم کے سوا روا نہیں ہے جب تمام مخلوقات عدم کی تاریکی میں پنہاں اور بے نام و نشاں تھی، اس عالم الغیب کی ذات معلّیٰ میں متحقق تھی۔ ظہور کے لیے مرید ہونے کی صورت میں اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ کا ارشاد ہوا۔ لَہٗ کی ضمیر متحقق بالذات ہونے کی دلیل ہے اور کُنْ امر کے مترادف اور فَیَکُوْنُ ظہور عمل پر روشن ہے۔ تو اوّل بحکم خدا عالم امر کے میدان میں رُوحانیت کا ظہور ہوا وہاں سے وجود عنصری کا ظہور میدان دنیا میں ہویدا ہوا۔ ان سب منازل و مدارج اور تغیّر و تبدّل میں اُس واجب الوجود کا علم یکساں ہے۔ خالق کائنات، علّتِ ممکنات جس نے عدم سے ہر چیز کو ظہور کا لباس عطا فرمایا اور اس کے معدوم کر دینے پر قادر ہے۔ ہر چیز کے اصل اور فرع ظاہر اور باطن، ہر حال اور تمام افعال میں اُس کا علم ذاتی ہے۔ مخلوق میں سے کسی کے لیے ایسا علم تو درکنار اس قسم کا خیال کرنا بھی خطا ہے۔ کیونکہ انسان کا علم خارجی صورت میں ماخوذ فی النفس کے سوا نہیں ہے۔ جس قدر اسفل عالموں سے اعلیٰ کی طرف عُرُوج ہونے کی صورت میں حجابات کا کشف ہوتا ہے اس سے معلومات محسُوسات کے میدان میں نزول کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہاں عالم معروفات کے میدان میں سے جو محض فضل الٰہی سے وابستہ ہے کا حصُول بشر کے لیے انتہائی درجہ ہے۔ اور اس سے آگے یعنی عالم امر سے ورا محض ذات قدس کا پر تو انسان کے لیے انسان کے ضمیر میں اس کے اختیار سے باہر ہے۔ محض تصرّفِ حق اس کے محو کر دینے یا ثابت رکھنے پر قادر جس میں مطلق اس کا اختیار نہیں رہتا۔ یا صحیح معنوں میں انسان اور اس کا اصل بالکل مفقود

ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی فعل کا ظہور انسان یا انسان کی طرف سے سمجھنا خطا ہوتا ہے۔

ان سب علوم (جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، مثلاً علم تقدیر، علم قضاو قدر، علم غیب، اور علم الانسان وعلم الرحمٰن میں فرق، جن کا ظاہر آیات بینات پر دال ہے) کی رویت محض بطن انسانیہ پر منحصر ہے۔ جس کو عالم برزخ کہنا ہی بجا و درست ہے۔ ہر علم اور اس کے ایقان کا اوّل يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا آخر رویت پر عیاں ہوتا ہے۔ اور اس کا حصول فی الدنیا انکشاف پر اور فی الآخرہ حقیقت پر۔ گو بعض اعلیٰ ہستیوں کی روشن ضمیری کے باعث یہ برزخ میدان دنیا ہی میں اُٹھ جاتا ہے تاہم انکشاف حقیقت کا انحصار میدان برزخ کے لیے کماحقہٗ متحقق ہے۔

ان تمام علوم کا حصول فی الدنیا اور عالم برزخ میں استمداد کی وجہ پر زندہ کو موتٰی سے اور موتٰی کو زندہ سے ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ہر دو عالموں میں آپس کے تعلقات کی وجہ پر حصول کا اجرا اور مفاد صحیح اور جائز ہے۔ دُنیوی تعلق کے انقطاع کے بعد حال کے تغیر و تبدّل اور مفاد اعمال کے رُو سے جس قدر انسان کے برزخ کا تعین اس کے ضمیر میں مؤثر ہوتا ہے، ہر نیک و بد، کفر ہو یا اسلام جو اس کے برزخ میں قرار پا چکا ہے، یا صحیح معنوں میں جس رنگ میں رنگا جا چکا ہے، اس کی ترقی یوم القیٰمۃ تک ہوتی رہتی ہے جس کی حقیقت اس دن کھل جائے گی +

باب چہارم

یوم القیامۃ

اب عالم برزخ کا زمانہ گزر چکا۔ بحکم خدا صور پھونکا گیا۔ جمیع انسان قبروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ احکم الحاکمین کے عدل کا ترازو قائم کیا گیا۔ ذرہ بھر نیکی اور بُرائی خیر و شر کا عمل ہویدا ہو گیا۔ تغیر حال جو اعمال کی وجہ سے مخفی تھا اس کی حقیقت عیاں ہو گئی۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ کا راز کھل گیا۔ اعمال نامہ کی کتاب ہر ایک کے گلے میں لٹکا

دی گئی۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ کا فرمان صادر ہوچکا۔ وجود انسان یعنی ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، بلکہ ہر ایک عضو جو کہ حیات دنیا میں اس کے حکم کا مسخر تھا، اس کے اشارے کا تابع تھا، برعکس ہوگیا۔ يَوْمٌ عَسِيْرٌ کی کیفیت نے انسانوں کو متوالا کردیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ ایک کو دوسرے کی خبر تک نہ رہی۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کا عمل ظاہر ہوچکا۔ تمام تعلقات منقطع ہوگئے، کوئی کسی کا پرسان حال نہ رہا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر بھاگ رہی ہے۔ نفسی نفسی کی صدائیں اُٹھ رہی ہیں۔ عوام تو درکنار نبی اور مرسلین بھی سب کے سب نفسی نفسی ہی پکار رہے ہیں۔ ہاں صرف حضرت محمد الرسول صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اُمتی اُمتی کی دعا فرما رہے ہیں۔

دراصل ہر ایک شخص مطابق كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ اپنے حال میں بے اختیار مستغرق ہوگا۔ اہل دنیا دنیا کے حجاب میں، کافر کفر کے پردہ میں، منافق نفاق کے جال میں، علیٰ ہٰذا القیاس ہر ایک کا حجاب اس کے لیے بلائے جان ہوگا۔ کیونکہ یہ سب علائق باوجود منقطع ہونے کے تاثیر اور حجاب کے سوا کوئی اصل نہ رکھیں گے۔ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ کے مطابق انسان پر حقیقت اشیاء منکشف ہوجائے گی۔ اصل مقصود کی طرف جانے کے لیے تڑپے گا لیکن حجابات سدِ راہ ہوجائیں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ	ہرگز نہیں۔ یقیناً وہ اپنے پروردگار سے اس دن
لَّمَحْجُوْبُوْنَ ٥ (۸۳: ۱۵۔ پ۳۰)	البتہ حجاب میں ہوں گے۔

آج مولیٰ کریم يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ وغیرہا ارشادات سے انکی افسوسناک حالت بیان فرماتے ہیں کہ کاش! یہ جانتے۔ لیکن اس دن حق کو ظاہر کرنے کے لیے حقیقت کے انکشاف

کے لیے يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کے مؤاخذہ کو عیاں کرنے کے واسطے بنی نوع انسان کو سجدہ کے لیے بلایا جائے گا:

کشفِ ساق

ارشاد مولیٰ کریم ہے:

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ	جس دن کہ کھولا جائے گا پنڈلی سے اور بلائے
اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ٥	جائیں گے طرف سجدے کی۔ پس نہ کرسکیں گے
خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ	نیچے ہوں گی آنکھیں اُن کی ڈھانکتی ہوگی اُن کو
ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى	ذلت اور تحقیق تھے بلائے جاتے طرف سجدے
السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ٥ (۶۸: ۴۲-۴۳)	کے اور وہ سالم تھے۔ (پ۲۹۔ ع۴)

مفسرین اس کی تفسیر میں مجبور رہی ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ انسانی علم کی وسعت عالم معروفات سے آگے عبور نہیں کرسکتی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں:

"ایک گروہ نے نادانی سے بدوں سمجھے بوجھے اس کام کی حقیقت کو گمراہی کے بھنور میں ڈالا یعنی تشبیہ ظاہری میں پڑ گئے اور ان حقیقتوں کو اعضا اور جوارح پر قیاس کرکے حق تعالیٰ کی ذات پاک کی صورت اور شکل کے معتقد ہوئے، یعنی حق تعالیٰ کے جسم ہونے کے قائل ہوئے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ یعنی برتر ہے اللہ تعالیٰ اس چیز سے جو کہتے ہیں ظالم بہت بڑی اور برتری کرکے۔ اور ایک جماعت نے تنزیہ کے قاعدے کو ایسا گہہ کے پکڑا کہ ان حقیقتوں کے ثابت کرنے کو اس قاعدے

کے منافی سمجھ کے ایسی تاویل کی ہے جو مقصد سے بہت دور ہے۔ بلکہ نفی اور انکار کا حکم رکھتی ہے۔ تو گویا حقیقت میں ان حقائق کی دریافت اور سمجھ میں تشبیہ والوں کے شریک ہوئے۔ فرق ان دونوں میں اتنا ہوا کہ پہلے فرقے نے ثابت کیا ہے، اور انہوں نے نفی کی ہے۔ تو ان کو بھی سوائے ان معنوں کے جو ان کے ظاہر لفظوں میں پائے جاتے ہیں، دوسرا مطلب کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اور اہل سنت اور جماعت کے محقق جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا مقصد کی حقیقت کو پہنچے اور کہا کہ ہر چیز کی ذات کو دریافت کرنے کے بعد اس کے اعضا کا حال معلوم ہوتا ہے"۔

آپ کا یہ فرمان بالکل اصح ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک مولیٰ کریم کا ید و وجہ یا آنکھ اور ساق وشلما یعنی کل اعضا جسم کی مثل سمجھنا کم فہمی بلکہ سراسر خطا ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس کا بالکل انکار کیا ہے، اور یہ بھی خطا ہے۔ اور یہ بالکل بجا و درست ہے۔ کیونکہ ان کی مراد اس میں ذات اور حقائق کے برزخ ہی کی ہے۔ اور اس کی توضیح ذات اور صفات میں عرف کے سوا نہیں ہے۔ کئی وجہ پر اوپر گزر چکا ہے کہ صفات بالذات محض تابع ذات ہیں اور صفات بالفعل تابع صفات بالذات۔ صفات بالفعل کا ظہور الی الخلق ہوا کرتا ہے اور صفات بالذات محض ذات سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس جگہ اس کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ کلام مجید کا اُصُول نزول ہمارے حال کی وجہ پر ہے اور شانِ نزول ہمارے اعمال کی وجہ پر۔ حال بمنزلہ اصول کے ہے اور اعمال بمنزلہ فرع کے۔ گو کئی ایک وجہ سے اعمال کا اثر تغیر حال کا موجب ہوا کرتا ہے لیکن اعمال کا مرید ہونا حال کے سوا نہیں ہوتا ہے وہ ذات پاک کسی اثرات کی ماخذ نہیں اور نہ ہی یہ اس کی ذات پاک کے شایاں ہے۔ لیکن انسان سوائے حال کے کما حقہٗ کسی فہمید کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے محض حقائق کو منکشف

کرنے کے لیے استعارے کے طور پر اعضا کو ہمارے حال کے مطابق بیان میں لائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عطا و سخا کے لیے بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ (پ ۶) دید کو بصارت سے، سماعت کو سمع سے، مشاہدہ اور لقا کو وجہ سے نسبت دی ہے۔ ورنہ ذات پاک کے لیے کسی اعضا سے نسبت ظاہرہ نادانی اور جہالت ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ کسی صورت یا کسی وجہ پر اللہ جل وعلیٰ کے اعضا قیاس کرنا خواہ وہ مخلوق کے اعضا سے کوئی نسبت نہ رکھنے کا گمان ہی کیوں نہ ہو، بمصداق:

جو کچھ کہ قیاس اور گماں وہم میں آئے!

اس سے بھی ورا بلکہ ورا سے بھی ورا ہے

سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کے مطابق آیات اللہ میں غور و تدبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور وہ یوں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے نفوس میں سب طاقتیں رُوح ہی سے ہیں۔ اور قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰي شَاكِلَتِهٖ کے مصداق ہر اعضا میں رُوح ہی کا تصرف ہے آنکھ جو دیکھنے کا آلہ ہے اس میں بصارت کا کام دے رہی ہے، زبان میں بولنے کا، کان میں سننے کا، ہاتھ میں پکڑنے اور پاؤں میں چلنے کا، علیٰ ہذا القیاس ہر ایک سے اپنی شکل و صورت کے مطابق فعل عیاں ہے۔ اور ان سب میں تصرف رُوح ہی سے ہے سوائے جوارح کے بگڑ جانے کی صورت میں، یا منتقل ہو جانے کے بعد رُوحی طاقت جو بمنزلہ اصل کے ہے فرع سے جدا ہو جانے کی صورت میں اپنے کسی تصرف اور طاقت کے منافی ہونے کی مقتضی نہیں ہو سکتی۔ تو اب اس سے یہ فائدہ حاصل کرنا بعید از مقصود نہ ہوگا کہ وہ ذاتِ معلیٰ ان

سب اسباب سے منزّہ اور مبّرا ہے۔ تو پھر اعضا کی مناسبت جو محض ہمارے حال کی وجہ پر بیان کی گئی ہے، اس ذات معلّیٰ کی طرف کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس لیے ساق اور اس سے پردہ کا اُٹھایا جانا ہمارے ہی حال سے عبارت ہے۔ کیونکہ ید و عین اور وجہ ان سب کی نسبت مولیٰ کریم نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمائی ہے لیکن ساق کو اپنی ذات کی طرف نسبت نہیں دی۔ اس لیے اس کو مخلوق کی طرف جس میں بنی نوع انسان مختص ہیں، نسبت ہونی چاہیے۔ اور سوائے اس کے نادانی ہے۔ جس طرح ہر اعضا کے بیان سے ہمارے حال کی وجہ پر بیان فرمایا ہے، اسی طرح ساق بمنزلہ اسفل مخلوق سے نسبت کو ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ اس ذات پاک کا کسی حجاب سے محجوب ہونا روا نہیں ہے، هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس واجب الوجود کے لیے عیاں ہے، یہ حجابات اور انکشافات مخلوق ہی کے لیے ہیں نہ کہ ذات باری تعالیٰ کے لیے۔ اور تمام مخلوق میں سے بنی نوع انسان اس محل میں اس لیے مخصوص ہیں کہ ہر قُرب اور بُعد کا مقام اسی کا حصّہ ہے۔ اس واسطے اس دن کافر، مومن، منافق، فاسق سب سے یکساں حجاب دُور کیے جائیں گے اور تجلی باری تعالیٰ عیاں ہو جائے گی جب حال ہر ایک کی حالت مطابق فرمان يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ (جس دن آزمائی جائیں گی چھپی باتیں پس نہ ہو گی واسطے اس کے قوت اور نہ مدد دینے والا۔ ۸۶: ۹-۱۰۔ پ۳۰ - ۱۱) ظاہر ہو جائے گی۔ ساجدین کے لیے راحت ہو گی اور منکرین جنہوں نے دنیا میں اعراض کر رکھا تھا اس نعمت سے محروم رہیں گے، یعنی سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اُن کی پشتیں تختہ ہو جائیں گی۔ ہر ایک کو اسی حجاب میں جس میں وہ محجوب تھا چھوڑ دیا جائے گا۔ تاکہ اس مشاہدہ اور لقائے الٰہی سے

جو اس کو دکھایا جائے گا حسرت کے میدان میں زیادہ عذاب کا موجب ہو اور مطابق مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ابدی اعمیّت میں گرفتار ہو۔ مومن صاحب شاہدِ محویت میں مستغرق اور شاد ہوں گے۔ کما قال اللّٰہ تعالیٰ:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ (پ۲۹۔ ع۱۔ سورۂ قیامت)

کتنے منہ اس دن تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کی دیکھنے والے ہیں۔ اور کتنے منہ اس دن بُرے ہیں گمان کرتے ہیں یہ کہ کی جاوے گی ان سے کمر توڑنے والی یعنی معاملت

گو حالات از حد مختلف ہوں گے اور یہ اختلاف ہر ایک کے حال کی رویت سے ہو گا، تاہم ان آیات سے ظاہر ہے کہ محو دیدار ہشاش بشاش اور راحت سے مسرور ہوں گے اور دوسرے بَاسِرَةٌ کے مطابق اداس اور رنجور ہوں گے۔

مومن کو بفضلہٖ تعالیٰ دنیا میں بھی لقا، اور مشاہدہ کے ساتھ حیات ابدی سے حصّہ ہوتا ہے، اور عالم برزخ میں بھی اسی سے استغراق اور یوم القیٰمۃ میں خصوصیت کے ساتھ رحمتِ الٰہی اس کی یاوری کرے گی۔ اور برعکس اس کے کافر، مشرک، فاسق، منافق میدانِ دُنیا میں اعمیٰ اور عالم برزخ میں بھی ظلمات کے گڑھے میں مقید اور یوم القیٰمۃ میں حسرت کے دریا میں غرق اور عذاب ابدی میں گرفتار۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الدنیا والآخرہ مومن اور کافر کا حال کسی صورت میں مساوی نہیں ہو سکتا۔ لَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ تو اس صورت حال کے مطابق مومن کے لیے خصوصاً اولیائے کرام کے لیے کوئی حجاب نہیں ہے چنانچہ

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوام تجلی حاصل ہے"۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ کفار کے لیے مخصوص ہے تاکہ انکشافِ حقائق ان کے لیے موجب عذاب ہو۔ اور وہ اس لیے کہ انسان کے لیے سوائے اس کے عذاب کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ کیونکہ مولیٰ کریم کا معاملہ انسان کے ساتھ محبت کا ہے، اور محبت میں حجاب اور فرقت سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے، اور دیدار اور مشاہدہ اور قرب سے بڑھ کر کوئی راحت نہیں ہے۔ روح من امر ربی ہے یعنی امر الٰہی ہے جس سے مولیٰ کریم کو خاص تعلق ہے یعنی آمر کو امر سے ایسا تعلق اور اتحاد ہے جس کی تیز محال ہے۔ اور یہ ایسا تعلق ہے جیسے مرکز کو دائرہ سے، اصل کو فرع سے، معنوں کو عبارت سے، رُوح کو وجود سے اور مرید کو ارادہ سے۔ انسان خواہ کافر ہو یا مومن، دشمن ہو یا دوست، مرحوم ہو یا مقہور، ربّ العٰلمین کا تعلق سب سے یکساں ہے ؎

یار نزدیک تر از من بہ من است! ویں عجب تر کہ من از وے دورم

کوئی اس کے فضل و کرم سے مقرب ہے، اور کوئی اس کے عدل و انصاف کے رُو سے بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ کی وجہ پر دور۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ کو رُوح اللہ اور حضرت محمد الرسول اللہ رحمۃ للعالمین کو محبوبیت سے مشرف فرمایا ہے، صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔ گویا ہر ایک کو جیسی نسبت ذات معلیٰ سے ہے ویسے ہی القاب سے نسبت دی ہے۔ جیسے فرمایا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

جاننا چاہیے کہ یہ نسبت رحمی ہو یا غضبی ہمارے حال کے رُو سے ہے۔ بُعد و قُرب

ہمارے اعمال سے ہے، اور ان معنوں کی عبارت ہمارے حجابات کے حائل ہونے اور دور ہو کر حقائق کے منکشف ہونے کی رُو سے ہے، نہ کہ مولا کریم کے حجاب اور کشف کی حقیقت، جو ذات پاک کے لیے مطلقاً روا نہیں ہے

اب اس سے یہ مفاد اور مقصود حاصل کرنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ کل کائنات ایک وجود کی مانند ہے، جس میں انسان خاص ہے اور انبیائے کرام خاص الخاص۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں فرمایا:

وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (پ۱۶۔ ۱۱) اور تاکہ پرورش پاؤ تم سامنے آنکھ میری کے

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا:

فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (پ۲۷۔ ۴۴) پس تحقیق تو بیچ آنکھوں ہماری کے ہے۔

جو مقربی اور محبوبی پر دال ہیں۔ اور بعض کو دُوری اور محجُوبی سے نسبت دے رکھی ہے۔ تو عزیز الحکیم نے وجود موجودات میں سے اسفل سافلین ہستیوں کو ساق سے تشبیہ دی ہے۔ اس مالک الملک کا ارشاد مبارک لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ہمیں صورت اسی کے مترادف ہے۔ مطابق حدیث شریف کہ ساق موقف ہیں اور قدم دوزخ میں ہوگا۔ اور مالک حقیقی کا اس کے لیے فرمان ہوگا کہ کیا تو بھر گئی، کہے گی میرے رب ابھی بھر چکی۔ مطابق فرمان ایزد متعال: وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی کے کوئی صورت خواہ قدرت کی ساق ہی کیوں نہ ہو، مذموم ہے اور ایسا اعتقاد سراسر جہالت اور نادانی سے ہے، جو اس ذات پاک کے لائق نہیں۔

تو جب یہ کشف ساق جس کی نسبت اسفل مخلوق کی طرف منسوب کی گئی ہے، ہو چکے گی

توجن لوگوں نے دنیا میں رُجوع اِلی اللہ نہ کیا اور نہ ہی حکم کے مطابق معبُودِ حق کی عبادت اور سجدہ کر سکے ان کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہوگی۔ دل میں رنج وقلق کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ عبادت اور سجدہ کی حقیقت عیاں ہو جائے گی، اس رحمت وشفقت اور عنایات وانعامات سے جو سجدہ اور عبادت وفرماں برداری کی زحمت اور مشقت میں پنہاں تھی آگاہی ہو جائے گی۔ تب مارے ندامت کے سرنگوں ہونے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا

نامۂ اعمال

دیا جائے گا۔ فرمانِ مولیٰ کریم ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ — پس جو کوئی دیا گیا عملنامہ اپنا بیچ داہنے ہاتھ

فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۚ اِنِّیْ — اپنے کے پس کہے گا لو پڑھو عملنامہ میرا۔ بے شک میں جانتا

ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۚ فَهُوَ — تھا یہ کہ میں ملوں گا حساب اپنے سے پس وہ زندگانی

فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۙ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ — خوشی میں ہے۔ بیچ بہشت بلند کے۔ کہ میوے

قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ۝ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا — اس کے نزدیک ہیں۔ کھاؤ اور پیو ستا بدلے اس

هَنِیْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ — کے جو کر چکے ہو تم بیچ دنوں گزرے ہوؤں کے۔

الْخَالِیَةِ ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ — اور جو کوئی دیا گیا عمل نامہ اپنا بیچ بائیں ہاتھ اپنے

بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ — کے پس کہے گا اے کاش کہ میں نہ دیا گیا ہوتا

كِتٰبِیَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۝ — عمل نامہ اپنا اور نہ جانتا میں کہ کیا ہے حساب میرا۔

یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۝ مَآ اَغْنٰی — اے کاش کہ یہ موت ہوتی تمام کرنے والی۔ نہ کفایت

عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۚ — کیا مجھ سے مال میرے نے۔ جاتی رہی مجھ سے سلطنت

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۙ — میری۔ پکڑو اس کو پس طوق پہناؤ اس کو پھر دوزخ

ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ — میں لے جاؤ اس کو۔ پھر بیچ زنجیر کے کہ پیمائش اس

ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ — کی ستر ہاتھ ہے پس داخل کرو اس کو۔ تحقیق وہ تھا نہ

بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ۙ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی — ایمان لاتا ساتھ اللہ کے جو بڑا ہے۔ اور نہ رغبت دلاتا

طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ — تھا اوپر کھانے فقیر کے۔ پس نہیں واسطے اس کے آج

هٰهُنَا حَمِیْمٌ ۙ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ۙ — اس جگہ کوئی دوست۔ اور نہ کھانا مگر دھوون دوزخیوں

لَّا یَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝ (پ ۲۹ - ۵) — کے سے نہیں کھائیں گے اس کو مگر گنہ گار۔

سعیدوں کو دائیں ہاتھ میں اور بدبختوں کو بائیں ہاتھ میں۔ سعید خدا کے فضل سے خوش اور بدبخت موافق آیات اپنے حال میں مستغرق۔ اور ہر ایک کو حکم ہوگا کہ:

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۚ كَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ — پڑھ کتاب اپنی۔ کفایت ہے جان تیری آج

عَلَیْكَ حَسِیْبًا ۝ (پ ۱۵ - ۲۴) — اوپر تیرے حساب لینے والی۔

ہر اُمّی اور اَن پڑھ بھی اپنے اعمال کا مطالعہ کرے گا۔ طوعاً اور کرہاً و مجبوراً معائنہ کرنا ہی پڑے گا۔ اور اس کے سوا کسی کو چارہ نہ ہوگا۔ کئی انواع واقسام پر حساب شروع ہو جائے گا۔ عدل و انصاف کا ترازو کھڑا کیا جائے گا۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۔ یعنی جس نے ذرہ بھر نیکی کمائی ہوگی وہ بھی پا لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بُرائی کی ہوگی وہ بھی دیکھ لے گا۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ	اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جاوے گی
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ	تو تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں لکھا
يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ	ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے ہائے
صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا	وائے یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی
وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ	ہے نہ بڑی کو کوئی بات بھی نہیں مگر اس میں لکھ رکھا
لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝ (پ ۱۵ - ع ۱۸)	ہے اور جو عمل کیے گئے ہوں گے سب کو حاضر
(۱۸ : ۴۹)	پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

صرف لکھا ہوا نہیں ہوگا بلکہ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا کے مطابق مکان و زمان اور فعل و حرکات کا نقشہ کھنچا ہوا ہوگا۔

دوسری وجہ حساب جوارح کے ساتھ ہوگی :

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ	یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو
سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ	ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے ان کے
بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (پ ۲۴ - ع ۱۶)	برخلاف ان کے تمام اعمال کی شہادت دیں گے۔

تیسری وجہ نیت کے خلوص پر ہوگی۔ جس سے نہ تو کراماً کاتبین کو خبر ہوگی، نہ کسی انسان کو نہ جن کو۔ اس سے علم اس علیمٌ بذاتِ الصُّدُور ہی کو ہوگا۔ اور ان معنوں کی عبارت دل کے ثواب اور گناہ کے رو سے ہوگی۔ گناہ ہو یا ثواب، نیکی ہو یا بُرائی، ریا ہو یا اخلاص، نفاق ہو یا ایمان، کفر ہو یا اسلام، اس کا حساب عنداللہ ہی ہوگا۔ بمصداق ؎

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

بعض انسان اس حساب و کتاب سے مبرا ہی ہوں گے۔ اور وہ اس لیے کہ ایسے شخصوں کی سعی (جو دو نوع پر منقسم ہے، باطناً ہمت کی رُو سے اور ظاہراً طاقت کی وجہ پر) مطابق فرمان ایزد متعال اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سب کی سب اسی کے حصول پر خرچ ہوگئی، اور وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کی سخت ترین خطا کی وجہ سے خوش رہے، اور نشانات بینات کی طرف سے منکر اور لقائے الٰہی سے غافل رہے۔ اس لیے بوجہ یکسوئی فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا کے مطابق حساب سے مبرا رہے۔

ایسے ہی جن اشخاص کی سعی ہمہ تن آخرت یا رضائے مولیٰ کریم کی طرف معروف رہی، ان کے لیے بھی وزن قائم نہ ہوگا۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو خطاب فرمایا کہ مجھ سے میرے پروردگار نے وعدہ فرمایا کہ تیری اُمت سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل کروں گا۔ میں نے عرض کی کہ یارب کریم! اور بڑھائیے۔ فرمایا کہ ستر دفعہ ستر ہزار۔ عرض کیا کہ اور، فرمایا کہ ستر ہزار مرتبہ ستر ہزار یعنی چار ارب نوے کروڑ۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اَلَّذِيْنَ لَا يَتَدَاوَوْنَ وَلَا يَتَدَاعَوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (یعنی جو لوگ تنگی اور بیماری کے وقت نہ دعا کرتے ہیں نہ دوا بلکہ صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں) اور بھی کئی قسم کے لوگ آپ نے

بیان فرمائے جو سب صاحبِ تسلیم و رضا ہیں۔ مثلاً شاکرین، صابرین، ذاکرین، خاشعین خائفین وغیرہم۔

اس زمانہ حساب میں کوئی کسی کی یاوری نہ کرے گا اور نہ ہی کوئی کسی کا بوجھ اُٹھا سکے گا۔ بمصداق لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ اور:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ	اس دن بھاگے گا آدمی بھائی اپنے سے اور
وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝	ماں اپنی سے اور باپ اپنے سے، اور جورو اپنی
(پ۳۰ - ر۵ - ۸۰ : ۳۴-۳۵-۳۶)	سے اور بیٹوں اپنے سے۔

اور نہ ہی کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ اور وہ اس لیے کہ یہ میدان عدل و انصاف ہر ایک شخص کے حال کے موافق موازنہ کرنے والا ہو گا۔ اور یہ روا نہیں ہے کہ ایک کے گناہ دوسرا شخص اُٹھالے۔ اور یہ محال ہے۔ کیونکہ یہ بوجھ کسی مادّی چیز کے بوجھ کی مانند نہیں ہے جو ایک کے سر سے دوسرا کچھ حصہ لے کر ہلکا کر دے۔ یہ اس عزیز الحکیم کی حکمت کے اندازہ پر بوجھ کی کیفیت ہے۔ بعض اس قدر دبے پڑے ہوں گے کہ پہاڑ کے نیچے پس جانے سے بھی زیادہ سخت حال رکھنے والے ہوں گے۔ لیکن یہ بار مثل حجر کے ہرگز نہیں ہو گا۔ بلکہ گناہ کا دباؤ حجاب کی صورت میں دل پر اور اس کے اثرات بدن پر ہوں گے۔

ہاں جن لوگوں کے اعمال نیک و بد خلط ہوں گے اور مومن بھی ہوں گے، ان کے اعمال مثل ترازو کے موازنہ کیے جائیں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ	اور تولنا اس دن حق ہے۔ پس جو شخص کہ
ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	بھاری ہوئی تول اس کی پس یہ لوگ وہی
الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ	ہیں فلاح پانے والے۔ اور جو کوئی کہ ہلکی ہوئی
فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ	تول اُس کی پس یہ لوگ ہیں جنہوں نے خسارہ
بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝	دیا جانوں اپنی کو بسبب اس کے کرتے ساتھ
(پ۸ - ر۸ - س ۷ : ۸-۹)	نشانیوں ہماری کے ظلم کرتے۔

جن کے اعمال صالح وزن میں بھاری ہوں گے وہ من مانی عیش میں ہوں گے اور جن کے ہلکے ہوں گے وہ مصیبت میں گرفتار ہوں گے۔

جب حساب کا کام تمام ہو جائے گا تو حسب تعلق تمام لوگ گروہ گروہ ہو جائیں گے جس جس کے ساتھ دنیا میں مطابقت اور مناسبت رکھتے ہوں گے، کشاں کشاں خود بخود جمع ہو جائیں گے۔ ان میں کا ہر ایک سردار مثل پیشوا و امام ہو گا:

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ	جس دن بلائیں گے ہم ہر ایک انسان کو اس کے
(پ۱۵ - ر۸)	پیشوا کے ساتھ۔

فرعون اپنی آل یعنی اپنے متبعین کا رہنما ہو گا، نمرود اپنے لشکر کا سردار ہو گا، اور ابولہب اپنے ہم خیالوں کا پیشوا۔ علیٰ ہٰذا القیاس تمام نبی اور رسول اپنی اپنی اُمت کے رہنما ہوں گے، اور سب مرسلین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع ہوں گے، اور آپ

لواء الحمد

کو تھامے تمام انبیاء و مرسلین کے لیے سردار ہوں گے۔ ہر ایک نبی اور رسول اپنے اپنے

مدارج و مقامات سے مزیّن ہونے کے باوجود سیّد المرسلین، رحمۃ للعالمین، آخر آمد بود فخر الاولین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت محمدیؐ یعنی محبوبیت کی طرف آرزو اور التجا کرنے والے ہوں گے اور مثل ستاروں کے ماہتاب کے ظلّ میں محبوب صرف کے نور کے سایہ میں محو ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کل انبیا نفسی نفسی کہیں گے اور چونکہ حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبودیت کے مقام میں محبوبیت کے لباس سے مزیّن ہوں گے جس سے بڑھ کر کوئی مدارج نہیں ہے، اس لیے انتہائی باب اور حصول کے بعد آپ سے اُمتی اُمتی کی صدا ہی ظہور پذیر ہو گی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ہر ایک مرسل کو مولیٰ کریم نے کسی نہ کسی صفت سے خاص کیا ہے اور جو کچھ من اللہ اُن کو خاصہ عطا ہوا اسی نسبت سے معروف ہوئے۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ رُوح اللہ علیہم السلام۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ	اے نبی! بیشک بھیجا ہے ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	دینے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا طرف اللہ کی
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (پ ۲۲۔ ع ۳)	ساتھ حکم اس کے کے اور سورج روشن کرنے والا۔

اور ساتھ ہی مومنین کو بشارت دینے کے لیے اور منکرین کو مطلع کرنے کے لیے، سوءِ اعتقادی کو حق کے دریا میں غرق کرنے کے واسطے کیا ہی صاف اور بیّن فیصلہ فرما دیا ہے کہ:

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ	اور خوشخبری دو ایمان والوں کو کہ یقیناً ان کے لیے

اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ (پ ۲۲۔ ع ۳)	اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔

دونوں آیات کے درمیان اور کوئی آیت نہیں جس سے بے تعلق مضمون اور معانی کا احتمال ہو سکے بلکہ دونوں آیات کا ایک دوسری سے الحاق ہے۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے حبیب! ان صفات جو میں نے تجھے مزیّن فرما کر مرسل کیا ہے یہ مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔ اور:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا	وہی ذات پاک ہے جس نے بھیجا بیچ اَن پڑھوں کے
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	پیغمبر انہی میں سے۔ پڑھتا ہے اوپر ان کے آیتیں اس
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ	کی اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب
(پ ۲۸۔ ع ۱۱۔ س جمعہ)	اور حکمت۔

کا نزول اسی کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ صفات محض اس رحمۃ للعالمین کا صرف خاصہ ہی نہیں بلکہ ان خصوصیات کا مفاد اور مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا مومنین کے لیے بھی ہے، تاکہ اس نسبت سے جو ربّ العالمین نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائی ہے، فائدہ حاصل کریں۔ نعمت عظمیٰ سے اور بے بہا دولت سے مالا مال ہوں۔

اے عزیز! جاننا چاہیے کہ ہر ایک انسان کا حال فی الدنیا ہی آخرت میں مکاشفہ ہو گا اور ہر ایک مناسبت کی وجہ سے بلا اختیار اپنی نسبت سے منسوب ہو گا۔ تو آج میدان دنیا میں جونسی نسبت سے اعتقاد رکھنے والا ہو گا، اُسی سے فیوض اور تعلق اور حصول کے اجرا کی امید ہو گی۔ کیونکہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی وجہ پر قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز سے اعتقاد نہ ہو اس سے حصول

محال ہے ـــــــ تو حقیقت منکشف ہونے کے بعد مطابق:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ	اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا ظالم اپنے دونوں
يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا	ہاتھوں اپنے کہے گا اے کاش کہ پکڑتا میں ساتھ
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا	رسول کے راہ۔ اے خرابی ہے مجھ کو کاش کہ نہ پکڑتا
لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ	میں فلانے کو دوست۔ البتہ بیشک گمراہ کیا مجھ کو ذکر
جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ	سے پیچھے اس کے کہ آیا میرے پاس۔ اور ہے شیطان
خَذُوْلًا ۔ (پ ۱۹ ۔ س ۲)	آدمی کو ہلاکی میں سونپنے والا۔

ظالم اس دن اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں (مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا یعنی) معیتِ حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محروم نہ رہتا۔

اسی معیت کے معنوں کو پائے ہوئے اسی نسبت محمدی سے دل کو سجائے ہوئے اور اصل توحید یعنی توحید رسالت کے میدان میں پوری استقامت سے قدموں کو جمائے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اپنے مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں کہ:

"من آں خدائے را پرستادم کہ ربِّ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) است"

[1] یاد رہے کہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے قصہ میں اسی نسبت رسالت کا اظہار کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب جادوگروں نے مقابلہ میں دیکھا کہ حضرت موسیٰ کا پھینکا ہوا عصا واقعی اژدہا بن کر ہمارے خیالی سانپوں کو سچ مچ کھا گیا ہے تو حق ظاہر ہونے کے بعد انھوں نے فرعون کے وعدہ تقرب کو بالائے طاق رکھ کر اور تمام نفسانی ہوا و ہوس سے پاک ہو کر بول کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اور سجدہ میں گر گئے۔ یہ حق گوئی اور حق جوئی درگاہ رب العزت میں اس قدر مقبول ہوئی کہ فوراً اسی میدان میں انھیں نسبت رسالت کی طرف (باقی بر صفحہ ۳۱۲)

کیا ہی پر معانی کلمات ہیں جن کی مراد ربوبیت کی صفت میں سے مخصوص ہے۔ وہ لم یزل و لایزال، بے مثل و بے مثال کل موجودات کا مالک اور تمام عالمین کا رب ہے۔ ربّ العٰلمین کی صفت اسی کے لیے ہے۔ کل موجودات سِرّی، رُوحانی، ملکی، وجودی بلکہ حیوانات، نباتات، معدنیات اور تمام درند، چرند، پرند کا رب، باقی صفات کی رُو سے کافر، مسلم، مشرک، مومن، منافق، فاسق سب کا پروردگار ہے۔ یعنی ربوبیت کا تعلق کل مخلوقات سے یکساں ہے۔ لیکن اوصاف بالکل مختلف ہیں۔ ہر ایک کو جس صفت پر تخلیق کیا ہے اس سے وہی فعل سرزد ہوتا ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کے مطابق ہر ایک اپنی سرشت پر عمل کرتا ہے۔ لیکن انسان تمام مخلوق میں سے خاص ہے، اشرف المخلوقات ہے۔ تمام صفات کا جامع ہے۔ اس کی صفات کا تغیر و تبدل گو کسی حد تک بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے اسباب سے وابستہ ہے۔ لیکن نعمتِ عظمت اور ہدایت محض فضل الٰہی پر منحصر ہے۔ انبیائے کرام کا معاملہ عوام کے حال سے وراء ہے۔ اور سید المرسلین تمام انبیائے کرام میں سے مختص ہیں اور نص اس پر شاہد ہے۔ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اس امر کی دلیل واضح ہے کہ رسالت کسب سے نہ کبھی حاصل ہوئی اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ محض فضل الٰہی ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک تو خود مرسلین کی ذات کی طرف كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا کی وجہ پر، اور دوسرا مخلوق کی طرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱) ہدایت دی اور انھوں نے کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۔ پھر جب فرعون نے صلیب پر چڑھانے کی دھمکی دی اور انھوں نے اسے بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ایمان و رشد معیتِ رسالت کے مقابلے میں اس حیات الدنیا کو ہیچ جانا تو کہا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ بس دنیا سے قدم اٹھ گئے اور منتہی ہو گئے تو فرمایا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا الایۃ ۱۲

رسالت کے توسّل اور انعام وہدایت مِنَ اللہ کی رُو سے ۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ
مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا کو بشارت ہے ایمان لانے والوں کے لیے فی الدنیا ہدایت کے
رُو سے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا فضل ہے حصُولِ آخرت کی وجہ پر ۔ دنیا عمل کا میدان
ہے اور آخرت اجر کا ۔ تو جس کسی نے فی الدنیا جس نسبت سے تعلق پیدا کیا ہو گا، وہ آخرت
میں اسی کے ساتھ ہو گا اور اس کی معیت اسی سے ملحق ہو گی ۔ تو مطابق آیات بینات جن کا
تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھتا ہو گا، وہ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا کی دولت سے
مالا مال ہوں گے ۔

ان صفات سے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، میدان دنیا میں نسبت رکھنے والے
میدان قیامت میں لواء الحمد کے نیچے سایۂ رسالت سے معمور ہوں گے، اور باوجود مسلمان
ہونے کے آج جن کا اعتقاد ان آیات پر حصُول کے رُو سے نہیں ہے، اور اس فیض اور برکات
کو اثباتِ توحید کے منافی سمجھتے ہیں، مطلق بے نصیب اور محروم ہوں گے ۔ مولیٰ کریم نے صاف
طور پر توضیح فرما دی ہے کہ میرے حبیب! ان اوصاف سے متصف کر کے تیرا مرسل کرنا مومنین
کے لیے بشارت اور میری طرف سے بڑا فضل ہے ۔ تاکہ وہ حصُولِ توحید اور محبت نسبتِ رسالت
سے حاصل کریں، اور قیامت کو نعمتِ عظمیٰ سے مسرور رہوں، اور منکر حسرت کے میدان میں
ذلیل وخوار ہوں ۔

اے بھائی! مومنین تو:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو کوئی فرمانبرداری کرے اللہ کی اور رسول کی پس وہ لوگ

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ	ساتھ ان لوگوں کے ہیں کہ انعام کیا ہے اللہ نے
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	اوپر ان کے پیغمبروں سے اور صدیقوں سے اور
وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ	شہیدوں سے اور صالحوں سے ۔ اور اچھے ہیں یہ
رَفِيْقًا ۝ (پ۵ ۔ ۶۴)	لوگ رفیق ۔

کے مطابق نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صٰلحین کے ہمراہ ہی ہوں گے ۔ اور جن کے
اعتقاد تو درست ہوں گے، لیکن اعمال میں باوجود ایمان کے کوتاہی کے باعث گنہ گار
اور فاسق ہوں گے، ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باذن اللہ شفیع ہوں گے، اور
بفضلہٖ تعالیٰ ان حجابات سے جن کی وجہ سے وہ نورِ رسالت اور دیدارِ الٰہی سے محجوب ہوں گے
خلاصی پا جائیں گے ۔ لیکن جن کو آج سوءِ اعتقادی کی ظلمات نے ڈھانپ رکھا ہے اور وہ
اس تعلیم سے جس کو خداوند کریم نے عین ہدایت کا سبب بنایا ہے، اور اس آفتاب رسالت سے
جس سے نشوونما اور روئیدگی ایمان کو مستلزم کیا ہے منکر ہو رہے ہیں، اور ان فیوض کو
شرک خیال کرتے ہیں، شیطان نے ان کو دھوکا دیا ہے اور اپنی زعمی توحید کے دریا میں
ایسے غرق ہوئے ہیں کہ اس سے سر نکالنا دشوار ہو گیا ہے ۔ اور اصل توحید یعنی توحیدِ رسالت
سے جو نورِ محمّدی سے مزین ہے فیض یاب ہونا ناممکن ہو چکا ہے ۔ دراصل ایسے شخص اقرار
کے رنگ میں انکار کرنے والے ہیں جو ہرگز ہدایت نہیں پا سکتے ۔ کیونکہ وہ کلام الٰہی سے منکر
ہو رہے ہیں ۔ اور وہ اس لیے کہ اگر وہ اس بات پر یقین کریں کہ یہ مومنین کو فضل کبیر کی بشارت
اوصاف رحمۃ للعالمین مومنوں کے لیے اجرائے ہدایت اور سبیل کے رُو سے ہے، تو ان کو

حیات النبی اور آپ کا ہر مومن سے علم اور قرب کا یقین کرنا پڑتا ہے، اور ان کے نزدیک یہ شرک اور کفر ہے۔

لیکن اس کا انکار بھی کفر سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ناسخ ان آیات بینات کا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی زمانہ اس کے تصرف کے منافی ہونے کا مقتضی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے تا قیامت مومنین کے لیے اس کا حکم جاری ہے، ہر زمانہ ماضی اور حال میں جاری رہا اور تا قیامت جاری و ساری رہے گا۔ یہ سنت اور مشیت ایزدی ہے جس کو کوئی اسباب منقطع کرنے والا نہیں ہے۔

جس طرح آج مطابقت اور مناسبت کی وجہ سے بنی نوع انسان گروہ گروہ ہو رہے ہیں قیامت کے میدان میں بھی انہی کے مطابق، موافق نسبت و حال گروہ گروہ ہو جائیں گے۔ فاسقوں کا گروہ الگ ہوگا، منافقین کا الگ، کفار الگ اور مومن الگ ہو جائیں گے۔ ہر ایک پر حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ مطابق فرمان فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ سے ہر ایک دانا بینا ہو جائے گا۔

فاسق دنیا میں لوٹنے کی آرزو کرے گا:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا
رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا
وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا
مُوقِنُونَ ۝ (۳۲ : ۱۲ - پ۲۱ - ۱۵)

اور کاش کہ دیکھے تو جس وقت گنہگار نیچے ڈالے ہوں گے
سر اپنے نزدیک رب اپنے کے، کہیں گے اے رب ہمارے
دیکھا ہم نے اور سنا ہم نے پس پھیر ہم کو کہ عمل کریں اچھے
تحقیق ہم یقین لانے والے ہیں۔

منافق اپنی عادت کے موافق قسمیں اُٹھائے گا اور خیال کرے گا کہ شاید اسی طرح جس طرح دنیا میں

کاربرداری کر لیا کرتا تھا آج بھی کام لے نکلے گا، مگر بے سود۔ کیونکہ حقیقت ظاہر ہونے کے بعد جھوٹ اور فریب کام نہیں دیتا۔ آخر جب اہل ایمان کو اپنے مقام پر پہنچنے کے لیے

صراط

پر سے گزرنے کا حکم ملے گا تو اس پُرخطر اور پرظلمات راستہ کو طے کرنے کے لیے حسب مدارج و موافق حال ان کا نور ایمانی مشعل راہ ہوگا۔ منافق یہاں بھی اپنے حال کے موافق وہی سعی کرے گا اور دنیا میں کی اپنی عادت کی طرح مومنین سے سوال کرے گا کہ کیا میں تمہارے ساتھ نہ تھا، كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ
لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ
نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ
فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ
بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ
الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ
الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ
مَعَكُمْ (پ۲۷ - ۱۷)

اس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں
واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے ہیں، انتظار کرو ہمارا
ہم بھی روشنی لیں نور تمہارے سے۔ کہا جائے گا پھر جاؤ
پیچھے اپنے پس ڈھونڈ لاؤ نور پس، مارا جائے گا درمیان
ان کے کوٹ واسطے اس کے دروازہ ہے، اندر کی
طرف جو ہے بیچ اس کے رحمت ہے اور باہر کی طرف جو
ہے اس کی اس طرف سے ہے عذاب۔ پکاریں گے کہ
کیا نہ تھے ہم ساتھ تمہارے؟

جواب میں مومن مطلع کرے گا:

قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ

کہیں گے ہاں تھے تم، ولیکن فتنے میں ڈالا تھا تم نے

وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ — جانوں اپنی کو اور منتظر تھے تم یعنی واسطے بُرائی کے ہمارے

الْأَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ أَمْرُ اللّٰهِ وَ — اور شک میں تھے تم اور فریب میں ڈالا تھا تم کو آرزوؤں

غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۔ (پ ۲۷) — نے یہاں تک کہ آیا حکم خدا کا اور فریب میں دیا تھا

(۵۷ : ۱۳-۱۴) — تم کو ساتھ اللہ کے فریب دینے والے۔

مختلف صحیح حدیثوں میں صراحت ہے کہ یہ صراط میدان حشر اور جنت کے درمیان دوزخ پر کھینچی جائے گی، جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ دس ہزار سال کی مسافت چڑھائی، دس ہزار سال کی راہ ہموار اور اترنے کے لیے بھی دس ہزار سال کی مدت درکار ہے یاد رہے کہ یوم القیامۃ کی کُل مُدت پچاس ہزار سال کے مقدار ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ — چڑھیں گے فرشتے اور رُوح طرف اس کی بیچ اس

كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ — دن کے کہ ہے مقدار اس کی برابر پچاس ہزار

(پ ۲۹ - ۷۰ : ۴) — سال کے۔

لیکن جیسے کہ حسب مدارج بعض پر یہ دن آسانی اور قلیل مدت میں گزر جائے گا حتیٰ کہ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ بعض کو اتنا ہی عرصہ معلوم ہوگا جتنا کہ دو نمازوں کے درمیان وقفہ اسی طرح گو اس صراط سے گزرنا ہر انسان کا ضروری اور ناگزیر ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ:

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى — اور نہیں کوئی تم میں سے مگر گزرنے والا ہے اوپر اس کے

رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ — ہے اوپر پروردگار تیرے کے لازم فیصلہ کیا گیا۔ پھر نجات

اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۔ — دیں گے ہم ان کو جو پرہیزگاری کرتے ہیں اور چھوڑیں گے

(پ ۱۶ - ۱۹) — ظالموں کو بیچ اس کے گرے ہوئے۔

لیکن گزرنے والے حسب مدارج گزریں گے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض تو اس پر سے بجلی کی سی تیزی سے گزر جائیں گے، بعض ہوا کی طرح، اور بعض سرپٹ گھوڑے کی طرح۔ پھر شتر سوار کی مانند، پھر دوڑتے آدمی کی طرح، پھر پیدل چلنے کی طرح، بعض آہستگی سے اور بعض لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے۔ اسی طرح حسب حال باوجود بال سے باریک ہونے کے مومنین کے لیے یہ صراط حسب مراتب و مدارج وسعت رکھے گی، تاآنکہ حدِ نگاہ تک فراخ ہو گی اور بجلی کی سی تیزی یا ہوا کی طرح گزرنے والے منزلِ مقصود پر پہنچ کر تعجب کریں گے کہ نہ صراط دیکھی نہ دوزخ، تو جواب ملے گا کہ تمہارے گزرتے وقت صراط کو وسیع اور دوزخ کو سرد کر دیا گیا۔

حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی قدس سرہٗ نے فتوح الغیب میں ایک حدیث شریف نقل فرمائی ہے کہ دوزخ مومن کو گزرتے وقت کہے گی کہ "اے مومن! جلدی سے گزر جا کہ تیرے نور نے میرے شعلے کو سرد کر دیا۔

علیٰ ہٰذا القیاس نور بھی حسب مدارج و حسب مراتب ہی مرتب ہو کر ظہور میں آئیگا چنانچہ حدیث شریف میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ بعض مومنوں کا نور اس قدر روشن ہوگا کہ مدینہ طیبہ سے عدن تک کی مسافت کو روشن اور منور کر دے گا۔ بعض کا اس سے کم، بعض کا کھجور کے درخت کے برابر اور بعض کا اپنے قد کے مطابق۔ بعض کا صرف اتنا کہ قدموں کی جگہ کو روشن کرے گا۔ تاآنکہ انگوٹھے کے ناخن پر ہوگا جو جگنو کی طرح کبھی چمکے گا اور کبھی بجھ جائے گا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تَمَنَّوْا أَضْحَابًا كُفْر

فَاِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ. یعنی خوب موٹی تازی قربانیاں کیا کرو کیونکہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صراط دراصل صراط المستقیم پر چلنے کی مثالی صورت ہے یعنی میدان دنیا میں انسان جس قدر صراط المستقیم اور شریعت غرا پر ثابت قدمی اور پامردی سے گامزن ہوگا اسی قدر یہ صراط اس کے لیے آسان ہوگی۔ اور جس قدر نسبت محمدی سے نور حاصل کرے گا اسی قدر وہ فی الدنیا وفی الآخرہ ہر میدان میں اس کے لیے مشعل راہ ہوگی، جیسا کہ فرمایا:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا	کیا جو شخص کہ تھا مردہ پس جلایا ہم نے اس کو
لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ	اور کیا ہم نے واسطے اس کے نور چلتا ہے ساتھ
مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ	اس کے بیچ لوگوں کے مانند اس شخص کے کہ صفت
مِّنْهَا ٥ (پ ۸ ـ ر ۲)	اس کی یہ ہے کہ بیچ اندھیروں کے نہیں نکلنے والا اس سے

اسی نور کا یہ ظہور تام ہے اور یہی ظلمت کفر و نفاق جو اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوئی۔ آخر دونوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس کے اندر کی طرف اہل ایمان اور باہر کی جانب منافق مطابق نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا جہنم کی تہ میں پہنچ جائیں گے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ۔

دوزخ اور جنت

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى	اور ہانکے جائیں گے وہ لوگ کہ کافر ہوتے تھے
جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا	طرف دوزخ کی گروہ گروہ۔ یہاں تک کہ جب آئیں گے
فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ	اس کے پاس کھولے جائیں گے دروازے اس کے اور
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ	کہیں گے واسطے ان کے چوکیدار اس کے کیا نہ آئے تھے
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ	تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے پڑھتے تھے اوپر تمہارے
لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ	نشانیاں پروردگار تمہارے کی اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات
حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ	اس دن تمہارے کی سے کہیں گے نہیں بلکہ آئے تھے۔
قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ	ولیکن ثابت ہوئی بات عذاب کی اوپر کافروں کے۔
فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ٥	کہا جائے گا داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے ہمیشہ
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى	رہنے والے بیچ اس کے پس بری ہے جگہ تکبر کرنے والوں
الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَ	کی۔ اور ہانکے جائیں گے وہ لوگ کہ ڈرتے تھے رب اپنے
فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا	سے طرف بہشت کی گروہ گروہ۔ یہاں تک کہ جب آئیں گے
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا	اس کے پاس اور کھولے جائیں دروازے اس کے اور
خٰلِدِيْنَ ٥ (۳۹: ۷۱ ـ ۷۳ ـ پ ۲۴)	کہیں گے واسطے ان کے چوکیدار اس کے سلامتی ہو تم

پر خوشحال ہوئے تم پس داخل ہو اس میں ہمیشہ رہنے والے۔

مطابق فرمان اصحاب النار و اصحاب الجنۃ کی تفریق ہو جائے گی اور دونوں کو اپنے اپنے مقام کی طرف چلنے کا حکم دیا جائے گا۔ ہر ایک دوزخی اور جنتی کے مدارج مختلف ہوں گے اور وہ بھی حال کے موافق ہی ظہور ہو گا۔

دوزخ

کے سات درکے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں مطلع فرمایا ہے:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ	اور تحقیق دوزخ جگہ وعدے ان کے کی ہے سب
لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ	کی۔ واسطے اس کے سات دروازے ہیں واسطے
جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (پ۱۴ - ع۴)	ہر ایک دروازے کے ان میں سے ایک حصہ ہے تقسیم کیا گیا۔

ان ساتوں کے نام قرآن مجید اور حدیث شریف میں واضح ہیں چنانچہ پہلے کا نام جہنّم ہے اور دوسرے کا لظیٰ، تیسرا حطمہ، چوتھا سعیر، پانچواں سقر، چھٹا جحیم اور ساتواں ہاویہ۔ ان کے علاوہ اور بھی نام مذکور ہیں جو انہی میں کے بعض خاص گوشے اور حصّے ہیں۔ مثلاً ویل، غیّ، زمہریر وغیرہ۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل مطلوب نہیں۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہر قسم کی توضیح و تفصیل موجود ہے اور انواع و اقسام کے عذاب کا ذکر ہے۔ مختلف قسم کے بد سے بدتر کھانے اور پینے کی چیزوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ جیسے کہ ضریع و زقوم اور حمیم و غساق اور غسلین و قطران وغیرہ۔

یہاں تو صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہر ایک دوزخی کا عذاب اپنے ہی حال اور حجاب کے موافق ظہور میں آئے گا۔ مثلاً کفار کے لیے عذابٌ عظیم اور عذاب الحریق کے الفاظ فرمائے

ہیں۔ منافقین کے لیے عذابٌ الیم اور گندے کام کرنے والوں کے لیے عذابٌ غلیظ کی وعید فرمائی ہے۔ سود خوار کے متعلق فرمایا:

لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ	نہیں کھڑے ہوں گے مگر جیسا کھڑا ہوتا ہے وہ شخص
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ	کہ باؤلا کرتا ہے اس کو شیطان آسیب سے یہ اس واسطے
بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ	ہے کہ انہوں نے کہا بجز اس کے نہیں کہ بیچ بھی
وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ	مثل سود کے ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے
(۲: ۲۷۵ - پ۳ - ع۶)	اور سود کو حرام۔

پاگلوں اور خبطیوں کی طرح کھڑا ہو گا کیونکہ وہ خداوند جلّ و علا کے صریح احکام میں نفس کی شرارت سے تاویل کرتا ہے۔

یتیموں کا مال کھانے والے کے متعلق فرمایا کہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس نوعیت کے حجاب میں محجوب ہوا اسی کیفیت سے عذاب کا ظہور ہو گا اور ان میں کا جس قدر زیادہ سخت ہو گا اسی قدر زیادہ اسفل اور سخت عذاب میں گرفتار ہو گا۔ حتیٰ کہ منافق سب سے نیچے ہو گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ	یقیناً منافق سب سے نچلے درکے آگ کے میں
مِنَ النَّارِ (پ۵ - ع۱۳)	ہوں گے۔

مومنین نور ایمانی کی بدولت فسق و فجور کے اندازہ پر عذاب کی سختی اٹھا کر خلاصی پا جائیں گے اور کفار و مشرکین اور منافقین ابدی عذاب میں مستغرق رہیں گے:

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ — جس دن آوے گا نہ بولے گا کوئی جی مگر ساتھ حکم اس کے
فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝ فَأَمَّا الَّذِيْنَ — کے پس بعضے ان میں سے بدبخت ہیں اور بعضے نیکبخت
شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ — ہیں۔ پس جو لوگ کہ بدبخت ہوئے پس بیچ آگ کے ہیں
وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ — واسطے ان کے چلانا ہے بیچ اس کے آواز باریک سے اور
السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَآءَ — آواز موٹی سے۔ ہمیشہ رہنے والے بیچ اس کے جب تک
رَبُّكَ ۝ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا — کہ رہیں آسمان اور زمین مگر جو چاہے پروردگار تیرا تحقیق
يُرِيْدُ ۝ وَأَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا — پروردگار تیرا کرنے والا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ اور جو لوگ
فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ — کہ نیک بخت کیے گئے ہیں پس بیچ بہشت کے ہیں ہمیشہ
السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَآءَ — رہنے والے بیچ اس کے جب تک کہ رہیں آسمان اور
رَبُّكَ ۝ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (پ۱۲۔ ع۹) — زمین مگر جو چاہے پروردگار تیرا۔ بخشش ہے نہ کاٹی گئی

جنّت

جنّت باغ اور ہر قسم کے انتہائی آرام اور تعیش کی جگہ کا نام ہے، اور اس کے بھی سات بلکہ آٹھ درجے ہیں، اسی وجہ سے اسے بہشت بھی کہتے ہیں۔ جو جنت ماویٰ، دار المقام، دار السلام، جنت خلد، جنت نعیم، جنت عدن کے نام سے مشہور ہیں، اور آٹھواں فردوس ہے۔ کسی کے محلات چاندی سے بنے ہیں، کسی کے سونے سے، کوئی موتی سے تیار ہوا ہے اور کوئی صرف نور سے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں ان کے نعمات وغیرہ ہر قسم کی کافی تفصیل موجود ہے۔ بہرکیف یہ بھی اہل جنت کے حال کے معنوں کی عبارت کے مطابق ہی

ظہور پذیر ہوگا۔ میدان دنیا میں ہر ایک مومن کا حال مختلف ہے، اور اسی کے مطابق عمل۔ اور ہر عمل کا نتیجہ اس کی نیت سے وابستہ ہے۔

پہلا طبقہ مومنین کا مجاہدین سے ہے، اور دوسرا مشاہدین و مقربین سے۔ پہلا طبقہ باوجود ایمان و ایقان رکھنے کے صفات بشریت کے مطابق تمام شہوات حیوانیہ کا حامل، تمام خواہشات انسانیہ کا طالب، ہر فخر و ستائش کا شیدا اور تمام حظوظ و لذات کا فریفتہ، گویا نفس اَمَّارَةٌ بِالسُّوْء کا مُرید ہوتا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ خوف خدا سے ڈر کر ان سب صفات سے نفور اور ان کی بُرائی سے دانا اور مقرور ہوتا ہے۔ مطابق شریعت غرا و فرمان ذوالجلال والاکرام

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى — اور ایپر جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے آگے پروردگار اپنے
النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ — کے اور روکا نفس اپنے کو خواہش سے۔ پس بے شک
هِيَ الْمَأْوٰى ۝ (پ۳۰۔ ع۴) — جنت وہی ہے جگہ رہنے کی۔

کے ان صفات میں مجاہد ہوتا ہے۔ اگر وہ اسی مقام اور اسی حال میں مر جائے تو اس کے لیے جنت حلال کر دی جاتی ہے۔ چونکہ فرمان عزیز الحکیم ہے:

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ — لیے پھریں گے اوپر ان کے رکابیاں سونے کی اور آبخورے
وَّأَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ — اور بیچ اس کے جو کچھ چاہیں اس کو نفس اور لذت
الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۚ وَأَنْتُمْ — پکڑیں آنکھیں۔ اور تم بیچ اس کے ہمیشہ رہنے
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (پ۲۵۔ ع۱۳) — والے ہو۔

کہ جنتی نفس کی اشتہا کے مطابق جو کچھ چاہے گا پائے گا اور ہر طرح کی من مانی عیش میں ہوگا

یعنی موافق حال طلب اور خواہش کرنے والا اور اسی کے مطابق حصول اور مقصود کو پانے والا ہوگا۔ ہاں وہ چیزیں جو اس کے نفس میں بذاتہٖ دُکھ دینے والی مثلاً حسد کینہ وغیرہ باقی ہونگی، وہ عین نوازش اور رحمت سے دُور فرما دیں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ	اور نکال ڈالا ہم نے جو کچھ بیچ سینوں ان کے کے
غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۝	تھا ناخوشی سے۔ بھائی ہو جائیں گے اوپر تختوں کے
(پ۱۴ - س ۴)	آمنے سامنے۔

اور ایسے شخصوں کو اصحاب الیمین کا نام دیا یعنی جن کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوگا:

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۵ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ	اور داہنی طرف والے، کیا ہیں داہنی طرف والے۔
فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۵ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۵	بیچ بیریوں کانٹے دور کیے ہوئے، اور کیلے تہ بتہ،
وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۵ وَّمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ ۵	اور سایہ لمبا، اور پانی گرتا ہوا، اور میوے بہت۔
وَّفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ ۵ لَّا مَقْطُوْعَۃٍ	نہیں کاٹا گیا اور نہ منع کیا گیا، اور بچھونے بلند۔
وَّلَا مَمْنُوْعَۃٍ ۵ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ ۵	تحقیق ہم نے پیدا کیا عورتوں ان کی کو پیدا کرنا۔
اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً ۵ فَجَعَلْنٰھُنَّ	پس کیا ہم نے ان کو کنواری، سہاگ والیاں
اَبْکَارًا ۵ عُرُبًا اَتْرَابًا ۵ لِّاَصْحٰبِ	ہم عمر، واسطے داہنی طرف والوں کے۔ جماعت
الْیَمِیْنِ ۵ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۵ وَ	کثیر پہلوں میں سے اور جماعت کثیر ہے پچھلوں
ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ۝ (پ۲۷ - س ۱۴)	میں سے۔

دوسرے طبقہ کے لوگ بھی کسی قدر انہی سے مطابقت رکھنے والے ہوں گے لیکن

یہ ان سے سبقت کرنے والے یعنی آگے نکل جانے کی وجہ سے ان سے مقرب ہوں گے۔ اور یہ اس لیے کہ وہ میدان دنیا میں صرف مجاہد ہی نہ رہے بلکہ اس مجاہدہ کے حصول کو پائے ہوئے یعنی تغیرِ حال کے مفاد کو حاصل کر چکے ہوں گے۔ ان کا حال نفس لوامہ کے موافق ہوگا۔ گاہے لینت قلب سے حظ اٹھانے والے اور گاہے اس سے بیگانگی کو پانے والے یعنی کبھی تو دنیا و مافیہا سے اعراض اور اس کے عیوب سے نفور اور کبھی اس کے فکر میں مشغول بمصداق ؎

گاہے در دوزخ روی سازی مقام

گاہے در جنت روی اے خوش خرام

بموجب فرمان ایزد متعال ذوالجلال والاکرام:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ ۝	اور واسطے اس شخص کے کہ ڈرتا ہے کھڑے ہونے
(پ۲۷ - س ۱۳)	سے آگے رب اپنے کے دو باغ ہیں۔

دو جنتوں کے صاحب ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ ایسے شخص دو بلا میں مبتلا ہوتے ہیں۔ باوجود اپنے حال سے علم رکھنے کے استقامت سے عاجز ہوتے ہیں۔ معصیت اور ثواب کو پہچاننے والے، ہر نشیب و فراز کو جاننے والے، نفس کی حرکات سے بیزار اور ریا دانی میں قرار پانے والے ہوتے ہیں۔ جنت نعیم کے فدا، نعمتِ عظمیٰ کے شیدا، اپنے اعمال میں بے ریا، اپنی کشتی ہستی کے ناخدا، طالب رضا، اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے حال سے دو وجہ پر متحیر اور مبتلا، ایک تو پرہیز اور اتقا کے کامل ہونے سے خائف، دوسرے اعمال کو محل قبولیت میں مشرف ہونے سے ترساں اور اپنے آپ سے نالاں، بمصداق ؎

گر نیفتادم ندیدم کعبۂ مقصود را
درمیان ما ہمیں استادگی دیوار بود

ایسے لوگوں کو اصحاب المیمنہ کا نام دیا ہے یعنی داہنی طرف والے اور ان کے حق میں فرمایا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ	اور آگے نکل جانے والے آگے ہیں سب۔ یہ لوگ
الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۞	مقرب ہیں بیچ بہشتوں نعمت کے۔ بڑی جماعت
ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ وَقَلِيْلٌ مِّنَ	ہے پہلوں میں سے اور تھوڑی پچھلوں میں سے
الْاٰخِرِيْنَ ۭ عَلٰي سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ	اوپر چارپائیوں سونے کی تاروں سے بُنی ہوئی کے
مُّتَّكِـــِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۞ يَطُوْفُ	ہیں تکیہ کیے ہوئے اوپر ان کے آمنے سامنے
عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۞ بِاَكْوَابٍ	پھریں گے اوپر ان کے لڑکے ہمیشہ رہنے والے۔
وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ	ساتھ آبخوروں کے اور آفتابوں کے اور پیالوں کے
لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ	شراب صاف سے نہیں سر دکھائے جائیں گے اس سے
وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ وَلَحْمِ	اور نہ بیجا بولیں گے اور میوے اس قسم کے کہ پسند
طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۞ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ	کریں۔ اور گوشت پرندوں کے اس قسم سے کہ چاہیں گے۔
كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُـؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ جَزَاۗءً	اور حوریں ہیں بڑی آنکھوں والیاں مانند موتیوں چھپے
بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ لَا يَسْمَعُوْنَ	ہوئے کے۔ بدلہ اس چیز کا کہ تھے وہ کرتے نہیں
فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا	سنیں گے بیچ اس کے بیہودہ اور نہ گناہ کی باتیں مگر

سَلٰمًا سَلٰمًا ۞ (پ۲۷ - س ۱۳)	کہنا سلام ہے سلام ہے۔

ان کے علاوہ قرآن مجید میں جگہ جگہ پر ان دونوں گروہوں کے لیے مولیٰ کریم نے مجمل اور مفصل تعریف سے جنت کے وعدے فرمائے ہیں۔ اور کہیں ان کے اہل کو ابرار کے نام سے ذکر کیا ہے کہیں متقین کے نام سے، کہیں صابرین اور شاکرین وغیرہ۔ اور جنت کے یہ ساتوں درجے مطابق اعمال و اخلاص ہر ایک کے حسب حال عنایت فرمائیں گے۔

تیسرا طبقہ:

یہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی مناسبت نبیوں اور رسولوں کے حال سے ہے۔ ان کا جینا، ان کا مرنا، بلکہ کھانا، پینا، سونا، اور چلنا، پھرنا، تمام حرکات و سکنات لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا مصداق ہوتی ہیں۔ ان کا بیان نہ تقریر سے ہو سکتا ہے نہ تحریر سے۔ دنیا و مافیہا سے دور، ذکر اللہ سے مسرور، طالب خدا۔ رغبت کی گئی چیزوں سے دل کو ہٹائے ہوئے، ان کے اثرات سے خلاصی پائے ہوئے، اپنے قلب اور اس کی محبت کو خدا سے لگائے ہوئے، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی کے معنوں کو پائے ہوئے، فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کے سبق سے راستہ کے خس و خاشاک کو ہٹائے ہوئے، ولایت کے میدان میں قدم میمنت کو جمائے ہوئے، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے اعراض، دارین کی اغراض سے اجتناب، يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کی دولت کو پائے ہوئے، طلب خدا اور اس کی رضا میں جان پر کھیلنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا حال فرمان مولیٰ کریم:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۞ الَّذِيْنَ	یہ لوگ وہی ہیں وارث جو ورثہ لیں گے جنت
يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا	فردوس: وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے

خٰلِدُوْنَ ۝ (پ۱۸ - س۱)	والے ہیں۔

کے موافق ہے۔ اور یہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور بلند ترین مقام ہے جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے باب صفۃ الجنۃ میں حدیث ہے:

وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ	اور روایت ہے عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ
تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی	عنہ سے۔ کہا کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ فِی الْجَنَّةِ مِائَةُ	وسلم نے بہشت میں سو درجے ہیں۔ درمیان
دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا	ہر دو درجوں کے اتنا فرق ہے جیسا کہ درمیان
بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالْفِرْدَوْسُ	آسمان اور زمین کے اور فردوس سب جنتوں
اَعْلَاهَا دَرَجَةً مِّنْهَا تَفَجَّرُ اَنْهَارُ	سے بلند تر ہے از روئے درجے کے۔ اسی سے
الْجَنَّةِ الْاَرْبَعَةُ وَمِنْ فَوْقِهَا يَكُوْنُ	رواں کی جاتی ہیں چاروں نہریں بہشت کی اور اوپر
الْعَرْشُ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ	فردوس کے عرش ہے پس جب مانگو تم اللہ تعالیٰ
الْفِرْدَوْسَ - رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ	سے تو مانگو اس سے فردوس۔ روایت کی یہ ترمذی نے۔

اور ایک حدیث شریف میں اس کے مفاد کی اس طرح صراحت فرمائی ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا	روایت ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ
قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ	فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ تحقیق
وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِنَّ اَدْنٰی اَهْلِ الْجَنَّةِ	ادنیٰ بہشتیوں کا از روئے مرتبہ کے البتہ وہ شخص

مَنْزِلَةً لَمَنْ يَّنْظُرُ اِلٰی جِنَانِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ	ہے کہ دیکھے گا طرف اپنے باغوں کے اور اپنی عورتوں کے
وَنَعِيْمِهٖ وَخَدَمِهٖ وَسُرُرِهٖ مَسِيْرَةَ اَلْفِ	اور اپنی نعمتوں کے اور اپنے خدمت گاروں کے اور اپنے
سَنَةٍ وَاَكْرَمُهُمْ عَلَی اللّٰهِ مَنْ يَّنْظُرُ	تختوں کے مقدار مسافت ہزار برس کے اور گرامی تر ان کا
اِلٰی وَجْهِهٖ غُدْوَةً وَّعَشِيَّةً ثُمَّ قَرَاَ	نزدیک اللہ تعالیٰ کے وہ شخص ہوگا کہ دیکھے گا طرف منہ
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ	مبارک اس ذات پاک کے صبح اور شام۔ پھر پڑھی حضرت
رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ۔ (مشکوٰۃ	نے یہ آیت، کتنے منہ اس دن تر و تازہ اور خوش و خرم ہوں گے
باب فی رؤیۃ اللہ تعالیٰ	طرف رب اپنے کے دیکھنے والے۔

اسلام و ایمان اور دین الحق کا مفاد اصل الاصول مقصود کا حصول منعم حقیقی کے سوا نہیں ہے۔ کیونکہ کل نعمات دینی ہوں یا دنیوی منعم حقیقی کے مقابلہ میں بیگانگی کا حکم رکھتی ہیں۔ تو جب تک تمام حصول دنیا و الآخرۃ سے بیگانگی نہ ہو مولیٰ کریم کے ساتھ محبت اور وفا میں یگانگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بمصداق ؎

سب سے بیگانہ ہے اے یار شناسا تیرا
حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا

اور یہ اس لیے کہ محبت میں ہر غرض حجاب ہوا کرتی ہے۔ ایسے شخصوں کے لیے دونوں جہان اسی کا حجاب ہی ہوتے ہیں۔ ان کا آرام و اطمینان سوائے ذات پاک کے کسی حصول سے نہیں ہو سکتا ؎

مپندار ایں کہ حسرت از دل عاشق رود ہرگز
چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد

مطابق فرمان ایزد متعال اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا اپنے رب ہی کی طرف ان کی انتہا ہے، اور اسی ذات کے ساتھ وہ مطمئن۔ اسی لیے ان کے موافق حال فرمان ذوالجلال والاکرام ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ	اے نفس مطمئنہ! پھر جا طرف پروردگار اپنے کے
اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِیْ	کہ خوش ہے تو پسند کی گئی۔ پس داخل ہو تو بیچ
فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ (پ۳۰ - س۱۴)	بندوں میرے کے اور داخل ہو بیچ جنت میری کے

ضمیمہ الھیات

توحید

توحید وحدانیت پر حکم کے سوا نہیں ہے۔ یعنی کسی غیر کے حکم کے سوا اپنی وحدانیت پر حاکم ہونا اور واحدیت میں ثابت بلاثبت ماسوائے کا کمال رکھنا اور اپنی ذات سے ہر قدرت کے ساتھ قادر ہونا ہوتا ہے۔ اور یہ سب تعریف اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال ذوالجلال والاکرام ہی کے لیے ہے۔ گو توحید میں سوائے حال کے کلام جہالت ہے، اور اس کے ادراک میں عقل محض عاجز، اور اس پر ایمان رکھنا صحت کے ساتھ فرض ہے۔ ازیں سبب اس کی معرفت میں بندوں کے لیے جس قدر تنگی واقع ہوئی ہے اور کسی علم و یافت میں نہیں ہوئی۔ اور یہ اس لیے کہ عقل کی دَوڑ عالم معلومات تک محدود ہے۔ اور معرفت کا حصول میدان معروفات کے سوا نہیں ہے اسی وجہ پر تحریر و قال بغیر حال کے سوائے خطا کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم توحید کا بیان تین نوع پر منقسم ہے: (۱) توحید فی الذات، (۲) توحید فی السّر، (۳) توحید فی الخلق۔

توحید فی الذّات:

الآن کما کان۔ جس کا نہ اوّل نہ آخر، نہ ابتدا نہ انتہا، نہ کمی نہ بیشی، تغیر و تبدل سے منزّہ عُرُوج و نزول سے مبرّا، ظہور و بیان سے ورا، ذات معلّٰی کے بغیر نہ کسی کا علم، نہ کوئی لوح نہ قلم۔ نہ کوئی ملک نہ جن، نہ زمین نہ آسمان، سوائے متحقق بالذات کے نہ کسی کا علم، نہ کسی کا نشان۔ محض اپنی واحدیت میں تنہا۔ عبارت کے میدان میں نہ کوئی عابد نہ معبُود، نہ ساجد نہ مسجود، نہ واجد نہ موجود، نہ خالق نہ مخلوق، نہ سابق نہ مسبوق، نہ مردود نہ مقبول، نہ اللہ نہ رسول، نہ نزدیک نہ

دُور، اپنی ذات معلّٰی میں صفت بالذات بلاظہور کے ساتھ اَحَد، نہ کوئی حصر نہ حد، کما قال اللہ تعالیٰ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد۔ بمصداق ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا ہم کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توحید فی السِّر:

جب اس خالق کائنات نے ذات کا ظہور چاہا تو اول لوح محفوظ اور قلم کی طرف مرید ہوئے اور کَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا کی قادریت نے کلمہ طیب سے نقش و نگار توحید کا ظہور فرمایا۔ یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا حکم نوری تخلیق میں رونق افروز ہُوا۔

اب یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب لوح محفوظ پر سوائے کلمہ طیبہ کے کوئی نوشت نہ تھی، یا صاف معنوں میں سوائے ذات احد کے کوئی شے نہ تھی تو لَا کس کی نفی پر دال تھا؛ نحو کے قاعدہ کے لحاظ سے لا نفی جنس کا ہوتا ہے۔ جب غیر تھا ہی نہیں تو پھر یہ نفی کس الٰہ کے لیے ہوئی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ نحو کے لحاظ سے نفی کی نفی اثبات پر دال ہے جو اثبات کی تصدیق کے سوا کوئی مفاد نہیں رکھتی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لا محض اثبات کا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص ایک مکان میں تنہا کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں کوئی میرے سوا اس مکان میں۔ تو اس کی یہ نفی اس کی تنہائی اور اَحَدیّت کے لیے اثبات کا حکم رکھے گی۔

تیسری نوع

توحید فی الخلق

ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک تو مولیٰ کریم سے مخلوق کی طرف، اور دوسرا مخلوق سے اللہ تعالیٰ کی طرف۔ ذاتِ معلیٰ کی طرف سے مخلوق کی جانب قادریت اور معیّت کی رُو سے توحید کا ظہور ہے جس کا علم سوائے حال اور عرف کے محال ہے۔ تاہم اصل الاصول توحید اور اس کی حقیقت اس کے سوا مطلق نہیں ہے۔

دوسری نوع بنی انسان سے ذاتِ معلیٰ کی طرف منسوب ہے۔ جس کا حصول حجابات کے دور ہونے کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کئی وجہ پر ہے جن میں دو نوع معروف ہیں۔ ایک تو دلیل اور علم الیقین کی رُو سے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور دوسرے عین الیقین کی رویت سے حق الیقین تک پہنچنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن صرف دلیل سے توحید میں کلام سوائے دلیل عینی کے رویت پر جہالت ہے۔ اور رویت سے توحید میں کلام حسب الحال صحیح۔ بمصداق ؎

ہرکہ نادیدہ نام او گوید مشرک است آن فضول ناہموار

اور یہ اس لیے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ایقان کے میدان میں محض تخیل، ظن اور تصور زعمی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اور وہ لم یزل ولا یزال، بے مثل و بے مثال ان تمام اوہام سے منزہ اور مبرا ہے۔ گو ذاتِ معلیٰ پر مع صفات کے ایمان رکھنا اور مطابق احکام اسلام اور شریعت پر عمل کرنا باعث نجات اور حصول نعمات کا مقتضی ہے۔ لیکن اصل مقصود اور حقیقت فی الدنیا و فی الآخرہ مفقود، اور صحت حقیقت اس سے ورا، خصوصاً توحید میں کلام اور تعریف حقیقت کے

خلاف، اور اس پر حکم لاحاصل۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ اصل کے خلاف ہو گیا ہے اور ہر جائز سبیل کو نادانی کی وجہ سے شرک قرار دیا ہے۔ حالانکہ بغیر سبیل کے کوئی فعل بھی درست نہیں ہو سکتا۔ سنت اللہ اسی طرح جاری اور ساری ہے اور اسی طرح رہے گی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا کے مطابق تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مولیٰ کریم نے اپنی ذاتِ معلیٰ کے ظہور کے لیے اسباب تخلیق کو لازم کیا ہے۔ یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ ذاتِ معلیٰ مع اپنی صفات ذاتیہ کے وحدانیت میں واحد تھی تو ظہور ذات کے لیے عالم ارواح کی طرف مرید ہوئے۔ پھر اس کے ظہور کے لیے اسباب حدث کی طرف ارادہ فرمایا تو کل موجودات میں اپنی وحدانیت کا ظہور صفت بالفعل کی صورت میں ہویدا کیا۔ ان سب منازل میں حدث کے سوا قدم کی حقیقت پر توحید واجب الوجود کی رُو سے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے مترادف اپنی تعریف میں معروف ہوئے۔ مطابق هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اپنے کمال علم سے اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا کی قدرت کاملہ سے محاط ہوئے۔ مطابق کلام عارفاں "جو حدث سے قدم کو نہیں پہچانتا اپنی گفتار میں جاہل ہوتا ہے"۔ یہ مفاد حاصل کرنا حقیقت سے بعید نہ ہو گا کہ اس ذات پاک کی توحید ذاتیہ کا انحصار محض ذات سے ہے۔ اور ظہور توحید سری ہو یا ظاہری صفت بالذات کے تصرف سے صفت بالفعل کی طرف منسوب ہے۔

گو بے مثال کے لیے ہر مثال بیگانگی کے سوا نہیں ہے تاہم فہمید کے لیے یوں قیاس کرنا چاہیے کہ کوئی اصل تغیر کا محل نہیں ہے، اور فرع کے لیے تغیر روا ہوتا ہے۔ اصل فرع کے سوا اپنی صحت حال پر استقلال رکھتا ہے، اور فرع سوائے اصل کے کوئی شے نہیں ہے۔

لیکن اس مثال سے یہ مفاد حاصل کرنا چاہیے کہ اس اصل اور فرع اور اس کی مثال سے وہ ذات معلّٰی پاک ہے۔ کیونکہ ہر صفت ذاتیہ کے تصرف سے صفت بالفعل اس کے فعل کے سوا ذات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ ہر آن، ہر زمان، ہر صورت و حقیقت میں خداوند کریم اپنی احدیت میں الآن کما کان ہی ہیں۔ محض ذات کو مخلوق سے خالقیت کی نسبت ہے۔ جیسے رب کو ربوبیت سے، قدرت کو قادریت سے، ارادہ کو مرید سے اور حیاتی کو حیّ سے مناسبت ہے۔ یہ تمام صفت بالفعل کا ظہور ہے اور صفت بالفعل کا تعلق صفت بالذات سے ہے، اور صفت بالذات کا ذات سے۔ ان سب صفات فعلیہ و ذاتیہ کا اصل الاصول ذات محض ہے۔ اس لیے ہر حدث اور تخلیق منازل کے نشیب و فراز سے نزول اور عروج کے رُو سے تعلق واحد ہے۔ تعلق ذاتیہ کے لیے یہ منازل بشری یا ظاہری، ذات کے لیے قُرب اور بُعد کا باعث نہیں۔ یہ ہمارے عارضہ کی وجہ سے ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ہر ایک اپنے حال کی وجہ سے ایک مقام کا مقیم ہے۔ نزول ہو یا عروج، کفر ہو یا اسلام بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ کی وجہ پر اپنی سرشت کے مطابق تقدیر معلق کے رو سے، یا حد سے گزر جانے کے بعد صفات فعلیہ کے تصرف سے کسی نہ کسی صفت لُطفی یا غضبی نوری یا ناری، محبّی یا عُدوّی، ہر مقام و محل میں خداوندی صفات غفاری یا جباری سے ہر ایک تعلق رکھتا ہے۔ بدیں وجہ وحدانیت کا تصرف اس کے حال کے مطابق من اللہ ہوا کرتا ہے۔ اس لم یزل کی احدیت کے قُرب میں کسی صفت یا فعل کی وجہ سے دُوری کا مقتضی نہیں ہو سکتا ہے۔

یار نزدیک تر از من بہ من است
ویں عجب تر کہ من از وے دورم

کیونکہ حجابات کا حائل ہونا ہماری ہی طرف سے اور ہمارے ہی لیے ہے۔ خداوند جلّ وعلا کی ذات اور اَحَدیت کے لیے نہ کوئی حجاب ہے اور نہ کوئی بُعد، اور نہ ہی روا ہو سکتا ہے۔ ہر ایک کا مقام اپنے حال کے رُو سے میدان اَحَدیت میں معلّق ہے۔ مثلاً کافر کو کفر کی وجہ سے ذات کے ساتھ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ کی نسبت ہے۔ اور منافق کو اپنے نفاق کی وجہ سے اور فاسق کو اپنے فسق کی وجہ سے۔ مومن باعمل کو اپنے ایمان سے، ابرار کو اپنے نیک اعمال سے اور مقرب کو قرب سے، اور ولی کو دوستی کے رُو سے، صدّیق کو صدق کی وجہ سے، نبی کو نبوّت اور مرسل کو رسالت کی وجہ پر ذات اور احدیت سے نسبت ہے۔ گو من جانب اللہ جلّ شانہٗ اَحَدیّت کی رُو سے کوئی فرق نہیں ہے مگر تعلق ذاتی کے سوا صفاتی کا از حد اختلاف ہے۔ اسی لیے جیسا اوپر گزر چکا ہے ہمارے ہی عارضہ کی وجہ پر تفصیل ہے۔ ہمارا ہر وصف خداوند تعالیٰ کی صفات فعلیہ کا نتیجہ ہے اور اللہ جلّ شانہٗ کی شان ربوبیت کا فعل ہمارے ظاہر و باطن میں متصرف ہے جو دو حصّوں پر منقسم ہے ایک توفیق سرشتی کی وجہ پر، دوسرا اضافیہ۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (پ - ع)	ہم روزی دیتے ہیں تم کو اور ان کو۔
نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ۝	ہم نے پیدا کیا ہے تم کو پس کیوں نہیں مانتے تم۔
أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ۝ أَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ	کیا پس دیکھا تم نے جو منی ڈالتے ہو تم کیا تم پیدا
أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۝ (پ ۲۷ - ع ۱۵)	کرتے ہو اس کو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟
أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنْتُمْ	کیا پس دیکھا تم نے جو بوتے ہو کیا تم کھیتی کرتے ہو
تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ (پ ۲۷، ع ۱۵)	اس کو یا ہم کھیتی کر دیتے ہیں؟

ان آیات بینات سے اللہ تعالیٰ کی صفت رُبُوبیت کا ظہور ثابت ہوتا ہے جو اس کے فعل کے مترادف ہے۔ صفت بالفعل کا ظہور رائی الخلق ہے جو محدث اور تغیر کا محل ہے اور باوجود اسفل اور مذموم ہونے کے قابلِ ستائش بھی ہے۔ کیونکہ ہر تقسیم، ہر نوع علم، ہر ظہور بلکہ معرفت کا سبب ہے اور مولیٰ کریم کا مقتضیٰ اس حدث سے حصولِ علم اور عُرف ہے تاکہ اس حدث اور نزول سے عرُوج کی طرف فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہ کا سبق حاصل کرے اور حدث سے قدم کو پہچاننے کے لیے توفیق من اللہ کے راستہ مقصُود کو پہنچے، بندہ اور اللہ جلّ شانہٗ کے درمیانی علم کا عُرف حاصل کرے۔

اسفل سے لے کر اعلیٰ تک اور اعلیٰ سے ذات پاک تک جس مقام یا جس محل میں بفضلہٖ تعالیٰ مقیم ہوگا اس کی توحید فی الذات کی حقیقت اس پر عیاں اور منکشف ہوتی جائے گی۔ یاد رہے کہ عالمِ موجودات سے عالمِ محسُوسات اور عالمِ محسُوسات سے عالمِ معلومات اور عالمِ معلومات سے عالمِ معروفات تک مشیت ایزدی اور اس کے فضل سے رسائی ہوتی جاتی ہے، اس سے آگے انسان کی رسائی نہیں ہے۔ ہاں جس کو چاہے اپنی کمال عنایت سے عالمِ قدس کے پرتو سے محو کر دے۔ ایسے شخص کی نظر میں ادنیٰ مقام سے اعلیٰ تک، اسفل سے ارفع تک کا کوئی حجاب نہیں رہتا۔ اس کے علم و دانش میں توحید باری تعالیٰ کا عرف فی الخلق، فی السّر اور فی الذات ہو جاتا ہے اور صفات کا فرق ذات سے اور حدث کا قدم سے، فعل کا فاعل سے فرق کا تمیز ہو جاتا ہے۔ تب عارف اور توحید کا تاجور ہوتا ہے۔ پس ایسا شخص معلم التوحید، صاحب طریقت اور قابلِ تعلیم ہوتا ہے۔

توحید میں تعلیم

دو وجہ پر ہے: ایک منقولی، اور دوسری حالی۔ منقولی توجیسا اوپر گزر چکا ہے محض توحید پر ظن ہوا کرتا ہے۔ جو عوام الناس کے لیے سوائے سادگی کے کچھ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ اور اس علم الیقین کے میدان میں علم و دانش کی دوڑ سوائے خطا کے کوئی اصل نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس میں جو کچھ بھی ہم کریں گے وہ خود وہم ہی ہوں گے۔ اور یہ توحید کے راستہ میں بہت بڑا حجاب ہے۔ بمصداق ؎

تا نیفتادم ندیدم کعبۂ مقصُود را

درمیان ما ہمیں استادگی دیوار بود

یہی وجہ ہے کہ فرمان مولیٰ کریم ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی توضیح کو اپنے علم و عقل کے ڈھانچہ میں ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہو گئے ہیں یعنی کہ ”خداوند تعالیٰ کرسی پر بیٹھے ہیں اور کرسی چرچر کرتی ہے، اور وہاں سے ہر جگہ ناظر ہیں۔ اور اپنے علم کی قدرت سے سوائے ذات کے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہیں“۔ گویا ہر نشیب و فراز، نشست و برخاست، نزول و عروج، فراغت و شغل بلکہ تغیر و تبدل کو اس بے مثال کے لیے اپنی مثل روا رکھا ہے۔ اور یہ محال ہے۔ کیونکہ اگر اسی طرح مان لیا جائے تو ایمان کے راستہ میں ایسی مشکل واقع ہوگی جس سے عبور کرنا ناممکن ہو جائے گا اور بُت پرستی و خدا پرستی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ اِعْتِقَادٍ سِوَی اللّٰہ۔ اور وہ اس طرح کہ لامکان کے لیے مکان و جہت، حرکات و سکنات اور مثل خلق کے جسم تصور کرنا پڑے گا۔ حالانکہ وہ ذات پاک ان عوارضات سے بلند و برتر ہے اور یہ صفات

اس لایزال کے لائق نہیں ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔

دوسری تعلیم حالی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم وعائین فاما احدهما فبثثته فیکم واما الاخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم یعنی مجری الطعام رواه البخاری (مشکوۃ ۔ کتاب العلم) یعنی فرمایا (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے) کہ محفوظ کیں (یاد کیں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو تھیلیاں (علم کی) ایک کو میں نے پھیلا دیا تم میں اور دوسری اگر میں پھیلاؤں اس کو تو میری رگ گردن کاٹ دی جائے

گویا یہ علم اظہار کے قابل نہیں ہے اور اس کی تعلیم حالی طور پر روا ہے نہ کہ قالی اور اس کا حاصل کرنا فرض عین ہے۔ بمصداق اقوال بزرگاں کہ "حال کی تقلید حرام ہے"۔ کیونکہ سوائے حال کے حال کی تقلید تصنع ہوتی ہے اور اپنے اقوال اور خیال میں کذب۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ یہ علم حجت ختم کرنے والا ہے۔ اور جو علم نفع دینے والا ہے وہ انسان کے قلب سے وابستہ ہے۔ "علم درسی نہ بود، در سینہ بود"۔

علمِ انوار است در جانِ رجال نے ز راہِ دفتر و نے قیل و قال
علم در سینہ بسینہ آمدہ علم بے کینہ خزینہ آمدہ!

یہ من اللہ صدر مبارک نبی اُمّی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تفویض کیا گیا، جو سلسلہ وار سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور تا قیامت اسی طرح سینہ بسینہ چلا جائے گا۔ اس سے نسبت رکھنے والے کم و بیش حصول سے مسرور ہیں، اور دوسرے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ کی وجہ پر جھٹلانے والے اور اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ کے مطابق انکار کرنے والے محروم۔

اے عزیز! حصول اس کا محض فضل ایزد متعال پر منحصر ہے لیکن اس پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ ورنہ دارین میں رسوائی کا باعث ہے۔ بمصداق

اگر حاصل نباشد ہم یقیں را مدہ از دست ورنہ از جوئے
نداری گر یقیں انکار حق است یقیں داں بر دلت ظلمت فزودے

جاننا چاہیے کہ جس طرح ظاہری علوم کے لیے اُستاد کی ضرورت ہے، اسی طرح اس علم و دانش کے لیے بھی استاد کی ضرورت اور حاجت ہے۔ ظاہری علم کی ابتدا ا۔ ب، ت سے ہوتی ہے جس کی انتہا معقول و منقول تک کا حصول ہے لیکن اس علم و دانش کے لیے حروف و الفاظ اور عبارت کی احتیاج نہیں ہوتی ہے۔ ہر علم کا حصول من اللہ ہے لیکن اس علم کا حصول ہی اللہ جلّ شانہٗ ہے جس سے مقصود معرفت الٰہی اور مشاہدۂ لامتناہی ہے۔ اس لیے عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کلام الٰہی اور ذات معلّیٰ کی صفت بالذات ہے جس کا ظہور کاغذ، حروف اور الفاظ کی صورت میں عیاں ہے۔ قرات کے لحاظ سے یہ سب اسباب کلام ہیں لیکن معانی انوار کے مصداق ہیں۔ اور یہ اختلاف بمصداق قول بزرگے

علم گر بر تن زنی نارت کند
علم گر بر دل زنی نورت کند

کے موافق ہے جو ہمارے عارضہ کی وجہ پر ہے۔ ورنہ ظاہری و باطنی معنوں سے پُر اسرار قرآن حکیم اظہر من الشمس ہے۔ صاحب حال ظاہری اور باطنی معنوں سے حسب استعداد واقف

ہوتے ہیں اور ظاہری علما، صرف ظاہر پر رہ جاتے ہیں، اس لیے حقائق الٰہیہ و معانی کی حقیقت میں خطا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس علم و عرف کے حصول کے لیے عارف باللہ کی ضرورت ہے جس کے سوا یہ حل ناممکن ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ
وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ	درمیان ان دونوں کے ہے بیچ چھ دن کے پھر
اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ	قرار پکڑا اوپر عرش کے۔ وہ رحمٰن ہے پس سوال
فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ۝ (پ۱۹ - ع۳)	کر اس کا کسی باخبر سے۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے لیے اور اختلاف کو مٹانے کے لیے کیا ہی بہتر فیصلہ فرمایا ہے کہ اگر اس مالک حقیقی کے عرف سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی خبر والے سے دریافت کرو۔

یوں تو کئی دفعہ مختلف مقامات پر ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ کا ذکر آ چکا ہے لیکن اس جگہ ایسی تفصیل سے ارشاد واضح ہے کہ کوئی دقیقہ فروگذاشت ہی نہیں رہا۔ یعنی زمین و آسمان و مابینہما کا بنانا اور پھر استویٰ علی العرش کا ذکر فرما کر اَلرَّحْمٰنُ کے ارشاد کے بعد فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا کا حکم کرنا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ یہ علم و حصول اور یہ عرف و دانش کسی باخبر سے دریافت کرو، صرف دلیل منقولی سے یہ علم حاصل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ یہ معرفت الٰہی ہے، جو حال کے سوا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ نیز یہ روشن امر ہے کہ قرآن شریف خبر ہے نہ کہ خبیر۔ اس علیم و خبیر کی طرف سے امر ہے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ یہ عبارت سوال کرنے کا محل نہیں ہے۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ ان حقائق الٰہیہ کے علم کے لیے صرف یہ تحریری کلام کافی

نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے عینی دلیل کی ضرورت ہے جو خدائی معلموں کے بغیر محال ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ظاہری دلیل معرفت الٰہی میں خطا کے سوا نہیں ہے۔ اور یہی اس غلطی کا سبب ہے کہ عرش معلیٰ کو اپنے قیاس و تصور کے ڈھانچے میں ایک تخت اور اس پر ذات باری تعالیٰ کا قیام، اور وہاں سے زمین و آسمان میں ناظر ہونا قرار دے رکھا ہے۔ جس سے جہت اور مکان لازم آتا ہے۔ تحت اور فوق کے ثبت کی اونچ نیچ میں پڑ گئے ہیں، جو اس ذات پاک کے لائق نہیں ہے۔ شاید انہوں نے وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کو غور سے تلاوت نہیں کیا ہے۔ کیونکہ جب کرسی مقدس کی وسعت زمینوں آسمانوں سے زیادہ ہے، اور عرش معلیٰ اس سے بھی وسیع تر، تو پھر مکان اور جہت و قیام کس بنا پر اور کہاں درست ہو سکتا ہے؟

کرسی کا بیان تفسیر دُرِ منثور میں ہے کہ "فریابی اور عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور دار قطنی اور طبرانی اور ابو الشیخ اور بیہقی اور خطیب نے نکالا ابن عباس سے کہ انہوں نے کہا کرسی وضع قدمین ہے اور عرش کا اندازہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کو حاکم نے بھی نکالا اور صحیح بتایا۔

اور روایت کیا ابن جریر اور ابو الشیخ اور ابن مردویہ اور بیہقی نے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے نہیں ہیں ساتوں آسمان بہ نسبت کرسی کے مگر جیسا کہ ایک چھلا پڑا ہوا بیچ زمین بیابان کے۔"

بایں ہمہ ان کے لیے ان کا علم ہی حجاب ہو گیا ہے اور اسی اپنے زعم کو معراج کمال سمجھ بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سعی کے قدم کٹ چکے ہیں اور میدان معرفت میں حصول سے محروم ہو چکے ہیں۔ ورنہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کی دولت انسان کے لیے مولیٰ کریم کی طرف

سے جاری ہے اور تاقیامت جاری وساری رہے گی +

توحید پر عمل

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ یعنی معبود تمہارا معبود واحد ہے۔ اس ذات پاک کی عبادت کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

انسان کے لیے عبد کے نقطہ سے بڑھ کر کوئی مدارج نہیں ہے کیونکہ جب تک انسان کا کل فنا نہ ہو جائے، نسبت عبودیت جو عبد کو معبود کے ساتھ مخصوص ہے صحیح نہیں ہو سکتی۔

دریائے دجلہ میں ایک اللہ کا بندہ یعنی عبداللہ بے کس و بے بس غرق ہوا جا رہا تھا کنارہ پر سے ایک شخص نے اس کو پکارا کہ "اے بندۂ خدا! تو چاہتا ہے کہ میں تجھ کو کنارہ پر کھینچ لاؤں؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیا تو ڈوبنا چاہتا ہے؟ کہا نہیں۔ بولا، کیا اسی حال میں بہا جانا چاہتا ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔ آخر اس شخص نے ان کو باہر نکال لیا اور پوچھا کہ یہ تیرا کیا حال ہے؟ فرمایا کہ میں اللہ جل شانہٗ معبود یکتا کا بندہ ہوں اور بندہ کو چاہنے سے کیا واسطہ؟"

اے بھائی! عوام کے نزدیک عبادت اطاعت ہے، جو کسی حد تک درست ہے۔ لیکن اطاعت کئی نوع پر منقسم ہے۔ جو عبودیت کے میدان میں سوائے فرماں برداری کے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور وہ اس لیے کہ عبد سے اطاعت کا ہونا لازمی امر ہے۔ اور اطاعت سے عبد کا ہونا ضروری نہیں۔ اطاعت میں کسی حد تک اختیار ہوتا ہے، لیکن عبدیت میں مشیت ایزدی کے تصرف سے اختیار محو ہو جاتا ہے اور فاعل حقیقی کا فعل ایسے شخص کے ضمیر میں اضافیہ کا حکم رکھتا ہے، اور

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی معبود حقیقی کی حقیقت عبد کے لیے واحد ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ طوعاً و کرہاً سب کی سب مخلوق بندہ ہونے کی حیثیت سے بے اختیار ہے لیکن انسان کا معاملہ مولیٰ کریم کے ساتھ خاص ہے۔ عوارضات کی وجہ سے حالات کے رو پر سخت اختلاف ہے۔ عوام کا حال اور طرح پر ہے، صاحب قال کا اور طرح اور صاحب حال کا اور۔ عوام کا ایمان باوجود نادانی کے نہایت مضبوط، بلا دلیل، بحث و تنقید سے پاک، اعلیٰ فوقیت رکھنے والا، بے باک، مائل بمشاہدۂ صنعت اور عمل کے لحاظ سے رجا اور خوف کے پردوں میں پرورش پانے والا ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب قال، "قال اللہ و قال الرسول" کو دلیل پکڑنے والے اور علم و دانش ظاہری سے توحید اور اس پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس میدان دلیل میں دو گروہ مختلف ہیں ایک تو جواز سبیل اور وسائل یعنی اسباب من اللہ کے قائل ہیں، اور دوسرے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سبیل و وسیلہ اور اسباب کے قائل نہیں ہیں۔ اور یہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ظہور ذات سبحانہٗ بھی سوائے اسباب کے نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ظہور کے لیے اس عزیز الحکیم نے اسباب کو لازم کیا ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر مقام میں اُسی مقام کے مطابق تعلیم ہوا کرتی ہے۔ صاحب اسباب کو مسبب کی طرف سوائے اسباب کے چارہ نہیں ہے۔ گو ہر فعل کو اس فاعل حقیقی نے اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ لیکن اسباب کو دلیل یعنی رہنما کے لقب سے نامزد کیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس

وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ (پ ۱۹ - ۴)

طرح دراز کرکے پھیلاتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھیرا رکھتا۔ پھر ہم نے اس پر سورج کو راہنما بنایا۔

اسی طرح سورۂ فیل میں فعل تو اپنا فرمایا لیکن ابابیلوں کو ملازم اور دلیل ٹھیرایا۔ اور اس قسم کی بہت سی آیات کلام مجید میں مذکور ہیں۔ لیکن باوجود ان دلائل فصیح و بلیغ اور آیات بینات کے منکرین کے سر پر توحید کا ایسا بھوت سوار ہے کہ سرسام توحید نے ہوش وحواس کو باقی رہنے ہی نہیں دیا ہے' اور بلا سوچے سمجھے حق وناحق دونوں کا انکار کر دیا ہے۔ مثلاً شاہ اسمٰعیل صاحب دہلوی اپنی تصنیف "صراط مستقیم" میں رقم طراز ہیں:

"..... یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے' خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے۔ ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔"

اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا یا خود بخود ان کاموں کی طاقت سمجھنا تو واقعی شرک ہے۔ کلام تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذی ہوئی طاقت کے انکار میں ہے۔ خدا جانے نص قطعی کو غور سے مطالعہ نہیں کیا ہے' یا اس کے معانی میں تدبر وتعمق کو کام میں نہیں لاتے ہیں۔ ورنہ یہ عبارت اور اس کا حکم سراسر فرقان الحمید کے خلاف وارد ہو رہا ہے۔ جو سراسر جہالت پر دال ہے۔

حضرت جمال الدین صاحب کیلانی قدس سرہٗ اپنے بیاض شریف میں فرماتے ہیں کہ ابلیس لعین نے دو گروہوں کو جدھر ان کے نفس کا میلان پایا ہے دھوکا دیا ہے۔ حضرات شیعہ کو محبت اہل بیت اور آل اطہار کا دھوکا دیا ہے' اور وہ نہیں جانتے کہ محبت کیا ہے اور اس کا عمل کس طرح ہوا کرتا ہے۔ اور محبت کے اصل اور حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور حضرات وہابیہ نجدیہ کو

توحید کا دھوکا دیا ہے' اور وہ نہیں جانتے کہ توحید کس کو کہتے ہیں اور اس کی حقیقت سے ناشناسا اور اعمٰی ہو رہے ہیں"۔ حدث اور قدم کا فرق نہیں کر سکتے، ذات اور صفات کو نہیں جانتے اور اس کے اصل اور فرع کو نہیں پہچانتے۔ ورنہ معاملہ کی صحت کے اسباب اور انکشاف حقیقت کے سندات اظہر من الشمس ہیں جو صاحب حال کے عمل کے مترادف ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ ۝ (پ - ۵)

اور جب تو مٹی سے پرندکی سی صورت میرے حکم سے بناتا پھر اس میں پھونک مارتا تو وہ میرے حکم سے اڑنے لگتی۔ اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے شفا دیتا، اور جب تو میرے حکم سے مُردوں کو زندہ نکالتا۔

اب نور ایمانی کے ترازو میں وزن کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ مُردہ کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو بحکم خدا اچھا بھلا کر دینا اور خصوصاً مٹی کا جانور یعنی بُت بنا کر اس میں پھونک مارنا' جو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بُت بنانے اور اس میں نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فاعل حقیقی کے فعل کے مترادف ہے۔ بلکہ بالکل مماثلت معلوم ہوتی ہے جو قطعاً ناممکن اور حرام ہے۔ ظاہری صورت حال سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولیٰ کریم کا حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے بُت بنا کر اس میں رُوح پھونکنے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بھی اسی طرح مٹی سے بُت بنا کر اُس میں نفخ رُوح کرنے میں مماثلت واقع ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بُت بنانا اور رُوح کا پھونکنا باذن اللہ تعالیٰ تھا۔ اور دراصل

عیسیٰ علیہ السلام کا فعل فعلِ خداوندی تھا جس سے مماثلت کو کوئی نسبت نہیں۔ مماثلت تب ہوسکتی ہے کہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام کی مثل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اذن بھی کسی شخص کی طرف وارد ہو، اور یہ محال ہے۔

اس تصرف یا طاقت کو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی طاقت کا نتیجہ یا خداوند تعالیٰ کی دی ہوئی ہمت کا مظہر سمجھیں؟ یا دونوں صورتوں کو کفر اور شرک جانیں؟ جیسا تصرف فی التوحید منکرین کی زبان سے اوپر گزر چکا ہے؟ کس چیز پر اعتقاد رکھیں۔ شخصی تقلید کو حرام سمجھتے ہوئے ایک شخص کی رائے کو مقدم رکھیں؛ یا فرمانِ الٰہی کو فوقیت اور ترجیح دیں جو قرآن مجید میں بالکل عیاں اور لَا رَیْبَ فِیْہِ کا تاج سر پہ لیے کھڑا ہے؟ اور صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام باذن اللہ تعالیٰ یہ کام کرتے تھے۔ اور ہر ایک کلمے کے ساتھ اپنے امر یا اذن کو (جو فاعلِ حقیقی کے فعل کی شہادت پر دال ہے) لازم رکھا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ذات پاک نے اپنے کمال لطف سے اپنے بندہ کے ضمیر میں اپنی قدرت اجازت کو جاری رکھا ہے، اور قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے مترادف رُوح اللہ کے خطاب سے مزین فرمایا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ شرک ایک ناقابلِ عفو جرم اور ظلمِ عظیم ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ — بیشک اللہ نہیں بخشتا یہ کہ شریک لایا جائے

یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ — ساتھ اس کے۔ اور بخشتا ہے سوائے اس کے

(پ۵ - س ۴) — واسطے جس کے چاہتا ہے۔

یوں تو شرک کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن قرآن شریف کے رُو سے اصل الاصول کے لحاظ سے تین وجہ پر بیان ہے: (۱) شرک فی الذّات (۲) شرک فی الصّفات اور (۳) شرک فی العبادت۔

شرک فی الذّات، یہ کہ اُس ذات اَحَد و صَمَد کے لیے کوئی اُوپر، نیچے یا برابر کا رشتہ روا رکھنا۔ جیسے ماں، باپ اور بیٹا، بیٹی یا بھائی بہن وغیرہم۔ جیسا کہ یہودیوں نے حضرت عُزیر کو اور نصارٰی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور حضرت مریم علیہا السلام کو اس کی بیوی قرار دیا: قَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ۔ تو فرمایا کہ سُبْحٰنَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ۔ اور فرمایا اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ یعنی کہ پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اُس کے لیے بیٹا۔ اور کیسے ہو اُس کے لیے بیٹا حالانکہ وہ بلند و برتر بیوی سے بھی منزہ ہے۔ بلکہ اس قسم کے تمام فاسد اور باطل عقائد سے پاک کرنے کے لیے اپنے کلام پاک میں نہایت جامع کلمات سے یوں تعلیم فرمائی:

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ — کہو (اے میرے حبیبؐ) وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ

لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ — بے احتیاج ہے۔ نہیں جنا اس نے، اور نہ جنا گیا۔

کُفُوًا اَحَدٌ ۔ (پ۳۰ - س ۴۷) — اور نہیں ہے واسطے اس کے برابری کرنے والا کوئی

شرک فی الصّفات، یعنی اس خالق یکتا کی صفات میں کسی مخلوق کو اس کے برابر سمجھنا، یا کسی مخلوق میں بغیر اس مُعطی کی عطا کے از خود ذاتی طور پر کوئی تھوڑی یا بہت طاقت جاننا۔ یا اس بے مثل و بے مثال لم یزل ولایزال کی کسی ایک صفت میں کسی کے لیے اس سے مماثلت روا

رکھنا۔ جیسا کہ فرمایا: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔

شرک فی العبادت یعنی سوائے اس رب العالمین اور الہٰ واحد کے کسی اور کی عبادت کرنا چنانچہ فرمایا ہے: وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔

اس کے سوا ہر قسم کی استمداد اور نصرت کا جواز ہے جس کا اثبات تعلیمًا اور عملًا قرآن مجید میں موجود ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — اور تم کو کیا ہوا ہے کہ (موذی اور ظالم لوگوں سے)
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ — خدا کی راہ میں اور ان بے چارے مردوں اور عورتوں
النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ — اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کرتے ہیں کہ
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ — اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کر کہیں اور جگہ لے جا
الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ — کہ یہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے کسی
لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ — کو ہمارا حامی بنا، اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار
نَصِيْرًا ۝ (پ ۵ - ع ۷) — بنا کر بھیج۔

قابل غور امر یہ ہے کہ وہ بے کس اور بے یار و مددگار قادر مطلق سے امداد و نصرت کے لیے کسی حامی و مددگار کو طلب کرتے ہیں۔ چاہیے تھا کہ وہ غیر خدا کی مدد مانگنے کے سبب سے خطاوار ٹھیرائے جاتے، اور ان کو وعید کی رو سے تنبیہ کی جاتی اور ان کی مدد بھی نہ کی جاتی، اور نہ ہی کسی کو ان کی حمایت و نصرت کے لیے حکم صادر کیا جاتا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے ان بے کس و لاچار مرد، عورتوں اور بچوں کی التجا تو کئی معنوں پر محمول کی جاسکتی ہے

لیکن نبی مرسل، پیغمبر اولوالعزم، صاحب اعجاز، تمام مخلوق سے برتر، تمام بنی نوع انسان سے برگزیدہ، اسرار الٰہیہ کے حامل، صاحب معارج و مدارج، خلقت کے حامی و رہنما، دین اسلام کے پیشوا تو ان عوارضات سے مبرا و منزہ تھے۔ بایں ہمہ جب مخالفین کے غلبہ سے مجبور ہوئے اور ان کے مقابلہ میں نصرت چاہی، تو یوں پکار اٹھے:

مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۝ (پ ۳ - ع ۱۳) — کون ہے اللہ کی طرف سے جو میری مدد کرے؟

تو ان کے حواریوں نے جواب میں عرض کیا: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم مددگار ہیں اللہ کے)۔

تو ایسا فعل جو شرک کا مقتضی ہو ایک اولوالعزم مرسل سے صادر ہونا محال ہے۔ بلکہ مرسلین کی نسبت ایسا گمان کرنا بھی سوء اعتقادی اور جرم ہے۔ لہٰذا ماننا ہی پڑے گا کہ یہ سنت اللہ جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گی۔

اے عزیز! خداوند کریم اپنے فضل سے تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، صحت حال اس امر میں اس طرح پر ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سرتاپا شرک ہے لیکن فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جائز بلکہ دین ہے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں یا صاف معنوں میں اللہ جل شانہٗ کے لیے ہر سعی اور کوشش سے مستعد ہونا ہے۔ اور من دون اللہ سے مقصود اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی غیر سے استمداد یا کسی بت سے استعانت ہے اور یہ شرک اور حرام ہے۔ اور فی سبیل اللہ مطابق فرمان مولیٰ کریم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ — اے لوگو جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور
ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا — ڈھونڈو طرف اس کے وسیلہ اور جہاد کرو بیچ راہ
فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (پ ۶ ع ۱۰) — اس کے کے تو کہ تم فلاح پاؤ۔

اور یہ بہر حال دو وجہ پر منقسم ہے۔ اعلیٰ ہستیوں کو ادنیٰ کی طرف اور ادنیٰ کو اعلیٰ کی طرف سبیل الی اللہ ہوا کرتی ہے۔ یعنی اُمت کو انبیا و مرسلین کی طرف خدمت کی رُو سے مال و جان کے جہاد کی وجہ پر، اور مرسلین کو تعلیم احکام اور فیض و روحانیت کی رُو سے مشاہدہ لقاء اور قرب خداوندی کی وجہ پر۔ جیسا اوپر گزر چکا ہے کہ بظاہر حفاظت کے لیے حواریوں سے حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کا فرمانا مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ یعنی کون ہے جو مدد کرے میری فی سبیل اللہ؟ اور ان کا حسب توفیق جواب دینا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ یعنی ہم مددگار ہیں فی سبیل اللہ۔ جیسا کہ خداوند کریم ذوالجلال والاکرام فرماتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ — اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر مدد کرو گے تم اللہ کی، تو
یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (پ ۲۶) — کرے گا وہ تمہاری اور ثابت رکھے گا قدموں تمہارے کو

اور یہ مسلّم امر ہے کہ خداوند کریم کسی کی مدد سے مستغنی ہیں۔ اور خدا کی مدد کسی وجہ سے روا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ مدد فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو اسلام اور دین میں انبیاء و مرسلین کی مدد کرتا ہے، درحقیقت وہ خدا کی مدد کرتا ہے۔ اور جو کچھ اس کو انبیاء و مرسلین سے فیض و برکت کی وجہ پر پہنچتا ہے، در اصل اللہ کریم ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا فیض وہی روحانیت کے کرشمے اندھے مادرزاد اور کوڑھی وغیرہ کو اچھا بھلا کر دینا اور تعلیم روحانیت اظہر من الشمس ہے۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ نص صریح سے اعلیٰ کو ادنیٰ سے بظاہر طاقت سے اور ادنیٰ کو اعلیٰ سے باطن ہمت سے استمداد و اعانت عمل کے میدان میں ثابت ہو چکی ہے۔ ہر طاقت

بظاہر اور ہمت باطن من اللہ ہی ہے، اور اس کے سوا سمجھنا انکار حق ہے۔ خواہ آزمائش کے میدان میں بشری توفیق سے جس کو اپنے زعم میں اپنی طاقت خیال کریں یا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کی وجہ سے اضافیہ تصرف خداوندی کا مظہر سمجھیں، سب کا سب من الحق ہی ہے جو فاعل حقیقی کے فعل کا نتیجہ ہے۔ بعض کو اپنے بندوں میں سے ایسا خاص کیا ہے کہ ان کے ارادے ان کے ضمیر میں باقی ہی نہیں رہتے۔ کوئی فعل سوائے امر الٰہی کے ان سے سرزد نہیں ہو سکتا ان کا کل فنا ہو چکا ہوتا ہے۔ ان کی بشریت صفات الٰہیہ سے متصف ہو جاتی ہے۔ مولیٰ کریم نے ان کو اپنے کام کے لیے تنہا کیا ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے اپنے علم سے بہرہ ور کرے، جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سا کوئی علم نہیں رکھتا۔ بعض نے کہا ہے کہ صرف دل میں خیال ہی گزرا تھا تو حکم ہوا کہ جاؤ میرے ایک بندے سے جا کر ملو اور علم سیکھو۔ قرآن مجید سورۃ کہف میں اس کا مفصل مذکور ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت سا سفر طے کرنے کے بعد مجمع البحرین پر پہنچے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کر کے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، کیونکہ یہ معاملہ آپ کے حیطہ علم سے باہر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو صبر کا یقین دلایا اور دونوں چل پڑے

حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا — حتیٰ کہ جب دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے (تو خضرؑ نے)
قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ — اس کو پھاڑ دیا۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کیا تو نے اس کو اس لیے
جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ — پھاڑ دیا کہ اس کے سواروں کو غرق کرے؟ تو نے یہ ایک

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝	بھاری کام کیا۔ (خضرؑ نے) کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ
(۱۸: ۷۱-۷۲۔ پ۱۵۔ ع۲۲)	تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بُھول کا عذر کیا تو پھر دونوں چل پڑے چنانچہ فرمایا ہے:

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا	پھر چلے دونوں، یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے
فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً	پس مار ڈالا اس کو۔ کہا کیا مار ڈالا تو نے ایک جان پاک
بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا	کو بغیر بدلے جان کے۔ البتہ تحقیق لایا تو چیز بڑی۔
نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ	کہا (خضرؑ نے) کیا نہ کہا تھا میں نے تجھ کو یقیناً تو نہیں
لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ (۱۸: ۷۴-۷۵)	کر سکے گا میرے ساتھ صبر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا اگر اب بھی میں صبر نہ کر سکا اور آپ سے کچھ پوچھ بیٹھا۔ تو بیشک آپ مجھے ساتھ نہ رکھیے گا۔ کیونکہ میری طرف سے عذر پورا ہو جائے گا۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ	پھر دونوں چلے۔ حتیٰ کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے
﴿نِ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ	پاس آئے اور ان سے کھانا مانگا۔ انھوں نے ان کی مہمانی
يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا	سے انکار کیا۔ پھر پائی ان دونوں نے اس (گاؤں) میں
يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ	ایک دیوار کہ گرا چاہتی تھی۔ پس (خضر علیہ السلام نے) سیدھا کھڑا کر دیا
شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ	اس کو۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا اگر چاہتا تو البتہ لیتا اس (کام) پر
هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ (۱۸: ۷۷-۷۸)	مزدوری۔ کہا (خضر علیہ السلام نے) یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان

مدعا اس سے یہ ہے کہ ناحق کشتی کا پھاڑنا اور بے گناہ لڑکے کا قتل کرنا، اور بلا وجہ ایک دیوار

کا کھڑا کرنا سب بظاہر شرع شریف کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام صبر نہ کر سکے۔ اور کرتے بھی کیسے جب تک اُن کو ان اسرار سے مطلع نہ کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون شریعت کے رُو سے سراسر حق پر تھے، لیکن ایسے شخصوں کے لیے بظاہر شریعت کی قید نہیں رہتی ہے۔ دراصل شریعت ہمارے لیے کسی حد کی پابندی کا نام ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظام عالم کی درستی کے لیے من اللہ مقرر کی گئی ہے۔ مگر ایسے شخصوں کے لیے شریعت بھی الگ ہوا کرتی ہے۔ شریعت ہرچند اوامر و نواہی کے احکام کی ادائیگی کے سوا نہیں ہے اور ایسے شخصوں کا کوئی فعل بھی اپنے ارادہ سے نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہ مامور[1] من اللہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ان تینوں امور کی علت و تاویل بیان کرنے کے بعد فرمایا وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ۔ یہ سنت اللہ جاری ہے اور تا قیامت جاری اور ساری رہے گی کہ ہر کام میں اس کا رہنما اور پیشوا بنایا جائے اور ہر محل و مقام میں اسی کے موافق تصرف من اللہ ہو۔ ورنہ دست غیب سے کشتی کا پھاڑنا اور بلا وجہ لڑکے کی رُوح اپنے حکم سے قبض کر لینا

[1] تعریف مامور: جاننا چاہیے کہ مامور کا ترجمہ ہے امر کیا گیا۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ایسے عباد اللہ کا کوئی امر شریعت غرا کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ عوام شریعت سرشتی توفیق جن کے دو رُخ شر و خیر کے مقتضی ہیں، ضروریات نفسانی و روحانی کے پورا کرنے کے لیے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے واسطے حدود مقررہ ہوتی ہیں جس پر انسان عمل کر سکے اور کسی امر میں تنگی واقع نہ ہو۔ لیکن مامور کے لیے امر الٰہی کے بغیر کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔ نفسانیت کو جڑ سے اکھیڑ کر رُوحانیت کا شجر ان کے وجود باجود میں نشو و نما پاتا ہوا ثمر سے بار آور ہو جاتا ہے۔ جیسا قرآن مجید میں صاف ذکر ہے کہ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ یعنی میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیے ہیں بلکہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس لم یزل ولایزال کی طرف ہی سے ہے۔ ایسی ہستیوں کو مولیٰ کریم نے اپنے

کام کے لیے تیار کیا ہے اور اس

اور ایسے ہی بغیر اسباب کے دیوار کا کھڑا کر دینا بعید از قدرت نہ تھا۔ اور یہ سراسر حال ہے جس کی تقلید قطعاً حرام ہے۔

طبقۂ جُہلا جو حال سے قطعاً کچھ نسبت نہیں رکھتے اور اسرار الٰہیہ سے ان کو کوئی نصیب نہیں ہوتا، شریعت غرا کے خلاف (جو بلا شبہ اس عمارت کی بنیاد ہے) اپنے زعم میں مدارج و معارج کے بالاخانے میں جاگزیں ہونے کے مُدعی وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ کے مطابق محض اپنی خواہشات سے مامور بن بیٹھتے ہیں۔ ماموریت کا حال تو درکنار اس کے معانی تک کے واقف نہیں ہوتے۔ محض میدان شریعت اور فرماں برداری کی حد سے تجاوز کرنے کو معیار عشق الٰہی قرار دے رکھا ہوتا ہے۔ حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش قدس سرّہٗ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ "جو شریعت کے حکموں کو فنا کرے، لوگوں کے نزدیک ولی ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک وہ شیطان ہے"۔ اس زمانہ میں حضرتنا و مولٰینا نے مطابق حال یوں ارشاد فرمایا ہے: کہ "آج کل تو مطابق فرمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخیر زمانہ آئے گا، اندھا اندھیر پڑ جائے گا، معاملہ بالکل اصل کے خلاف ہو گیا ہے"۔ نہ صرف نافرمان بدعتی اور خلاف احکام اللہ و رسول ہی حق سے انکار کرنے والے ہیں، بلکہ میدان شریعت میں عمل کے لحاظ سے اس قدر تفاوت ہو چکا ہے کہ معانی اصل کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ فقہ کا انکار کرنے والے اہل حدیث ہونے کے دعویٰ دار ہیں، اور حدیث شریف کے منکر اہل قرآن کہلاتے ہیں، اور قرآن مجید سے برطرف جانے والے "مومن" اور اللہ و رسول کے برخلاف چلنے والے اور تمام حدود شرعی کو توڑنے والے ولی۔ الاماں۔

مقصود اس بیان سے یہ ہے کہ مامور من اللہ شریعت غرا کے خلاف نہیں ہوتے بلکہ ان کا ہر فعل دراصل شریعت یعنی امر الٰہی کے موافق ہوا کرتا ہے۔ ان کے ارادے ان سے اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی فعل بھی امر خداوندی کے سوا نہیں ہوتا ہے جیسا اوپر گزر چکا ہے۔

اعتقاد فی التوحید

اعتقاد دراصل کسی چیز پر ایقان یعنی ایمان رکھنا ہوتا ہے۔ اور اس جگہ اعتقاد فی التوحید سے مراد اللہ جلّ شانہٗ کی وحدانیت پر ایمان کے سوا نہیں ہے، جو دو حصوں پر منقسم ہے۔ اوّل ظن، دوسرا رویت۔ ظن کا مثبت دلیل تک ہے اور رویت کا انحصار حقیقت پر۔ شرع شریف کے حکم سے اس لم یزل و لایزال، بے مثل و بے مثال، قادر ذوالجلال والاکرام کی ذات پر مع صفات اتم کے ایمان یعنی ایقان رکھنا اعتقاد فی التوحید کی دلیل ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ توحید فی الذات بالظہور الآن کما کان کی مقتضی ہے جس کے علم و حال سے نہ کوئی واقف ہوا اور نہ ہی ہو گا۔ کیونکہ یہ تصدیق بالحال ہے جو الی الخلق مردود ہے۔ جیسا صفحہ نمبر ۱۵۴ پر مفصل بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا توحید فی السرّ ہے، جو روحانیت یعنی عالم ارواح کے میدان میں ظہور اسرار رکھتی ہے۔ تیسری توحید فی الخلق ہے جس کا ظہور تمام موجود ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مولیٰ کریم کی صفات دو وجہ پر عیاں ہیں۔ اوّل صفات بالذات

جیسے حیّ، قدیر، سمیع، بصیر، علیم، کلیم، مرید۔ یہ صفات بالذّات ہیں جن کو ذات معلّٰی سے ایسا اتحاد ہے جو کبھی منفک نہیں ہو سکتا۔ عقائد نسفی والوں نے ذات اور صفات میں تعدّد کے خوف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلا وجود برزخ کو روا رکھا ہے۔ ورنہ دراصل یہ صفات تابع ذات محض ذات ہی ہیں۔ دوسری صفات بالفعل ہیں جن کا ظہور الی الخلق ہے۔ جیسے خالق، رازق، رحمٰن، رحیم، کریم، حکیم، غفور، ستار، جبار، قہار وغیرہا۔ گو مخلوق میں سے حضرت انسان کو خداوند کریم نے مطابق فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ الآیۃ اپنی صفت یعنی سرشت پر تخلیق کیا ہے، اور صفات ذاتیہ سے اس کو ایسا اتحاد ہے جس کی تمیز محال ہے۔ تاہم تخلیق کے میدان میں اپنے مقام و محل کے رو سے صفت بالفعل ہی کے مترادف ہے۔ مخلوق حدث کا محل ہے اور ذات باری تعالیٰ قدیم۔ اس عزیز الحکیم کی قدرت کاملہ کا ظہور اور علم و تقسیم اسی اسباب حدث سے وابستہ ہے۔ کیونکہ قبل ازیں عالم امر کے میدان میں سوائے انبیائے کرام کے کوئی علم نہیں رکھتا تھا۔ اور اس علیم و خبیر کی خبر کے بغیر آج بھی اس سے جاہل ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جو اپنے سے جاہل ہو وہ اپنے غیر سے اجہل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اعتقاد فی التوحید میں اسلام کے احاطہ میں دو گروہ ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب حال ہیں جن کو بفضلہٖ تعالیٰ حسب استعداد رویت نصیب ہے اور وہ عارف باللہ ہیں۔ دوسرے محض ظن کے ٹٹو پر سوار تنقید کے دریا میں ظاہری دلیل کے بھنور میں غوطہ زن ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ دلیل ظاہری محکمات سے ہے جو عوام و خواص کے لیے

از حد ضروری ہے، اور اسی پر مذہب کا انحصار ہے۔ صاحب حال اس دلیل سے عینی دلیل کے مشاہدہ سے تقویت حاصل کر کے مسرور ہونے والے ہوتے ہیں۔ اور محض ظاہری دلیل سے اس لم یزل و لایزال کی ذات معلّٰی میں کلام کرنے والے اکثر خطا کار ہوتے ہیں[1]۔ یہی وجہ ہے کہ خلف وعید کے مسئلہ میں علمائے دین متین سخت اختلاف میں پڑ گئے اور بجائے

ردّ امکان کذب

کر نیکے امکانِ کذب باری تعالیٰ کے قائل ہو گئے۔ معانی اصل کے خلاف کے مقتضی ہوئے اور اس بیان میں کتابیں لکھ دیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ	اور بعض لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ جھگڑا
بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ	کرتا ہے بیچ خدا کے بغیر علم کے اور بغیر ہدایت
مُّنِیْرٍ ۰ (پ۲۱ - ۱۲)	کے اور بغیر کتاب روشن کے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، انسان کی دوڑ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰهِ کے میدان میں عمل کے رو سے عالم امر تک ہے۔ اور یہ عروج اور منازل و مدارج حجاب کے دور ہونے کے سوا نہیں ہے۔ ہر مقام و حال میں ہر انسان ما فی الضمیر کا معائنہ و مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے۔ گو آفتاب حقیقت کی شعاعیں اس کے آئینۂ قلب کو منور کرتی ہیں تاہم وہ اپنے حال کے میدان سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا۔ اس کی مثال اس طرح پر ہے کہ آنکھ

[1] قبل ازیں معرفت کے ضمن میں صفحہ نمبر ۳ پر بیان ہو چکا ہے۔ دوبارہ تحریر کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔

باوجود صحیح وسالم ہونے کے سوائے آفتاب کی ضیاء کے روشن نہیں ہوسکتی اور بغیر اندھیرے کے کچھ نہیں دیکھتی۔ یا یوں سمجھیے کہ باوجود روشنی حاصل کرنے کے جس طرح کی عینک سے آنکھ معائنہ کرے گی ویسی ہی ہر چیز کی رنگت پائے گی۔ جن اصحاب کو بصارتِ قلبی سے حصہ نہیں ہے۔ اور صرف ظاہری دلیل ہی پر ان کا انحصار ہے، اور محض ظن جو معرفت کے میدان میں مطابق کلامِ الٰہی اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ان صاحبان کی غلطی کا سبب یہی ہے۔ وہ موافق وسعتِ انسانی مافی الضمیر ہی کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ان کا ایقان اس کے سوائے نہیں ہے۔ ایسے انسان جو کچھ بھی کہتے ہیں اپنی ہی تعریف کرتے ہیں، اور خدائی صفاتِ ذاتیہ اور فعلیہ کو اپنے ہی معیار پر دلیل پکڑتے ہیں، جو سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ اور یہ اس لیے کہ حادث کو سوائے صفاتِ فعلیہ مولیٰ کریم کے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یعنی حدث کو قدم سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ گو تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کسی محل و مقام سے بعد و قرب کا مقتضی نہیں ہے۔ یہ محل و مقام بُعد و قرب ہمارے ہی عارضہ کی وجہ سے ہے۔ تاہم انسان کو اپنے علم و حال کے سوائے (جو کچھ ماخوذ فی الضمیر رکھتا ہے) کوئی ادراک نہیں ہے۔ معرفتِ الٰہی اور اس میں کلام تو در کنار مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کے حال سے کماحقہٗ علم محال ہے۔ اس کو یوں سمجھنا باعث تصدیق ہوگا کہ ایک شخص کو بخار یا دردِ سر ہے، اور وہ اس میں بے قرار ہے۔ تو معائنہ کرنے والا جو کبھی خود اس کو دردِ سر ہُوا ہوگا، یا بخار میں مبتلا ہُوا ہوگا، اس پر بیمار کی تکلیف کا قیاس کرے گا۔ لیکن کیفیت درد یا بخار اس کی سے کچھ علم حاصل نہ کر سکے گا۔

مولیٰ کریم کی کسی صفت (فعلیہ ہو یا ذاتیہ) کے علم کا حصول قطعاً ممکن نہیں ہے۔ اور اس پر حکم کرنا جہالت بلکہ ظاہراً مکابرہ ہے۔ دیکھیے! حادث تغیر کا محل ہے، اور اُس ذاتِ پاک کے لیے تغیر روا نہیں ہے۔ گو اس بے مثل و بے مثال کے لیے کوئی مثال درست نہیں آسکتی تاہم فہمید کے لیے چارہ نہیں۔ اصل میں تغیر روا نہیں ہے لیکن فرع سراسر تغیر کا محل ہے۔ مولیٰ کریم نے اپنے کلامِ پاک میں ہماری دانش کے لیے ارشاد فرمایا ہے:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (پ۲۶۔ ۱۸) اور بیچ جانوں تمہاری کے کیا پس تم دیکھتے نہیں؟

تو جاننا چاہیے کہ ہمارے نفوس اور رُوح کی مثال اظہر من الشمس ہے۔ جس کو قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کے ارشاد سے مزین فرمایا ہے۔ وجود تغیر کا محل ہے اور روح اصل الاصول۔ تمام صفات سماعت و بصارت اور تکلم وغیرہ کا موصوف روح ہی ہے اور وجود میں كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰي شَاكِلَتِهٖ کی سنت پر کام کر رہا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ روح امرِ الٰہی سے عالمِ امر کے میدان میں رُوحی تخلیق کے سوا نہیں ہے جس میں ادراک عاجز ہے۔ تو اس لم یزل و لایزال کی ذات میں کسی وجہ سے حکم کرنا خطا کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ رہا دلیل اور نفس سے تصور کے میدان میں ذاتِ پاک اور اس کی کسی صفت کو متصور کرنا، سو تخیل اور ظن کے سوا نہ ہوگا جو حقیقت سے کوسوں دور ہی رہیگا۔ اسی بنا پر قادریت ذوالجلال والاکرام کے ثبوت پر خُلفِ وعید کے امکان اور اس کے ضمن میں امکانِ کذب باری تعالیٰ کا اطلاق جائز رکھا ہے — ہیہات! قادریت کے ثبوت

کے لیے نص قطعی:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ۵ (پ۵-۶) اورکون بہت سچاہے اللہ سے بات میں۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ۵ (پ۵-۱۲) اورکون بہت سچاہے اللہ سے کلام میں

اور

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۵ (پ۳-۹) یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا

کے خلاف خُلفِ وعید اور امکانِ کذب کو کام میں لاتے ہیں جو اس ذات سبحانہٗ و تعالیٰ کے قطعاً لائق نہیں ہے۔ کیا ان کو قادریت کے اثبات کے لیے اور کوئی وسائل نہیں مل سکے؟ اگر آریہ یا نصرانی اس قسم کا کلام کرتے تو زیبا تھا۔ اب خلاف اسلام گروہ اس اعتقادِ سُوء سے مفاد اور سند حاصل کریں گے۔

اس امر کو تو یہ گروہ تسلیم کرتا ہے کہ نہ کبھی اُس ذات پاک نے وعدہ کا خلاف کیا ہے اور نہ ہی کرے گا۔ نہ کبھی معاذ اللہ جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی کبھی بولے گا۔ صرف عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی زبردست صفت اور تصرف کے اجرا کو روا رکھتے ہوئے دائرۂ امکان میں قدم زن ہوئے ہیں ـــــ اس میں کلام نہیں کہ مخلوق اس قادرِ مطلق کے تصرف میں سرتاپا محو اور بے اختیار ہے۔ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ اور یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ کی قدرت کاملہ کا احاطہ اس قدر وسیع ہے جس کی کوئی حد و حصر نہیں۔ فرمان مولیٰ کریم:

اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۵ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ ۵ اگر چاہے تو تمہیں لے جائے اور کوئی نئی مخلوق لے آئے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں۔ (پ۲۲-۱۴)

اور یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اور ایسی آیات شریفہ تقدیر کے مترادف ہیں۔ (جن کا بیان تقدیر کے عنوان کے تحت میں گزر چکا ہے) لیکن بلاوجہ سارے قرآن مجید میں ایک آیت بلکہ ایک لفظ بھی نہیں پایا جاسکتا۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ اور لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ مومن اور ولی کے لیے وعدہ اور منکرین کو بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ کی وجہ پر سخت وعید فرمائی ہے۔ اور بمصداق اُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ کی تاخیر فی الدنیا، اور آخرت میں اَشَدِّ الْعَذَابِ کا حکم ہو رہا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رحیم بھی ہیں اور قہار بھی، رحمٰن بھی ہیں جبار بھی، غیور بھی ہیں غفار بھی، عزیزٌ ذوانتقام بھی ہیں ستار بھی۔ لیکن یہ سب کی سب صفات ہمارے افعال و حال کی وجہ پر ہیں۔ ورنہ مطابق کلام اللہ:

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (پ۷-۸) لازم کیا ہے اس نے اپنی ذات پر مہربانی کو۔

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا ۵ (پ۲۲-۱۷) اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں نہ چھوڑے اوپر پشت زمین کے کوئی چلنے والا ولیکن ڈھیل دیتا ہے ان کو ایک وقت مقرر تک پس جب آئے گا وقت مقرر ان کا پس تحقیق اللہ ہے ساتھ بندوں اپنے کے دیکھنے والا۔

وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا (پ۱۵-۱۷) تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنْ اور نہ ظلم کیا ان کو اللہ نے ولیکن اپنی جانوں

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ٥ (پ۴-۲۴) اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

مولیٰ کریم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ یہ جو کچھ تغیر و تبدل کی صورت ہے ہمارے حال کی وجہ پہ ہی نازل ہوئی ہے۔

باوجود ان امور کے ایک عجیب بات ہے کہ جن قوموں پر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوا اور ہلاک کر دیے گئے، بعد از سزا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ کا حکم ہوا ہے۔ یعنی میرے قُرب کے بدلے وہ دُور کیے گئے، ردّ کیے گئے۔ مولیٰ کریم کا معاملہ انسان کے ساتھ محبت کا ہے، اور قرب خداوندی انسان کے لیے سب سے اعلیٰ مرتبہ اور اصل مقصود ہے۔ اسی طرح بُعد خداوندی اسفلیت اور محرومیت ہے۔ چنانچہ دوزخیوں کے حق میں اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کا ارشاد اظہر من الشمس ہے، جو حقیقت دوزخ پر دال ہے۔ تو یہ قُرب و بُعد اور رحمت و زحمت ہمارے لیے ہے۔ اس ذات پاک کے لیے جیسا توحید فی الخلق کے ضمن میں گزر چکا ہے، روا نہیں ہے۔ ہاں مخلوق کے لیے اس کی رضامندی اور ناراضی ہے۔ اگر تمام مخلوق فرماں بردار ہو جائے یا دوسری صورت میں نافرمان ہو جائے تو اس ذات معلّی میں کمی بیشی کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تمام اسباب و نقائص سے پاک ہے اور ہر طرح کے تغیر و تبدّل سے مبرّا ہے۔

اس سے یہ مفاد حاصل کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ جس طرح مولیٰ کریم کی ذات پاک کسی تغیر کا محل نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی صفات میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا۔ صفت فعلیہ ہو یا ذاتیہ، اپنی صفت کی ضد نہیں رکھتی۔ صفت بالفعل جیسے رحیم ہیں اور

ظالم نہیں ہیں، اور نہ ہی کبھی ہوں گے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

قضیۂ اوّل، عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی وجہ پر ہے ——— ہر چیز قبل از ظہور متحقق بالذّات تھی۔ جب قدرت کاملہ نے يَشَآءُ کو ارادہ کے سپرد کرتے ہوئے امر یعنی کُنْ کا ایما فرمایا تو فَيَكُوْنُ کی صورت ظہور پذیر ہو گئی۔ اور ہر چیز کا وجود جو شَیْ کے مترادف ہے، عیاں ہو گیا۔ تب ارشاد فرمایا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ — اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ
وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ٥ (پ۱۴-۵) — ان دونوں میں ہے مگر ساتھ حق کے۔

یعنی متحقق بالذّات سے عالم امر اور عالم امر سے تخلیق موجودات کو حق سے حق پر پیدا کیا گیا۔ تو حق سے کذب کی نسبت مولیٰ کریم کی طرف تو درکنار مخلوق کی طرف بھی روا نہیں ہے۔ مطابق کلام اللہ جلّ شانہٗ:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ — جو کچھ پہنچتا ہے تمہیں بھلائی سے پس وہ اللہ
وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ — تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہنچتا ہے برائی سے
نَّفْسِكَ ٥ (پ۵-۸) — تو وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے ہے۔

قضیۂ دوّم: اگر قادریت کے میدان ثبت میں ان کے مسلمات کو مان لیا جائے تو تین اُمور کو تسلیم کرنا پڑے گا: (۱) قادریت (۲) امکان (۳) احتمال۔

اگر قادریت میں امکان کی نفی قادریت کی نفی قرار دی جائے تو ذاتِ مولیٰ کریم کی قدرت یا کھلے لفظوں میں عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کا مفاد اُٹھ جاتا ہے، اور یہ محال ہے۔

اس لیے باوجود خلف وعید اور کذب کے عدم وجود کے مُقرر ہونے کی صورت میں بھی امکانؔ کی قید لازم آتی ہے۔ اور وہ اس طرح پر کہ گو یہ امر مسلمہ ہے کہ باری تعالیٰ نے نہ تو کبھی عذ کے خلاف کیا ہے اور نہ ہی کرے گا، نہ کبھی جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی کبھی بولے گا۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی فعل کے کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ کسی فعل کو کر ہی نہ سکتا ہو۔ اگر معاذ اللہ ایسا کہیں تو قادریت کُل کی نفی جزء کی نفی کے ساتھ منفی ہو جاتی ہے۔

اگر یہ امر معقول اور دلیل درست ہے کہ ذات مولیٰ کریم ہر نیک و بد فعل پر قادر ہیں تو لازم آئے گا اور کہنا پڑے گا کہ ہر فعل خواہ اس سُبحانہٗ و تعالیٰ کے لائق ہو یا نہ ہو، اس کا ظہور عمل ممکن ہو۔ اگر قادریت کی صفت میں امکان کا اُٹھ جانا عجز کی دلیل سے وابستہ ہو تو قرآن شریف پر بھی احتمال لازم آئے گا کہ اگر کذب کا امکان اس باری تعالیٰ کے لیے ہے تو کلام الٰہی میں (جس میں جھوٹ کا دخل ہرگز نہیں ہے، اور نص اس پر شاہد ہے) امکان کی وسعت میں جھوٹ کا احتمال ہو[1]۔ قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم ہے:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ — قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اس سے

تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ — اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں۔

[1] امکان کذب اور خُلف وعید کی بحث بڑی بسط سے ص۴۲۱ تک چلی گئی ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ تائیدِ متکلمین کی کتب سے کچھ عبارتیں ساتھ ساتھ درج ہوتی چلی جائیں لیکن ایک تو چونکہ وہ عربی میں ہیں اور عربی سے ناواقف حضرات کے لیے ان کا کچھ فائدہ نہیں اور اہل علم حضرات ان سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسرے خود صاحب "الانسان فی القرآن" نے قرآن مجید کے علاوہ اور منقولات سے حتی الامکان عمداً اجتناب کیا ہے اس لیے ان کا اندراج غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا گیا ہے۔ البتہ جنہیں کچھ شک ہو وہ کتاب المسامرہ ص۳۱ پر ممکنات اور

هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ — کانپ کر، اس سے کہ دعویٰ کیا انہوں نے واسطے

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ — اللہ کے اولاد کا۔ اور نہیں لائق واسطے رحمٰن کے

وَلَدًا ۝ (پ۱۶۔ ع۹۔ سورہ مریم) — یہ کہ پکڑے اولاد۔

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ — کس طرح ہو واسطے اس کے اولاد اور

لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۝ (پ۔ ع۱۹) — نہیں ہے واسطے اس کے جورو۔

یعنی تثلیث کے قائلین کے حق میں فرمایا ہے، قریب ہے کہ آسمان و زمین پھٹ جائیں کہ یہ خدا کی اولاد بناتے ہیں —— جب کہ اس کے بیوی ہی نہیں ہے تو اولاد کیسے ہو؟ تو اس سے امکان کے ضمن میں احتمال ہوسکتا ہے کہ اگر اس کے بیوی ہو تو اولاد ہونا ممکن ہے —— معاذ اللہ! اس صورت میں صرف اس قدر ہی نہیں کہ امکان کذب اور خُلفِ وعید ہی پر بس ہو۔ بلکہ ہر فعل جزوی کی نفی کُل کی نفی پر دال ہوسکتی ہے۔ مثلاً مرنا، صمٌ بکمٌ وغیرہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

تعریف کذب: سب سے پیشتر جس چیز کی نسبت سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف کی جا رہی ہے۔ اس کا علم ہونا چاہیے۔ اور یہ دو نوع پر منقسم ہے: ایک کسی چیز کے وجود کے عدم میں اس کا ثبوت دینا۔ دوسرا اقرار یا وعدہ کرنا اور اس کے پورا کرنے پر قادر نہ ہونا یا عمداً وعدہ پورا نہ کرنا۔ پہلی نوع کذب کئی وجہ پر منقسم ہے:

(۱) کسی پر جھوٹا الزام دینا، جس کو بہتان کہا جاسکتا ہے۔ خواہ کسی مطلب برآری کے لیے ہو، یا اس کو حسد کی وجہ سے نقصان پہنچانے کی خاطر ہو۔

دوسرا خود ستائی اور رعونت طبع کی وجہ پر نفسانیت کی رُو سے ہوا کرتا ہے۔

تیسرا کسی مصیبت کو ٹالنے یا کسی حاکم کے سامنے باوجود ارتکاب جُرم کے سزا سے بچنے کے لیے انکار کی وجہ پر ہے۔

چوتھا لغویات اور شہوت زبان کی بدعادت سے ظہور ہوا کرتا ہے۔

پانچواں کسی کے بچاؤ یا ہمدردی کی وجہ سے کذب کو استعمال کیا جاتا ہے جس میں کسی قدر خیر کا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح دشمن کو جہاد کے موقع پر دھوکا دینا یا صحیح بات میں مبالغہ کرنا وغیرہ وغیرہ ہوا کرتا ہے۔

بہر حال کسی چیز کے عدم وجود پر حکم کرنے کے سوا نہیں ہے۔ یہ عوارضات انسانیہ ہیں جو عیوب ہیں۔ پھر خلف وعید کیسے جو وقوع کذب کو مستلزم ہے۔ وہ ذات سبحانہٗ تعالیٰ ان تمام عوارضات سے مبرا و منزہ ہے۔ بلکہ ایسا شبہہ کرنا بھی روا نہیں ہے اور اس قسم کی نسبت ذات پاک کی طرف کرنا کفر ہے۔ کذب انسان کے لیے گناہ ہے اور نفس کا شیوہ ہے ـــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

نیک صفات انسانیہ جو سراسر عنایت الٰہی، عطائے غیر متناہی جن کا اتحاد معنوی اور نسبت مولیٰ کریم کے ساتھ وابستہ ہے، ذات سے مماثلت نہیں رکھتی ہیں۔ مثلاً علم، کلام، حیات، قدرت، سماعت، بصارت، ارادہ۔ علم کو علیم سے، کلام کو کلیم سے، حیات کو حی سے، قدرت کو قدیر سے، سماعت کو سمیع سے، بصارت کو بصیر سے اور ارادہ کو مرید سے ایسا اتحاد معنوی ہے جس میں تمیز محال ہے۔ لیکن یہ صرف ابدی ہیں اور ذات مولیٰ کریم

ازلی اور ابدی۔ باوجود ابدی ہونے کے انسان کی صفات ذاتیہ کو (جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) ذاتِ اقدس سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ بلکہ ایسا خیال کرنا بھی شرک ہے۔ اور وہ اس لیے کہ انسان کی صفات مقام و محل کی رُو سے تقسیم کے سوائے علم نہیں رکھتیں۔ اور اس ذوالجلال والاکرام کی صفات ذاتیہ کی تقسیم محال۔ سمیع ہیں مگر کان نہیں رکھتے۔ بصیر ہیں مگر آنکھ نہیں۔ کلیم ہیں مگر زبان کے محتاج نہیں۔ حی ہیں لیکن اس کے لیے کسی ظرف کی احتیاج نہیں علیٰ ہٰذا القیاس۔ بلکہ ہر ایک صفت اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے۔ واصفِ کُل لامحدود ہیں۔ یعنی سمیع ہیں تو سارے ہی سمیع ہیں اور بصیر ہیں تو کُل۔ اسی طرح سب صفات میں کُلیت کا حکم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی صفات کی ضد نہیں رکھتے۔ بلکہ ہر ایک صفت دوسری کی ضد نہیں، مقام و تقسیم سے مبرا ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (پ ۲۵ - ع ۳) — نہیں ہے مانند اس کے کوئی چیز اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔

سمیع و بصیر تو ہیں لیکن کسی چیز کی مثل سماعت و بصارت نہیں ہے۔ مثلاً حی بھی ہیں اور قدیر بھی ہیں۔ قادریت حی کی منافی نہیں ہو سکتی اور حی قدرت کی۔ یعنی اس بات پر وہ ذات قادر نہیں ہے کہ مر سکے۔ کیونکہ صفت حی قدرت رکھتی ہے اور قدرت صفت حی۔ بلکہ ہر صفت ذاتیہ ذات سے منفک نہیں ہے۔ نہ ہوئی ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ دراصل صفات ذاتیہ ذات ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ذات کی صفت ہیں نہ کہ ذات لیکن ذات سے کسی صورت منفک نہیں ہیں۔

صفات ذاتیہ کے سوا ذات باری تعالیٰ میں کسی صفت بالفعل کا دخل نہیں ہے۔ بلکہ صفت مرید کا ظہور صفت بالفعل ہے۔ یعنی مشیتِ ایزدِ متعال کا ایما ارادہ ذوالجلال و الاکرام کی طرف اور اس سے امر یعنی کُنْ کا ظہور فَیَکُوْن کے لباس میں عیاں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ذاتِ معلیٰ کی صفت بالفعل ہو یا صفت بالذات اپنی صفت کی ضد نہیں رکھتی جیسا کہ نص قطعی سے ثابت ہے۔ اِن صفات کے سوا قَہَّار، جَبَّار و مثلہا اسمائے الٰہی جن کا شان نزول ہمارے حال کی موافقت پر نزول ہوا، تمام مخلوق کے لیے شامل نہیں ہے۔ چونکہ میرا مقصود اس ضمن میں طول دینا نہیں ہے اس لیے صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ صفت بالفعل جس کی نسبت مخلوق کی طرف ہے، تضاد کے رد کرنے کے لیے بحث و تنقید کی ضرورت ہے جو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اب صرف اس قدر ضروری ہے کہ ان اوصاف سیّئہ کی نسبت مولیٰ کریم کی طرف قادریت کے میدان میں جواز کی صورت رکھتی ہے یا نہیں ؟

تعجب تو یہ ہے کہ صریح نص کے خلاف ذات باری تعالیٰ کو خُلف وعید اور کذب کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ قرآن الحمید میں ارشاد مولیٰ کریم لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ بالکل اور صاف عیاں ہے۔ تو جس فعل سے وہ ذوالجلال والاکرام بیزار ہوں اس کے لیے مشیت ایزد متعال اور امکان قطعاً روا نہیں ہو سکتا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ سُوْءِ الْاِعْتِقَاد ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قادر مطلق کی قادریت کو سمجھا ہی نہیں۔ محض اپنے زعم کے ڈھانچہ میں قادریت کو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی رُو سے ایسا ڈھالا ہے کہ معانی اصل کے

خلاف ہو گئے۔ ورنہ قادر مطلق کی قدرت کی حقیقت اس کے خلاف کی مقتضی ہے۔ کیونکہ ہر قسم کا جھوٹ اور وعدہ خلافی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، قادریت کے منافی ہے۔ اور وعدہ کا پورا نہ کرنا اور کسی کمزوری یا ڈر یا بچاؤ یا حیلہ کی وجہ سے جھوٹ بولنا کمال عجز کی دلیل ہے۔ تو جس ذات معلیٰ کے لیے قدرت اور مشیت اتم ہو اس قادر مطلق کے لیے ایسا امکان یا احتمال کیسے ہو سکتا ہے ؟ ایسا اشتباہ سراسر نادانی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ ارشاد مولیٰ کریم اپنے امر اور فعل کے لیے اظہر من الشمس ہے اور اس اشتباہ و امکان کے ردّ کرنے کے لیے بیّن دلیل ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں اور اپنے علم کی دولت سے مالا مال کریں، وعدہ کے ایفا کا انتظار اس کے کرنے یا نہ کرنے تک ہوا کرتا ہے۔ اگر مطابق وعدہ ایفا ہو گیا تو سچ، ورنہ جھوٹ۔ لیکن اس لم یزل و لایزال کے کسی وعدہ کے لیے انتظار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے: کَانَ وَعْدُہٗ مَفْعُوْلًا۔ یعنی جو وعدہ ہوا اس کا ایفا ہو گیا۔ تو اس صورت میں اس قادر مطلق کی قدرت کے لیے خلف وعید کس حساب میں ہو سکتا ہے، اور اس کا امکان یا احتمال کہاں ؟

دوسرا امکان کذب باری تعالیٰ: کذب کی تعریف اوپر گزر چکی ہے کہ کسی چیز کے عدم وجود پر حکم کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی انہی معانی کے مترادف ہے۔ جیسا کہ فرمایا: اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ یعنی جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں کہ ہو، تو وہ ہو جاتی ہے۔ عوام کے لیے یا دوسرے لفظوں میں مخلوق کے لیے کسی چیز کے عدم

وجود پر حکم کرنا اور اس کو ثابت کرنا کذب ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس عزیز الحکیم کا کسی شے کے لیے ارادہ کرنا یا اس کو عدم و وجود کی صورت میں ثابت کرنا یعنی اس پر حکم کرنا کَانَ اَمۡرُہٗ مَفۡعُوۡلًا کا مقتضی ہوا کرتا ہے۔ تو اب نورِ ایمانی کے ترازو میں غور و فکر کے اوزان سے موازنہ کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ بے مثل و بے مثال کی قادریت کے میدان میں کذب کا امکان کیسے ہو سکتا ہے؟

قادرِ مطلق کی قدرت کا ظہور امر کی صورت میں چار نوع پر ظہور پذیر ہے:

پہلا[1] روح کا وجود میں داخل ہونا، جو قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ کے مصداق ہے۔

دوسرا[2] قدرتِ اِذن جو امر کے مترادف ہے، اپنے خاص بندوں خصوصًا انبیائے کرام میں سے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اجرا رکھا۔ یعنی دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے، اور اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے جواز رکھا ہے۔ یعنی اپنی قدرتِ اجازت کو ان دو پاک ہستیوں میں ودیعت فرمایا ہے۔

تیسرا[3] کُنۡ کی صورت میں کسی چیز کی طرف امر کا کرنا۔

چوتھے[4] کلام کی صورت میں احکام تعلیم، قصص جو عبرت کے مترادف ہیں۔ اور تعریف توحید و مثلہا کی صورت میں ہوتا ہے جن کی تفصیل میں بہت طول ہے اور اس جگہ مقصود نہیں ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ذات مولیٰ کریم کی صفت خصوصًا صفت بالذات کی ضد نہیں ہے۔ وہ لم یزل اس تغیر سے پاک ہے۔ اب **سوال** صرف یہ ہے کہ جب صفات کی ضد کا وجود عدم کا مقتضی ہے۔ تو کلام جو صفت بالذات ہے اور ضد نہیں رکھتی ہے، خواہ وہ امر کی صورت

میں فاعل ہو یا کسی اور فعل کی وجہ پر فاعل حقیقی کی ذات کے تابع مشیت ایزد متعال کے مرید ہونے کی رُو سے قطع نظر اس سے کہ وہ صدق ہے یا کذب، اپنے فعل کی نفی نہیں ہو سکتی۔ اور وہ اس لیے کہ اپنے وصفِ تام میں (جس طرح بھی ہو) اپنے فعل میں قاصر ہونے کی وجہ سے قدرتِ اتم میں نقیض واقع ہوتا ہے، اور یہ محال ہے۔ اس لیے ماننا پڑے گا اور حقیقت کے میدان میں یہ امر حق اور صحیح ہے کہ وہ قادرِ مطلق ہر فعل پر قدیر ہے۔ یعنی اس کی صفت ذاتیہ کے فعل کی صورت میں نفی روا نہیں ہے۔ ورنہ قادرِ مطلق کی قادریت کی قدرت میں نقص لازم آئے گا۔ اور یہ محال ہے ——— یا عام فہمائش کے لیے کھلے لفظوں میں یوں قیاس کرنا چاہیے کہ کلیم صفت بالذات ہر کلام کرنے پر قدرتِ اتم رکھتی ہے۔ تو پھر خواہ فعل سرزد ہو یا نہ ہو، صدق ہو یا کذب، اپنی صفتِ کلام میں قادرِ مطلق کے فعل کی نفی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لیے امکان کے میدان میں کسی کلام کی نفی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ صفت کلیم میں نقص واقع ہوگا، جو مطلق محال ہے۔

جواب:- اوپر چند اقسام پر تعریف کذب گذر چکی ہے جن کا اصل کسی چیز کے عدم وجود کے ثبت پر حکم کرنے کے سوا نہیں ہے۔ اور اس الٰہ واحد کا حکم ہر چیز کے عدم وجود پر واقع ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ نہ تھا اور ہر چیز کا وجود عدم کے میدان میں معدوم تھا۔ قادرِ مطلق کی مشیت سے امر کُنۡ صادر ہوتے ہی فَیَکُوۡنُ کا ظہور ہوا۔ اب سمجھ نہیں آتی کہ اس بے زوال قادر ذوالجلال والاکرام کی ذات کی طرف کذب کی نسبت کیسے ہوئی جبکہ اس کی ذات جلّ وعلیٰ کی قدرت کاملہ میں کذب کا وجود ہی پیدا نہ ہو سکا۔ نہ ہی ہے، اور نہ

ہی ہوگا۔

اب یہاں ایک **سوال** پیدا ہوتا ہے جس کا حل ضروری ہے، تاکہ کسی اشکال کا شمّہ بھی باقی نہ رہ جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ لفظ کُنْ یعنی ہو، حکم کے مترادف ہے، اور کسی چیز کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے (جس کی عدم موجودگی میں کذب ثابت ہوتا ہے) وجود کا ہونا ضروری ہے۔ اور کُنْ یعنی امر عدم وجود کے ظہور کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے 'ہے' اور 'ہو' میں فرق ثابت ہوتا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ عدم وجود سے پہلے ہر چیز کا متحقق بالذات ہونا لازم ہے۔ جیسے قرآن حکیم سے بالکل عیاں ہے: اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ لَہٗ کی ضمیر سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کا وجود بلکہ اصل قبل از ظہور ذات باری تعالیٰ میں متحقق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کسی چیز کے وجود کی عدم موجودگی پر ثبت متحقق بالذات ہے اور امر کُنْ سے وجود کا ظہور عیاں۔ تو اس لم یزل ولایزال کا کسی چیز کے عدم وجود پر تصدیق کذب نہیں ہو سکتا۔ عدم وجود کی تصدیق تعریف کذب ہے، اور مولیٰ کریم کے لیے کسی چیز کے عدم وجود کی تصدیق متحقق بالذات ہے۔ اور اسی کے لیے کُنْ جو امر کے مترادف ہے، ظہور کا باعث ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عدم وجود کی تصدیق متحقق ہونے کی صورت میں حق ہے۔ اس لیے سادے لفظوں میں عوام الناس کی فہمید کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر چیز کا علم اس ذات باری تعالیٰ کو ہے۔ یا ہر چیز اس کے علم میں موجود ہے۔ جب چاہے اپنے حکم سے ظاہر کر دے۔ جبکہ ہر چیز اس کے علم میں ہے، تو تعریف کذب کس صورت میں

صادق آسکتی ہے؛ بلکہ اس کے امکان کا گمان امکانِ کذب باری تعالیٰ کے عدم وجود پر آتا ہے۔ اور یہ انہی کے کذب کی دلیل ہے جو کذب کی تعریف کے مترادف ہے۔

مکرّر:

جبکہ ہر چیز کا وجود متحقق بالذات ہے، اور ہر حکم لَہٗ کی ضمیر کی وجہ پر کسی وجود کے لیے ہے، عدم پر حکم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ثابت ہوا کہ کسی وجود کے ظہور کے لیے مطابق تعریف کذب امکان کذب ہو سکتا ہے۔ لیکن کَانَ اَمْرُہٗ مَفْعُوْلًا کے ماتحت ظہور وجود ہونے کے بعد صدق ہو جاتا ہے۔ اور ہر شے کے متحقق ہونے کی وجہ پر عدم مفقود ہو جاتا ہے۔ اس لیے امکان کذب کا امکان ہرگز ممکن نہیں۔ نہ ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا +

ردِّ خلف وعید

سوال: یہ امر مسلّمہ ہے کہ اس قادر مطلق کے ایما یعنی کُنْ سے ہر چیز کا ظہور ہوا ہے، ہو رہا ہے، اور ہوتا رہے گا۔ لیکن یَفْعَلُ اللہُ مَا یَشَآءُ اور یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ کی بساطِ عظیم پر:

لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ۝ یَمْحُوا اللہُ	واسطے ہر ایک وعدے کے ایک تحریر ہے
مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَہٗٓ اُمُّ	مٹا ڈالتا ہے اللہ جو چاہتا ہے، اور ثابت کرتا
الْکِتٰبِ ۝ (پ ۱۳ - س ۱۳ - ۱۳: ۳۸ - ۳۹)	ہے۔ اور نزدیک اس کے ہے اصل کتاب۔

کی قادریت کے تصرفات میں کسی چیز کا ثابت رہنا یا محو ہونا استقلال نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے کسی تغیر و تبدل یا کھُلے لفظوں میں خلفِ وعید پر اس قادرِ مطلق کی قدرت بہر صورت قادر اور غالب ہے۔ کیا اس قادریت کی نفی ہو سکتی ہے ؟

جواب قبل از ظہورِ ہر شے کا وجود ذاتِ باری تعالیٰ میں متحقق ہونا نصِ قطعی سے امکانِ کذب کے رد کے بیان میں ثابت ہو چکا ہے۔ تو جب ظہور کا ارادہ فرمایا، عالمِ امر کی طرف مرید ہوئے تو جو کچھ ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے، سب کا سب لوح میں محفوظ کیا گیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس لوحِ محفوظ میں جس کو چاہیں محو کر دیں اور جس کو چاہیں ظاہر فرما دیں۔ لیکن جس کا ظہور ہو چکا ہے۔ یعنی کَانَ اَمۡرُہٗ مَفۡعُوۡلًا کی وجہ پر ہویدا کا حکم عمل میں آچکا ہے، لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ کے مطابق ہرگز محو نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کے فرع میں تغیر و تبدل (جو ہمارے حال سے عبارت ہے) ہوا کرے، اصل میں تغیر واقع ہونا محال ہے، بلکہ احاطۂ امکان سے باہر ہے، جیسا کہ پیدائش انسان جو متحقق بالذات تھا، ہَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّہۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا کے مقام سے عالمِ امر کی طرف جس کا ذکر قرآن شریف میں کئی جگہ میثاق وغیرہ سے ثابت ہے۔ اور وہاں سے عالمِ موجودات کی طرف جو آج کے دن بالکل عیاں ہے، ظہور ہو چکا ہے۔ خواہ یہ مومن ہو یا منافق، مسلم ہو یا کافر، دوست ہو یا دشمن، صاحبِ قُرب ہو یا بُعد، کسی حالت میں بھی معدوم نہیں ہو سکتا۔ جو زندگی من اللہ اس کو مل چکی ہے، یہ علّیین میں ہو یا سجین میں، جنت میں ہو یا دوزخ میں، ہرگز منقطع نہ ہو گی، اور نہ ہو سکتی ہے۔ یَمۡحُوا اللّٰہُ

مَا یَشَآءُ کا حکم اس کے لیے نہیں رہا ہے۔ کیونکہ اس کا حکم قبل از ظہور ہی ہے۔ ہاں بعد از ظہور جن کے لیے حکم فنا ہو چکا ہے۔ مثلاً دنیا و مافیہا اور اس کے فنا و بقا میں اصل اور فرع کے منازل و مدارج میں بہت گفتگو ہے جس کا بیان کرنا اس جگہ مقصود نہیں ہے۔ اس لیے اصلی مطلب کی طرف ہی رُجوع کیا جاتا ہے۔

اے بھائی! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ کا تصرف قبل از ظہور دو وجہ پر ہے۔ ایک تو قبل از ظہورِ دنیا، کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ	اور جس وقت لیا اللہ نے عہد پیغمبروں کا البتہ
لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ وَّحِکۡمَۃٍ	جو کچھ کہ دوں میں تم کو کتاب سے اور حکمت
ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا	سے پھر آوے تمہارے پاس پیغمبر سچا کرنے والا
مَعَکُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنۡصُرُنَّہٗ ؕ	اس چیز کو کہ ساتھ تمہارے ہے البتہ ایمان لائیو
قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی	ساتھ اس کے اور ضرور مدد دینا اس کو۔ کہا کیا
ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ	اقرار کیا تم نے اور لیا تم نے اوپر اس کے بھاری
قَالَ فَاشۡہَدُوۡا وَاَنَا مَعَکُمۡ مِّنَ	عہد میرا، کہا انہوں نے اقرار کیا ہم نے کہا پس شاہد رہو
الشّٰہِدِیۡنَ ۔ فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ	اور میں ساتھ تمہارے شاہدوں سے ہوں۔ پس
ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۔	جو کوئی پھر جائے پیچھے اس کے پس یہ لوگ وہی
(پ ۳ ۔ ع ۱۶)	ہیں بدکار۔

تو یہ وعدہ اور وعید جیسا اوپر گزر چکا ہے، صرف انبیاء و مرسلین ہی سے ہوا ہے۔ جو دوسرے

عام انسانوں کے لیے روا نہیں ہے۔ کیونکہ ان پاک ہستیوں کے لیے ہر دو برزخ (قبل از ظہور وجود اور بعد از موت) ظاہر کی طرح ہیں، اور ان کو ہر دو سے علم کل ہوتا ہے۔ اور یہ دوسرے یعنی عام لوگوں کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُولُ	اور کیا ہے واسطے تمہارے کہ نہیں ایمان لاتے تم ساتھ
يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ	اللہ کے اور رسول پکارتا ہے تم کو تو کہ ایمان لاؤ ساتھ
مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (پ۔ ۲۷)	رب اپنے کے اور تحقیق لیا ہے قول تمہارا اگر ہو تم ایمان والے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کی شرط محض ہمارے لیے ہے۔ لیکن نبیوں اور رسولوں کے لیے مطلق روا نہیں ہے۔ ان کے لیے أَقْرَرْتُمْ اور أَقْرَرْنَا کی عبارت کافی ہے جو ان کے برزخ سے علم ہونے کی واثق دلیل ہے۔ ان آیات بینات سے مومنین کے لیے دو مفاد ظاہر ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی رسول یا نبی مبعوث نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اس لیے کہ یہ میثاق تمام انبیاء سے لیا گیا ہے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ یہ میثاق ان کی ذات کے لیے ہے جو تصدیق اور ایقان مرسلین پر مبنی ہے۔ اگر یہ میثاق تمام انبیاء کے لیے ہوتا تو لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ کی جگہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِمْ ہوتا۔ لیکن بِهٖ کی ضمیر واحد اظہر من الشمس ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، ہر ایک رسول کے لیے نہیں۔ اور یہ اسم باعتبار ضمیر کے مخصوص ہے۔

دوسرے وعدہ کی رو سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور از روئے وعدہ اب آپ جیسا کوئی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ قادر مطلق اپنے وعدہ کے

ایفا پر قدرت اتم رکھتے ہیں، اور بموجب كَانَ أَمْرُهٗ مَفْعُولًا ظہور ہو چکا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اس خلاق العلیم نے جیسا یہ سلسلۂ انبیاء و مرسلین ابتدا سے انتہا تک اور دنیا و مافیہا بلکہ تمام موجودات کو پیدا کیا ہے، ایسی مخلوقات یعنی اس کی مثل لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں پیدا کر سکتے ہیں۔ بہر صورت اس امر پر قادر ہیں۔ لیکن موجودہ دنیا جس کی ابتدا سے انتہا تک کے لیے فیصلہ ہو چکا ہے، حدیث شریف جَفَّ الْقَلَمُ یعنی قلم سوکھ چکا ہے کے مطابق اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا ہے۔ اور ایفائے عہد کے مطابق لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ کی سنت کے موافق اب اس موجودہ دنیا میں یوم القیامۃ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا پیدا ہونا احاطۂ امکان سے باہر ہے۔ کیونکہ پھر میثاق النبیین کا فائدہ نہیں رہتا۔ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کے لیے لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا اقرار لیا گیا۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس لیے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آ سکتا۔

۲

دوسرا، قبل از ظہور بعد از میدان دنیا، جو لوح محفوظ پر کتابٌ مرقوم سے منسوب ہے، کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ ۝	ہرگز نہیں یوں تحقیق عملنامہ بدکاروں کا البتہ بیچ سجین کے ہے
وَمَا أَدْرٰىكَ مَا سِجِّينٌ ۝ كِتٰبٌ	اور کس چیز نے معلوم کر دیا تجھ کو کیا ہے سجین۔ ایک دفتر ہے
مَرْقُومٌ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝	لکھا ہوا۔ وائے ہے اس دن واسطے جھٹلانے والوں کے
كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝	ہرگز نہیں یوں تحقیق عملنامہ نیکوکاروں کا البتہ بیچ

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ	علیّین کے ہے۔ اور کس چیز نے معلوم کروایا تجھ کو کہ کیا
مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝	ہے علیّین۔ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ حاضر ہوتے ہیں اوپر
(پ۳۰۔ ع۸)	مقرب خدا کے

اس کا وعدہ ہمارے اعمال کی وجہ سے حال کی رو سے ہے، اور یہ قانونِ قدرت اور قاعدۂ کلیہ عوام الناس کے لیے مقرر ہو چکا ہے۔ لیکن قبل از ظہورِ عمل اس ذاتِ بے زوال کی شان کے لائق ہے کہ کسی گنہ گار کو اپنی رحمت سے بخش دے یا عدل کی رو سے عذاب کرے۔ لیکن اس سے خُلفِ وعید ہر گز ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ ایفائے وعدہ کے موافق ہے اور وہ اس لیے کہ از روئے رحم اور عفو و کرم مومنین کے لیے ہے، اور باندازۂ معصیت عدل کے رو سے سزا ہے۔ مطابق:

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جو کوئی نہ ایمان لایا ساتھ اللہ کے اور رسول
فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝	اس کے کے پس تحقیق تیار کیا ہے ہم نے واسطے کافروں کے
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ	دوزخ۔ اور واسطے اللہ کے ہے بادشاہی آسمانوں کی
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ	اور زمین کی بخشتا ہے واسطے جس کے چاہے اور عذاب
يَّشَآءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝	کرتا ہے جس کو چاہے۔ اور ہے اللہ تعالیٰ بخشنے والا
(پ۲۶۔ ع۱۰)	مہربان۔

اس سے بھی خُلفِ وعید ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ پہلے وعید ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لاتے۔ ان کافروں کے لیے عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد

ارشاد فرمایا ہے کہ اسی کے لیے ہے آسمان و زمین کا ملک جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب کرے۔ تو جاننا چاہیے کہ اس مغفرت اور عذاب کی نسبت مشیت ذوالجلال والاکرام کے ساتھ خلف وعید کے مترادف نہیں ہے کیونکہ یہ محض اختیار ہے جس کا تصرف توفیق کی رُو سے میدان دنیا ہی میں ہے، اور مفاد اس کا فی الآخرۃ۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا	تحقیق جو لوگ کہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر
ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ	ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر زیادہ ہوئے کفر میں
اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝	ہرگز نہیں بخشے گا ان کو اللہ اور نہ دکھائے گا ان کو
بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝	راہ۔ خوشخبری دے منافقوں کو ساتھ اس کے کہ
(پ۵۔ ع۱۷)	واسطے ان کے عذاب ہے درد دینے والا۔

اور دوسری جگہ ساتھ ہی یوں ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ	تحقیق منافق بیچ درجے نیچے کے ہیں آگ سے
مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝	اور ہرگز نہ پاوے گا تو واسطے ان کے مددگار۔
اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا	مگر جنہوں نے کہ توبہ کی اور صلاحیت کی اور مضبوط
بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ	پکڑا خدا کو اور خالص کیا دین اپنے کو واسطے اللہ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ	کے پس یہ لوگ ساتھ مسلمانوں کے ہیں اور شتاب
الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ مَا يَفْعَلُ	دے گا اللہ ایمان والوں کو ثواب بڑا۔ کیا کرے گا
اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ	اللہ عذاب کر کے تم کو اگر شکر کرو گے تم اور ایمان

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ (پ۵-ع۱) — لاؤ گے تم۔ اور ہے اللہ قدردان جاننے والا۔

یہ تغیر و تبدل ہمارے حال کی وجہ ہی سے ہے جس کا تصرف غضبی ہو یا رحمی، میدان دنیا کے سوا نہیں ہے۔ اور سنت الٰہی اور قانون قدرت ہے جو فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کے مطابق ظہور پذیر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور یہ وعدہ میدان دنیا میں ہمارے حال اور اعمال کی وجہ پر ہے جن پر بات ختم ہو چکی ہے۔ وعید تو ان لوگوں کے لیے ہے جو کافر، منافق اور مشرک ہیں۔ جن کی مغفرت کا مطلق امکان نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا	تحقیق جن لوگوں نے جھٹلایا نشانیوں ہماری کو اور تکبر
عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ	کیا ان سے نہ کھولے جائیں گے واسطے ان کے دروازے
وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ	آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے بہشت میں یہاں تک
فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي	کہ داخل ہو جائے اونٹ بیچ ناکے سوئی کے۔ اور اسی
الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ	طرح جزا دیتے ہیں ہم گنہگاروں کو۔ واسطے ان کے دوزخ
وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۝ وَكَذٰلِكَ	سے بچھونا ہے اور اوپر ان کے بالاپوش ہیں۔ اور اسی
نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (پ۸-ع۱۲)	طرح بدلہ دیتے ہیں ہم ظالموں کو۔

ان کے لیے نہ تو کسی کی سفارش ہی ہو سکے گی، اور نہ ہی ان کو کہیں سے مدد مل سکے گی جیسا کہ بزبان حضرت عیسیٰ رُوح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کے روز بجناب باری تعالیٰ اظہر من الشمس ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ	اگر عذاب کرے گا تو ان کو پس وہ بندے تیرے ہیں اور

تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	اگر بخش دے تو ان کو پس تحقیق تو ہی ہے غالب حکمت
قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	والا۔ فرمائے گا اللہ تعالیٰ یہ دن ہے کہ فائدہ دیوے گا
صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ	سچوں کو سچ ان کا۔ واسطے ان کے بہشتیں ہیں چلتی ہیں
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ	نیچے ان کے سے نہریں۔ ہمیشہ رہیں گے بیچ اس کے
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ	ہمیشہ۔ راضی ہوا اللہ ان سے اور راضی ہوئے وہ اس سے
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (پ۷-ع۶)	یہی ہے مراد پانا بڑا۔

جن لوگوں کے لیے بات ختم ہو چکی ہے، یا وعید اتم ہو چکی ہے، ان کے لیے سارے قرآن مجید میں مغفرت کی ایک آیت بھی نظر نہیں آتی۔ بلکہ روز ازل سے لوح محفوظ پر مقرر ہو چکا ہے، جو قانون الٰہیہ کے مترادف ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ	جاننے والا ہے غیب کا۔ نہیں پوشیدہ اس سے برابر
ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَ	ایک بھنگے کے بیچ آسمانوں کے اور نہ بیچ زمین کے اور
لَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ	نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا مگر بیچ کتاب بیان کرنے والی
كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	کے ہے۔ تو کہ بدلہ دیوے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	اور کام کیے اچھے۔ یہ لوگ واسطے ان کے بخشش ہے
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ	اور رزق باکرامت۔ اور جن لوگوں نے سعی کی بیچ
اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ	نشانیوں ہماری کے عاجز کرنے والے ہو کر۔ یہ لوگ واسطے
مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ (پ۲۲-ع۸)	ان کے عذاب ہے سخت قسم سے درد دینے والا۔

جزا اور سزا کی نسبت خواہ چھوٹا عمل ہو یا بڑا، وعدہ اور وعید فرمائے ہیں جس کا خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہاں میدان دنیا میں ہمارے عمل و حال کی وجہ پر تغیر و تبدل قرآن شریف سے ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی قوم کے لیے عذاب مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن اُنھوں نے بچّوں کو دُودھ پلانا بند کر دیا، کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تضرّع و زاری کو تہِ دل سے جاری کر دیا، تو مولیٰ کریم نے اس کے ظہورِ عمل کو ترک فرما دیا یعنی یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ کی سنت کو از روئے رحم ان کے لیے جاری کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ قبل ازیں کسی قوم کے لیے ایسا نہیں ہوا ہے:

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا	اور اگر آویں ان کے پاس سب نشانیاں یہاں تک کہ
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ	دیکھیں عذاب درد دینے والا۔ پس کیوں نہ ہوئی کوئی
اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ	بستی کہ ایمان لائی ہو پس نفع دیا ہو اس کو ایمان اس کے
يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ	نے مگر قوم یونس کی جب ایمان لائے کھول دیا ہم نے
عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ	ان سے عذاب رسوائی کا بیچ زندگانی دنیا کے اور فائدہ
مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (پ۱۱ - س ۱۵)	دیا ہم نے ان کو ایک مُدّت تک۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی کام مقرر ہونے کے بعد ایسا ہونا نادرات سے ہے۔

اے بھائی! خواہ عالمِ امر میں خواہ عالمِ شہود یعنی عالمِ دنیا میں جو موجودات کے مترادف ہے، خواہ عالمِ برزخ اور یوم القیامۃ کے میدان میں ہو، کام فیصل ہو جانے کے بعد یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ کی سنت منقطع ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس لیے کہ قادریّت کے

میدان میں مشیت ایزد متعال کے رُو سے یُثْبِتُ کا عمل ظہور پذیر ہو چکا ہے جس کے لیے یَمْحُوا اللّٰہُ یعنی محویت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ صرف قبل از ظہورِ عمل اس کا اجرا روا رکھا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت سے جو امر ظاہر ہوا ہے، نادرات کے مترادف ہے لیکن اس کا عمل بھی ظہور سے پہلے ہی ہوا۔ ظہور ہو جانے کے بعد ایسے نادرات کا ہونا بھی ناممکن ہے۔ ہاں اپنے وقت معین پر یعنی قیامت کو فنا ہو جائے گا۔ جو تین وجہ پر متعین ہے۔

(۱) بقا، بقا، بقا ـــــــ ذات باری تعالیٰ۔

(۲) فنا، بقا، فنا ـــــــ دنیا و مافیہا۔

(۳) فنا، بقا، بقا ـــــــ انسان، دوزخ، بہشت یعنی آخرت و مافیہا۔

بہر صورت ہر چیز کا متحقق بالذات ہونا اصل الاصول کی مانند ہے۔ دوسرا درجہ ظہور کے میدان میں عالمِ امر ہے جس کو کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سے منسوب فرمایا ہے، یا لَوحِ مَحْفُوْظ سے نامزد کیا ہے۔ تیسرا درجہ عالمِ دنیا ہے جس میں ظہورِ وجود اور آفرینش کا مقام ہے۔ متحقق بالذات کی بساط پر یَمْحُوا اللّٰہُ کا قدم بالکل کالعدم ہے۔ کیونکہ محویت کسی وجود کے لیے ہوا کرتی ہے اور اس مقام و محل میں کسی شے کا وجود ثابت نہیں ہے۔ کوئی چیز سوائے ذہنی وجود کے جو علم خداوندی کے مترادف ہے، نہ خارجی وجود رکھتی ہے نہ لفظی۔ تو پھر اس صورت میں محویت کہاں اور کس کی؟ دوسرا مقام نوری وجود میں مرقوم ہے جس کے لیے یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ وارد ہوا ہے۔ اور تیسرا مقام ظہورِ وجود تام ہے۔ جس میں سوائے فنا و بقا یعنی اصل اور فرع کے تغیر و تبدل کے سوا کسی محویت کی گنجائش نہیں ہے۔ ہر فنا فرع کے لیے

ہے۔ اصل کو من اللہ بقا حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس اصل کو جس کے لیے میں نے محویت کو روا نہیں رکھا ہے۔ عالمِ امر میں بھی اس کو محویت نہیں ہے اور یہ انسان اور عالمِ آخرت کے لیے ہی مخصوص ہے۔ باقی تمام اشیاء کے لیے ایسا نہیں ہے۔

اے بھائی! اس امر کی تفصیل کے لیے قرآن المجید کی مثال بالکل عیاں ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ یہ قرآن شریف لوحِ محفوظ سے عبارت ہے۔ اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضرت عیسٰی رُوح اللہ علیہ السلام تک جتنی کتابیں اور صحیفے اللہ جل شانہٗ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ان سب کا جامع ہے۔ اور مطابق مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ بہت سی عبارتیں بعینہٖ (خواہ زبان میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو) موجود ہیں۔ احکامِ شریعت میں تغیر و تبدل ہوتا چلا آیا ہے جو منسُوخ کے مترادف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں بھی احکامِ قرآن شریف میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے، جو عمل کے میدان میں اظہر من الشمس ہے جو سراسر ہمارے حال اور استعداد کے مطابق اس عزیز الحکیم نے ایک اندازہ پر مقرر کر دیا ہے۔ اور بعد از فیصل تکمیل فرما دی ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَزَّ وَجَلَّ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج کے دن پورا کیا میں نے واسطے تمہارے دین تمہارا
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ	اور پوری کی اوپر تمہارے نعمت اپنی اور پسند کیا واسطے
الْاِسْلَامَ دِيْنًا (پ ۶ - ع ۵)	تمہارے اسلام کو دین۔

اس فیصلے کے بعد اس آیتِ بینہ کے نازل ہونے اور اس کا عمل ہو جانے کے بعد تغیر و تبدل منقطع ہو چکا ہے۔ اب یہ کبھی منسُوخ نہ ہو گا۔ تو اس سے یہ مقصُود حاصل ہوا کہ محویت کی حد

کسی کام کے ظہورِ عمل اور قبل از وجود ہی روا ہو سکتی ہے، بعد میں روا نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بعض آیات بعد از ظہورِ عمل منسُوخ ہو چکی ہیں، چاہیے تھا کہ بعد از ظہورِ عمل محو نہ ہوتیں؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ نسخ اَور چیز ہے اور محو اَور۔ نسخ باوجود عمل منقطع ہونے کے وجود رکھتا ہے کیونکہ جن آیات کو مولیٰ کریم نے منسُوخ کر دیا ہے ان کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ دوسری آیات میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ منسُوخ اور غیر منسُوخ ہونے کی صورت میں اصل کلام میں کوئی فرق نہیں۔ سب کا سب قرآن مجید ہی ہے۔ صرف نسخ ہے۔ نہ فرق اصل۔ اور محو ہونا (وجود نوری ہو یا شہودی) مفقود ہو جانا ہے۔ اس لیے منسُوخ آیات محویت کا حکم نہیں رکھتیں۔

مکرّر غور اس امر میں لازم ہے کہ متحقق بالذات ہر چیز بلا ظہور وجود ہے اور عالمِ امر میں مرقوم۔ اور عالمِ شہود میں ظہور اتم۔ ہر چیز کا اصل الاصول من اللہ ہی ہے اور اس خالقِ موجودات نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر چیز کو خلقت کیا ہے۔ یعنی اپنی قدرت سے عالمِ امر کی طرف اور وہاں سے موجودات کی طرف نزول فرمایا ہے۔ گویا عدم سے ہستی کی طرف، نابود کو بود کی جانب، مرکز سے دائرہ کی طرف، ہستی کو وجود اور مخفی کو ظہور کی طرف مبذول کیا ہے۔ جس کے لیے محویت کا عمل مفقود ہو چکا ہے۔ ہاں فرع جو اصل کے تابع ہے، تغیر و تبدل کا محل ہے۔ لیکن اصل کے لیے تغیر روا نہیں ہے۔ جیسے متحقق بالذات سے عالمِ وجود تک ہر چیز کا نزول فرمایا ہے، اور پھر اس کو اپنی طرف لے جانے پر قادر ہے، اور اس کا عمل ہو رہا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اے بھائی! جب اس خالق کائنات، موجد موجودات نے حضرت انسان کو پیدا کر کے ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا تو سب سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس اکڑ بیٹھا حکم ہُوا کہ میری درگاہ سے مذءوم و مدحور ہو کر نکل جا۔ تو اس نے قیامت تک کے لیے مہلت کی درخواست کی جو منظور کی گئی۔ اب باوجود مغضوب و ملعون ہونے کے اور سخت دشمنی و مخالفت کرنے کے وعدہ کے مطابق قیامت سے پہلے محبت تو درکنار اس کو فنا بھی نہیں ہو گی۔ اور یہ سنت الٰہی ہے جس کے لیے ارشاد ذوالجلال والاکرام نہایت تاکید کے ساتھ ہو رہا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ اگر اس کے برخلاف سارے قرآن شریف میں کہیں ایک دفعہ بھی ارشاد ہُوا ہو کہ میں اپنے وعدہ کے خلاف کرنے پر قادر ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف کرنے پر قادر ہے۔

سوال: یہ امر مسلمہ ہے کہ اس لم یزل ولایزال، بے مثل و بے مثال نے نہ تو کبھی اپنے وعدہ کا خلاف کیا ہے، اور نہ ہی کبھی کرے گا۔ لیکن اس قادر مطلق کی قادریت مشیت کے میدان میں قدرت اتم رکھتی ہے۔ کسی فعل سے عاجز نہیں ہے۔ بہر صورت بہر وجہ قادر مطلق ہے کیونکہ کسی فعل پر صفت قادریت کی نفی جز کی نفی ہے، اور کسی جز کی نفی کل کی نفی ہُوا کرتی ہے اور یہ محال ہے اور قدرت اتم میں نقیض واقع ہوتی ہے۔

جواب: اس میں کلام نہیں کہ قدیر اس ذوالجلال والاکرام کی صفت بالذات ہے جس کی ضد نہیں ہے۔ اور اس کی ضد عجز ہے، جیسا کہ سوال میں تحریر ہے۔ اب نورِ ایمانی کے ترازو میں موازنہ کرنا سراسر موجب ہدایت و ایقان ہو گا کہ قدرت خداوندی کا تصرف

دو جانب پر متصرف ہے۔ ایک تو خلف وعید پر، اور دوسرا ایفائے عہد پر۔ ایفائے عہد کے لیے تو قرآن مجید میں کئی وجہ پر صاف ذکر فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔ اور دوسری وجہ پر سارے قرآن شریف میں ایک دفعہ بھی ذکر نہیں ہوا ہے کہ میں اپنے وعدہ کے خلاف پر قادر ہوں۔

(۲) اوپر ردِ امکان کذب میں گذر چکا ہے کہ اس بے مثال کا کوئی فعل بھی ہمارے فعل کی مثل نہیں ہے۔ ہمارے وعدہ کے ایفا کے لیے انتظار کی ضرورت ہے۔ اگر وقت میعاد پر ایفا ہو گیا تو اس میں ہم صادق ہوئے، ورنہ کاذب۔ لیکن اس قوی عزیز کا وعدہ کسی ایفا کا منتظر نہیں ہے بلکہ مطابق ارشاد عزیز الحکیم (كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا) اس کی شان کے لائق ہے۔ اب ذرا عقل و ہوش کے ترازو میں غور و فکر کے اوزان سے موازنہ کیجیے کہ جس کی قادریت کا یہ عالم ہو اس کے احاطۂ قدرت میں خُلفِ وعید کا گمان کب ہو سکتا ہے؟

رہا يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (یعنی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے) کی بساط پر کسی فعل کی نفی نہیں ہو سکتی ــــ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی مشیت اور ارادے اپنے ارادوں اور خواہشوں کی مثل ہی سمجھ رکھے ہیں۔ اور یہ سراسر خطا ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کی تعریف اس ذات واحد ہی کے لیے ہے۔ کسی صفت میں اس سبحانہٗ و تعالیٰ کو اپنی مثل جاننا شرک عظیم ہے۔ اس ذوالجلال والاکرام کی مشیت اور ارادے عیوب کی طرف حاکم نہیں ہُوا کرتے اور نہ ہی کبھی ہوں گے۔ وعدہ کا خلاف کرنا عیب ہے اور مولیٰ کریم تمام عیوب سے پاک ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

مَّآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۬ — جو پہنچتی ہے تجھ کو بھلائی سے پس خدا کی طرف

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ — سے ہے اور جو پہنچتی ہے تجھ کو بُرائی سے پس

نَّفْسِكَ ۭ (پ۵ - ۸) — نفس تیرے سے ہے۔

تو کسی عیب کے لیے اس قادرِ مطلق کی قادریت کو منسوب کرنا اور ایسا اعتقاد کرنا کہ کرتے تو نہیں لیکن کر سکتے ہیں، سراسر جہالت اور ذات پاک پر الزام کے سوا نہیں ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ اپنی تعریف میں لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ کا ارشاد فرماتے ہیں۔ اب ایسا گمان کرنا کہ اُونگھ اور نیند کرتے تو نہیں لیکن کر سکتے ہیں، اور اس بات پر قادر ہیں، ورنہ قادریت میں نقص وارد ہوتا ہے۔ تو اس جہالت کا کیا ٹھکانا۔ کہ تمام ممتنعات اور سیئات پر اس ذات پاک کو قادر سمجھ لیا جائے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ اِعْتِقَادِ السُّوْءِ۔ اور یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جو فعل اس ذات پاک کے لائق نہیں ہیں وہ ان پر قادر بھی نہیں ہیں۔ قدرت تو صرف ممکنات کے ساتھ مختص ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قادر تو ہوں، لیکن چونکہ وہ عیب ہے اس لیے اس کو کرتے نہیں ہیں۔ اس کی فہمائش کے لیے خداوند کریم ذوالجلال والاکرام نے اپنے کلام پاک میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ — اور زمین میں یقین والوں کے لیے میرے نشانات

اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (پ۲۶ - ۱۸) — ہیں، اور تمہارے نفوس میں، کیا تم نہیں دیکھتے؟

آیات الٰہیہ میں سے ہمارے نفسوں میں رُوح جس کو امرِ الٰہی سے تعبیر فرمایا ہے، نشان ہے۔ عنصری وجود کے لیے سِنَۃ و نوم یعنی اونگھ اور نیند کو روا رکھا ہے جو اس کے لیے سراسر آرام

اور راحت ہے، اور حواس ظاہری کا تعطّل اور غفلت کے مترادف ہے۔ لیکن روح کے لیے نیند نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے لیے نیند کی احتیاج نہیں ہے۔ یا کھلے لفظوں میں یہ صفت روح میں ہے ہی نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (بوجہ روحانیت غالب ہونے کے) نیند کا غلبہ ہماری مثل نہ تھا یعنی آپ کی نیند باعثِ غفلت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نیند مبارک کبھی آپ کے لیے ناقضِ وضو نہ ہوئی۔ تو اس سے یہ مقصود حاصل ہوا کہ اس سبحانہٗ تعالیٰ کے لیے ایسی نسبت کا گمان بھی خطا کے سوا نہیں ہے جبکہ اس کے امر یعنی صفت کے لیے بھی روا نہ ہو۔ بلکہ اس میں اس چیز کا وجود ہی نہ ہو تو اس مالکِ حقیقی کے لیے امکان کہاں کا؟

اس میں کلام نہیں کہ مولیٰ کریم کی صفت بالذات کی ضد نہیں ہے۔ جیسے قدیر اور حیّ دو صفات ذاتیہ ہیں۔ قدرت حیات کے مخالف نہیں ہو سکتی اور حیات قدرت کی نفی نہیں کر سکتی۔ تو اس صورت میں کوئی جاہل یہ کہے کہ آپ نہ تو کبھی مرے ہیں اور نہ ہی کبھی مریں گے۔ لیکن چونکہ موت یعنی منتقل ہونا ایک فعل ہے، اور کسی فعل کی نفی يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ کی قادریت کے منافی ہے اس لیے مر سکتے ہیں۔ تو کہنا ہی پڑے گا کہ ایسی تنقید کا جو جہالت کے دریا میں مستغرق ہو علاج نہیں ہے۔ اور وہ اس لیے کہ موت یعنی منتقل ہونا، کسی وجود سے یا ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف جا گزیں ہونا ہمارے لیے مولیٰ کریم کی طرف سے روا ہوا ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بُت میں نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ یعنی حیات کو عالم امر سے وجود کی طرف مبذول کرنا اور پھر اس سے

انتقال کی صورت میں عالم برزخ کی طرف لے جانا اور وہاں سے یوم القیامۃ میں مقیم کرنے کے بعد اپنی طرف لے جانا یہ سب منازل اور مدارج خداوندی فعل سے وابستہ ہیں۔ یہ تغیر و تبدّل رُوح کے آنے اور جانے کے سوا نہیں ہے۔ خواہ اس کو انتقال کہیں یا موت سمجھیں، ہمارے جسم ہی کے متعلق ہے۔ لیکن رُوح میں (جو اس کا اصل ہے، سوائے اس کے کہ یہ جس محل و مقام میں ہو اسی کا حکم رکھتا ہے) کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ تغیر فرع کے لیے ہوتا ہے، اصل تغیر کا محل نہیں ہے۔ تو رُوح کا مرسل کرنا اور لے جانا ہم میں خداوندی فعل ہے اس لیے اس مقام و محل کی رُو سے مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن کچھ ہو، روح کے لیے موت (جس کو عوام فوت ہونے سے تعبیر کرتے ہیں) روا نہیں ہے، اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ رُوح یا دوسرے لفظوں میں انسان کے لیے (جس سے اصل انسان مراد ہے) موت جس کی مراد یہاں مفقود ہونا یا بالکل نیست و نابود ہونا ہے، روا نہیں ہے۔ بلکہ بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ نہ تو یہ اضطراری وجہ پر ہو سکتا ہے نہ اختیاری۔ بلکہ اس کی تخلیق میں نابود ہونے کا وجود ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ اب انصاف کے میدان میں حق کا طالب ہونا بعید از مقصود نہ ہو گا کہ فعل خداوندی جو مخلوق کے مترادف ہے، اس کا یہ حال ہے کہ وہ مر نہیں سکتا تو اس ذات معلّی کے لیے ایسے فعل کے امکان کا گمان جس کا وجود ہی اس سبحانہٗ وتعالیٰ کی قدرت کی بساط پر ہونا ممتنعات سے ہو کیسے روا ہو سکتا ہے؟ بلکہ ایسا گمان کرنا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔

گو اس لم یزل و لایزال، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے لیے کوئی مثال روا نہیں ہو سکتی۔

تاہم فہمید کے لیے کچھ بیان ہے۔ کہ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ کے مطابق قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کی سنت کے موافق ہر ایک چیز جس کا اصل فعل خداوندی کے سوا نہیں ہے اور اصلِ اُصُول وہ ذات پاک ہی ہے، ممکنات و ممتنعات ہر چیز اس کے اصل کے خلاف کی مقتضی نہیں ہے۔ مثلاً آگ کے شعلہ سے پانی کا ٹپکنا اور پانی سے آگ کا شعلہ، یا لکڑی سے معدنیات اور معدنیات سے لکڑی کا پیدا ہونا، یا روشنی سے اندھیرے کا وجود اور اندھیرے سے روشنی کا وجود ظاہر ہونا ناممکن اور محال ہے۔ یہ حال تو مخلوق کا ہے جو محدث ہے کہ ہر ایک کی خلقت کے خلاف صفات کا ظہور ہونا روا نہیں ہے۔ اور یہ آیات الٰہیہ کا ثبوت ہے۔ اب نور ایمانی کی روشنی میں صاف نظر آئے گا کہ اُس مالک کائنات، خالق موجودات، ہر عیب سے پاک، بے مثل و بے مثال، ہماری زعمی قادریت سے مبرا، ہمارے وہم و گمان سے ورا کی طرف کسی عیب مثلاً خلف وعید یا کذب وغیرہ کی نسبت گمان کرنا سراسر خطا بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ اس ذات پاک بابرکات میں کسی عیب کا پایا جانا جس سے ایسے افعال کا ظہور ہو مطلق محال ہے۔ اس لیے ایسے امکان کا گمان کرنا سراسر ظلم عظیم ہے۔

سوال تو یہ ہے کہ مولیٰ کریم لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ کے مطابق نہ تو خلاف وعدہ کرتے ہیں، نہ ہی کبھی کیا ہے اور نہ ہی کبھی کریں گے۔ لیکن مشیت کے میدان میں اگر اپنے اختیار یا قدرت کاملہ سے کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا اس امر کی طاقت اور قدرت اپنی ذات بابرکات میں رکھتے ہیں یا نہیں۔ کیا اس بے زوال کی قدرت کسی فعل سے عاجز بھی ہے یا ہر کام پر قادر ہے؟

جواب: تعجب ہے کہ جس قدر سوالات اس مسئلہ میں کیے گئے ہیں ان کے جوابات پر شاید غور سے کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ اوپر گزر چکا ہے کہ اس بے مثل و بے مثال کی کوئی صفت بھی ہماری صفات کی مانند نہیں ہے۔ ہمارے وعدہ کے لیے کسی مدتِ مُعیّنہ پر ایفا کا انتظار ہوا کرتا ہے۔ اگر اس وقت پر ایفا ہو گیا تو سچ ورنہ جھوٹ۔ لیکن اس عزیز الحکیم کے وعدہ کے لیے ارشاد مولیٰ کریم كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا کا مقتضی ہے۔ خواہ اس کے عمل میں تاخیر ہو لیکن اس کے ہونے کے فیصلہ میں کوئی گنجائش انتظار کی نہیں ہوا کرتی۔ اب فیصل شدہ اس قادرِ مطلق کے فعل میں تغیر کا امکان سمجھنا سوائے جہالت کے نہیں ہے۔ رہا قادریّت کا سوال، تو کئی وجہ پر جواب تو اس کا ہو چکا ہے۔ تاہم یہ ناتواں اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

عزیزا! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، اس ذاتِ احد کی صفات بالذات جو باوجود تابع ذات ہونے کے ایسا اتصال رکھتی ہیں کہ دراصل وہ ذات ہی ہیں، سات ہیں: حی، قدیر، مرید، کلیم، سمیع، بصیر، علیم۔ یہ ذات سے منفک نہیں ہیں۔ نہ ہی کبھی ہوئی ہیں اور نہ ہی کبھی ہوں گی جس طرح ذاتِ معلّٰی قدیم ہے اسی طرح یہ بھی قدیم ہیں۔ صَرف کے لحاظ سے یہ صفات صفتِ مشبّہ ہیں جس سے مقصود اتصال فی الذات کے سوا نہیں ہے۔ اور تمام افعال خداوندی جو توحید فی الخلق کے مترادف ہیں، الی الخلق فاعل ہیں۔ اور یہ صفت بالذات مرید کی تحریک کے تابع ہیں۔ گو ہر ایک صفت ذوالجلال و الاکرام اپنی صفت کی بھی مقید نہیں ہے۔ ہر صفت واصفِ کُل لامحدود ہے، تاہم ہماری

فہمید کے لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ صفت مرید بدون قدرت اور قدرت بدون حیات کے فعل کی طرف راجع نہیں ہیں، اور ان پر علم کا احاطہ وسیع ہے۔ اور امر جو کلیم کی صفت کے تابع ہے اس سے فیکون کا ظہور ہے۔ اور سماعت و بصارت اپنے فعل کی سامع اور معائنہ کرنے والی ہیں۔ باوجود حقیقت کے میدان میں ان صفات کے واصف کل لامحدود ہونے کی صورت میں تقسیم محض فہمید کے لیے روا رکھی گئی ہے۔ جس سے یہ مقصود حاصل کرنا بعید از تحقیق نہ ہوگا کہ ان میں کی ہر ایک صفت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہے، اور نہ ہی ان تمام صفات کی کوئی ضد ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ذاتِ معلّٰی اس سے پاک اور بَری ہے۔ مثلاً ذوالجلال والاکرام سمیع و بصیر اور کلیم ہیں۔ تو یہ نہ ہوا ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے کہ کبھی صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے مصداق بھی ہوں۔ اور ایک دوسرے کی ضد کی نفی اس وجہ پر ہے کہ حی بھی ہیں اور قادر بھی۔ لیکن قدرتِ مطلق کبھی اس امر کی مقتضی نہیں ہو سکتی ہے کہ مر بھی سکیں، یا مرنے کی قدرت ہی رکھتے ہوں۔ اور یہ اس لیے کہ یہ حی کی ضد ہے اور وہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی ہر صفت پاک میں ضد سے مبرا و منزّہ ہیں۔ اب نورِ ایمانی کے میزان میں غور و فکر کے صحیح اوزان سے موازنہ کرنا بعید از انصاف نہ ہوگا کہ ایسی قادریّت کے امکان کا گمان جو ذاتِ باری تعالیٰ کی صفت بالذات کی ضد ہو، سوائے جہالت کے مطلق روا نہیں ہو سکتا۔

ان سات صفات بالذات کے علاوہ دوسری صفات سب کی سب صفت بالفعل ہیں جن کا تصرف الی الخلق معروف ہے۔ ان کی نسبت دو وجہ پر متحقق ہے۔ ایک تو الی الخلق ہے جس کی نسبت خالق موجودات کی طرف ہے۔ اور دوسری جس کی نسبت مِن اللہ خلق

کی طرف ہے لیکن ایسی نسبت الی اللہ حرام ہے۔ مثلاً قدیر صفت مشبہ ہے جو اس ذات احد سے منفک نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ اس کا اثبات ذات کے ساتھ بلا واسطہ ہے بلکہ ایسا اتصال ہے جس کی تمیز محال ہے۔ گویا قدیر ہیں تو مطابق واصف کل جیسا اوپر گزر چکا ہے لامحدود ہیں۔ قدیر ہیں تو سارے ہی ہیں۔ یعنی سراسر قدرت ہی ہیں۔ اور اسی طرح ہر ہر ایک وصف میں ہیں۔ اور قادر ہونا کسی غیر پر قدرت رکھنا یا قابو پانا ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ جس کے معنی مسلمہ ہیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ چونکہ اس جگہ لفظ قَدِیْرٌ استعمال ہوا ہے اس لیے جاننا چاہیے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنی صفت لایزال میں قدیر ہیں، اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ کی رُو سے قادر۔ یعنی صفت بالذات کی رُو سے تو قدیر ہیں اور صفت بالفعل کے لحاظ سے قادر۔ چونکہ ایسے صفات کے دو رُخ ثابت ہیں اس لیے اب ان صفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اوپر کی دلیل کے موافق ہیں۔ یعنی جو نسبت محض خلق کی طرف ہے وہ ذاتِ معلیٰ کے لیے حرام ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

وہی ہے اللہ جو نہیں کوئی معبود مگر وہ۔ بادشاہ ہے بہت پاک، سلامت سب عیبوں سے امن دینے والا نگہبان، غالب، زبردست، تکبر والا۔ پاکی ہے اللہ کو اس چیز سے کہ شریک لاتے ہیں۔ وہی ہے اللہ پیدا کرنے والا، درست کرنے والا، صورتیں بنانے والا واسطے اسی کے ہیں نام اچھے۔ پاکی بیان کرتے ہیں واسطے

وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (پ ۲۸ - ر ۶ - سورہ حشر)

اس کے جو کچھ بیچ آسمانوں کے اور زمین کے ہیں اور وہی ہے غالب حکمت والا۔

ان صفات میں سے مَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ اور عَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ اور عَزِیْزُ الْحَکِیْمُ تو ذات باری تعالیٰ کے لیے ہے جن کی نسبت مخلوق پر مالک ہونا، دوسرا حادث و عیوب سے پاک ہونا، اور مخلوق کو پیدا بر حکمت کرنا اور اس پر غالب ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اور ان صفات کی نسبت ذوالجلال والاکرام کی طرف ہے۔ جو کسی حال میں بھی مخلوق کی جانب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ممتنعات سے ہے۔ باقی صفات میں سے خالق، باری، مصور کی نسبت مخلوق کی جانب ہے خالق کی طرف سے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ خالق تو ہیں مخلوق نہیں ہیں۔ باری ہیں لیکن خود پیدائش نہیں ہیں۔ مصوّر تو ہیں لیکن خود تصویر نہیں ہیں۔ اور ان کے لیے اسماء الحسنیٰ ہیں، سیئہ نہیں ہیں۔ اس کی نسبت خواہ تابع صفت بالفعل ہو یا صفت بالذات، سبحانہٗ و تعالیٰ کے لیے کسی صورت میں روا نہیں ہے۔ اسماء الحسنیٰ سے یہ مقصود حاصل کرنا بعید از ایقان نہ ہوگا کہ ہر اسمائے الٰہیہ سے اس کے تحت میں یا اس کی صفت کے مطابق معانی اور افعال ہوا کرتے ہیں۔ جیسے خالق کو مخلوق سے، رازق کو مرزوق سے نسبت ہے۔ اب جاننا چاہیے کہ صفات بالفعل جو دراصل صفات بالذات ہی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ صفات بالفعل تابع صفات بالذات ہیں اور صفات بالذات تابع ذات۔ تو ان تمام صفات میں مقصود حاصل کرنا لازم ہے کہ جن صفات بالفعل کی نسبت ربّ العالمین کی طرف ہے اور جن کی نسبت مِن اللہ خلق کی طرف ہے، کیا فرق ہے اور اس فعل سے مفاد کیا ہے؟

جاننا چاہیے کہ جن صفات بالفعل کی نسبت ذات کی طرف ہے وہ غیر کی طرف ہرگز روا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جب غیر نہ تھا تب بھی ان صفات کی قدرت ذات معلیٰ میں جیسی کہ اب ہے موجود تھی۔ اور جونسی صفات جن کی نسبت حدث کے مترادف ہے، مخلوق کے لائق ہیں اور ان کی نسبت ذات معلیٰ کی طرف کرنا کفر اور جہالت کے سوا نہیں ہے۔ کیونکہ مولیٰ کریم خالق تو ہیں۔ اور مطابق یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ جیسی چاہیں مخلوق پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس قدرت کی نسبت یعنی عمل اپنی ذات کے لیے روا نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق محدث ہے جو تغیر کا محل ہے اور اس کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف حرام ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس مولیٰ کریم کا وعدہ کسی مخلوق ہی سے ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔ لیکن اس کے خلاف یا ایفا کی نسبت مخلوق کی طرف ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ محض اپنی ذات پاک کی طرف ہے۔ اور وعدہ خلافی ایک صریح عیب ہے۔ اور مولیٰ کریم تمام عیوب سے پاک ہیں اور قدرت اس امر کے منافی ہے کہ وعدہ خلافی کا ارتکاب ہو سکے۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ ذات میں اس کی قدرت کا بھی اعتقاد رکھنا سراسر جہالت بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ جس طرح قدرت کے میدان میں صفت بالذات کے خلاف کا امکان ناممکن ہے اسی طرح خُلفِ وعید بھی اسی کے مترادف ہے۔ اور یہ اس لیے کہ قدوس مولیٰ کریم کی اعلیٰ صفات سے ہے جس کے معانی تمام عیوب سے پاک اور مقدس ہونے کے ہیں۔ اگر زعمی قادریت کی وسعت کے لحاظ سے خلف وعید کے امکان کے جواز پر یقین کیا جائے جو سراسر عیب ہے تو صفت قدوس ذات باری تعالیٰ میں تغیر واقع ہو گا۔ اور یہ محال ہے۔ اس صفت قدوس کی نسبت مخلوق کی طرف کسی وجہ پر بھی منسوب

نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق تغیّر و حُدُوث کا محل ہے اور اس ذات پاک کی صفات میں تغیر روا نہیں ہے۔

مکرّر

یہ کہ ذات سبحانہٗ و تعالیٰ میں بدوں عُرفِ الٰہیہ کے غور و فکر کرنا جہالت ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ ذات کے لیے مخلوق میں غور و فکر کرو تاکہ مقصود حاصل ہو۔ اور ذات پاک میں تدبر سے کام نہ لو۔ کلام الٰہی بھی اس حدیث شریف کی تطبیق کرتی ہے جیسا اوپر گزر چکا ہے وَفِیْۤ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

عزیزا! عزیز الحکیم اپنی حکمت کاملہ سے تجھے حصّہ نصیب کریں، جاننا چاہیے کہ خالق مخلوقات، موجد موجودات نے کس تدبیر پر مخلوق کو پیدا کیا ہے اور کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ کی سنت کیسی زبردست واقعہ ہوئی ہے۔ جس کا مطابق لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا تغیر و تبدل محال ہے۔ مثلاً پانی سے آگ اور آگ سے پانی، بھاپ سے جمادات اور نباتات سے معدنیات علیٰ ہٰذا القیاس لطیف سے کثیف اور کثیف سے لطیف کا فعل سرزد ہونا مطلق ناممکن ہے۔ اب نورِ ایمانی سے یہ معلوم کرنا بعید از تحقیق نہ ہو گا کہ سوائے اُن افعال کے جو باری تعالیٰ کی ذات کے لائق ہوں امکان کا گمان کرنا جہالت اور نادانی ہے۔

بار بار سوال خداوندی قدرت اور طاقت ہی پر ہو رہا ہے کہ کسی فعل کو فاعل حقیقی کریں یا نہ کریں، طاقت رکھتے ہیں۔ وہ قدیر اپنی قدرت کاملہ میں قادر اتم ہیں یا نہیں؟ اس لیے اب میں اس لم یزل و لایزال، بے مثل و بے مثال ہی سے توفیق مانگتا ہوں تاکہ

اسی کی طاقت اور قدرت سے اس مشکل کو حل کروں۔ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ قدیر ایک صفت بالذّات ہے جس کی کوئی ضد نہیں ہے۔

بہر حال اور بہر وجہ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کے رُو سے قادر ہیں جن کا تصرّف حقیقت کے میدان میں تین نوع پر منقسم ہے: (۱) تصرّف فی الذّات (۲) تصرّف فی الامر (۳) تصرّف فی الخلق۔

(۱) تصرّف فی الذّات: الآن کما کان، ذات کے لیے ذات میں نہ تصرف نہ تحریک اور نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ صفت بالذات محض تابع ذات، متبوع کے لیے تابع کا تصرّف حرام۔

(۲) تصرف فی الامر: یعنی عالم امر کی تخلیق، جب صفت مُرید کو ذات باری تعالیٰ نے ظہور کے میدان میں اپنی مشیت سے تحریک کی تو عالم امر کی طرف رجوع فرمایا، اور جیسا کہ چاہا' اپنے تصرّف سے ہویدا کر دیا۔ اور اس میں تصرف رُوحی کا اجرا رکھا ہے۔ مثلاً لوحِ محفوظ اور قلم و رقم کتاب مسطور سب کے سب نوری وجود میں ثابت ہیں۔ اور قدرت اور تصرف بھی ان کے لیے ان کے مقام و محل اور وجود کے موافق ہی متصرف ہوا ہے۔

(۳) تصرّف فی الخلق: اظہر من الشمس ہے جس کی تخلیق عالم شہود میں خاکی وجود سے واقع ہوئی ہے، جو کئی نوع پر منقسم ہے۔ تاہم تصرف دو وجہ پر ہے۔ ایک سرشتی اور دوسرا اضافیہ جو تقدیر کے بیان میں گذر چکا ہے۔ تو خواہ سرشتی ہو یا اضافیہ، ہر دو کی قدرت اور طاقت بہر کیف من اللہ ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرشتی توفیق میں انسان قدریہ کے

موافق ہے یعنی کسی قدر اختیار من اللہ روا ہے۔ اور اضافیہ میں جبریہ کے مطابق ہے اور یہ محض تصرفات خداوندی سے ہے جس میں آدمی مجبور اور لاچار ہوتا ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝ — ہم نے پیدا کیا ہے تم کو پس کیوں نہیں مانتے تم، یعنی

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ — دوبارہ اُٹھنا۔ کیا پس دیکھا تم نے جو نطفہ ڈالتے ہو تم۔ کیا

اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ (پ۲۷-۱۵) — تم پیدا کرتے ہو اس کو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ — کیا پس دیکھا تم نے جو بوتے ہو تم۔ کیا تم کھیتی کرتے

تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ — ہو اس کو یا ہم کھیتی کر دیتے ہیں؟ (پ۲۷ - ۱۵)

یعنی نطفہ رحموں میں ڈالنا تمہارا کام ہے لیکن بچہ بنانا میرا کام ہے۔ اور تخم زمین میں دینا تمہارا کام ہے، اور اُگانا اور پرورش کرنا میرا کام ہے۔ اب جاننا چاہیے کہ نطفہ یا بیج وجودی نظام کے رو سے وجود سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو ہمارے فعل سے متعلق فرمایا ہے۔ اور اس کی پرورش چونکہ روحانی ہے اس لیے رُوحی تصرف کو جو قادریت کے مطابق ہے' اپنے فعل سے منسُوب کیا ہے۔ درحقیقت سرشتی توفیق بھی اس ذوالجلال والاکرام ہی کی طرف سے ہے۔ اور موجد موجودات وہی خالق کائنات ہے' تاہم تقسیم کو محل و مقام کے رو سے اسی کی جانب نسبت دی ہے۔ اور اعمال کے رو سے تغیر حال کی وجہ پر جب اضافیہ تصرفات کا اجرا ہوتا ہے تو خواہ وہ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کی وجہ سے غضبی صورت ہو، یا فرماں برداری کے رو سے رحمی، مطابق فرمان ایزد متعال مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (پ۲۴-۱) کا تصرّف قدرت خداوندی سے ہوا کرتا ہے۔ اب اس میں

تو کلام نہیں کہ سرشتی توفیق سے ہو یا اضافیہ تصرف سے، سب کا سب اس فاعل حقیقی کے فعل سے ہے۔ زیادہ طول دینا اس جگہ مقصود نہیں، تفصیل سے تقدیر کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے۔ مقصود اس جگہ طاقت اور قدرت کے اثبات پر ہے، اور اثبات قدرت ذات بلا ثبت ماسوائے بے مثال و بے زوال الآن کما کان ہے۔ اور ہر قدرت اس قدیر کے تابع اور مسخر ہے جو غالب کل غالب کے مصداق ہے۔ لیکن ذاتی تصرفات کے بغیر ہر مقام و محل پر قادریت صفت بالفعل کے مترادف ہے۔ جیسا اوپر گذر چکا ہے کہ عالم امر میں تصرفات روحی ہیں اور عالم شہود میں تصرفات اجسادی۔ اور وہ اس لیے کہ جب کچھ نہ تھا مولیٰ کریم اپنی ذات میں سوائے صفت بالذات کے کوئی ظہور نہ رکھتے تھے۔ جب ظہور چاہا تو اپنی قدرت کاملہ سے عالم امر کی طرف مرید ہوئے، اور وہاں سے عالم موجودات کی طرف ظہور اتم فرما دیا۔ اس سے یہ مقصود حاصل کرنا لازم ہے کہ خواہ عالم امر ہو یا عالم اجساد معیّت خداوندی کے سوا نہیں ہے، جو کل تصرفات اور قدرت کا مالک ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔ گو یہ معیّت ذات سے صفت بالذات اور صفت بالذات سے صفت بالفعل کے منازل کی وجہ پر ہے لیکن اس ذات سبحانہٗ و تعالیٰ کے لیے ان منازل کی رو سے قرب و بُعد کا باعث نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ کلام پاک میں فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ — کیا نہ دیکھا انہوں نے طرف پرندوں کے اوپر اپنے پَر

وَّيَقْبِضْنَ ؔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ — کھولے ہوئے اور سمیٹ لیتے ہیں نہیں تھام رکھتا ان کو

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (پ۲۹ ۔ س ۲) — مگر رحمٰن۔ یقیناً وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

یعنی پرندوں کے فعل کو اپنے فعل کی جانب صریح نسبت فرمائی ہے جو عین قدرت ہی ہے لیکن یاد رہے کہ اس سے ذات کو حلول نہیں ہے، اور حلولیوں کے سب قول باطل ہیں:

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

مطابق قول بزرگے "جو حدث کو قدم سے نہیں پہچانتا یعنی اس کے فرق کو نہیں جانتا۔ وہ اپنے سب اقوال میں جاہل ہوتا ہے"۔

عزیزا! مولیٰ کریم تجھے نیک سمجھ عطا فرمائیں، محل و مقام کے لحاظ سے بہر صورت اور بہر وجہ تمام طاقتیں اور تمام قدرتیں اس قادر مطلق ہی سے ہیں۔ لیکن ان افعال کو جو حدث کے لائق ہیں، قدم کی طرف منسوب کرنا سراسر جہالت ہے۔ مثلاً اولاد کا پیدا کرنا مطابق ارشاد ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ فعل خداوندی سے وابستہ ہے جس کا مقام و محل مخلوق کے سوا روا نہیں ہے۔ لیکن ذات پاک سے ذات سبحانہٗ و تعالیٰ کے لیے ایسی قدرت کا جاننا کفر اور شرک ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ — نزدیک ہیں آسمان کہ پھٹ جائیں اس سے اور

تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ — پھٹ جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر اس سے

هَدًّا ۙ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ — کہ دعویٰ کیا انھوں نے واسطے اللہ کے اولاد کا۔ اور

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ — نہیں لائق واسطے رحمٰن کے یہ کہ پکڑے اولاد۔

وَلَدًا ؕ (پ۱۶ ۔ س ۹) — (سورۂ مریم ۱۹ ۔ آیت نمبر ۹۰ - ۹۲)

یا فرمایا ہے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۔ یعنی اس کو اُونگھ اور نیند نہیں آتی۔ اب

یہ خیال کرنا کہ سوتے تو نہیں۔ لیکن اگر چاہیں تو قدرت کے منافی نہیں ہے۔ تو اس نادانی کا کیا علاج ہے؟ اونگھ کرنا یا سونا وجود کے لیے موجب راحت ہے اور رُوح کو اس فعل یعنی نیند کی احتیاج نہیں ہے۔ تو ایسی قدرت جو مخلوق میں نہ پائی جانی ثابت ہے۔ اس کی نسبت خالق کونین کی طرف کیا ہو گی؟

اب ذرا نورِ ایمانی سے مطابق سنت اللہ جلّ شانہٗ کے فکر کرنا غیر مفید نہ ہو گا کہ اس قادرِ مطلق کی قدرت کا ظہور عالمِ رُوحانیت اور عالمِ شہود میں اظہر من الشمس ہے، جو تغیر کا محل ہے۔ اور ذات سبحانہٗ و تعالیٰ میں تغیر روا نہیں ہے۔ تو ایسی قدرت کا گمان جو محدث کے لائق ہو اس کی نسبت حق تعالیٰ کے لیے حرام ہے۔ ان صاحبان پر سخت تعجب ہے جنہوں نے اس ذات پاک کی قادریت کو ہر فعل نیک و بد پر روا رکھا ہے۔ اور معیار یہ رکھا ہے کہ قادریت کے کسی جز کی نفی قادرِ مطلق کی قدرتِ اتم میں نقیض واقع ہونے کی مقتضی ہے۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ اس لم یزل ولایزال کو اپنی مثل خیال کر رکھا ہے اور یہ سراسر نادانی اور جہالت ہے جس کی وجہ حدث سے قدم کو نہ پہچاننا ہے۔

عزیز! عالمِ موجودات سے عالمِ محسوسات لطیف اور وسیع ہے۔ اور عالمِ محسوسات سے عالمِ معلومات لطیف اور وسیع تر ہے، اور عالمِ معلومات سے عالمِ معروفات لطیف در لطیف اور وسیع ہے، جو عالمِ امر کے مترادف ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ ان تمام عوالم سے بدرجہا بالاتر لطیف لطیف ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ نہیں پاتی ہیں اس کو آنکھیں اور وہ پاتا ہے سب

الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (پ ۱۹) نظروں کو۔ اور وہی ہے باریک بین خبردار۔

آنکھ وجود میں لطیف ہے، اور اس (آلۂ نظر) میں نورِ بصارت لطیف تر۔ علیٰ ھٰذا القیاس ان تمام عالموں کو ایک دوسرے سے قریب ہونے کے لحاظ سے رشتہ تو ہے، لیکن لطیف ہونے کے رو سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ کیونکہ موجودات پر محسوسات کا احاطہ تو ہے، لیکن محسوسات پر موجودات کا احاطہ نہیں ہے۔ اسی طرح محسوسات پر معلومات کا احاطہ ہے لیکن محسوسات کو معلومات پر احاطہ مشکل کیونکہ علم کی حس محسوسات میں نہیں ہے، لیکن محسوسات سے علم کو احساس ہوا کرتا ہے۔ ایسا ہی معلومات پر عالمِ معروفات کا احاطہ وسیع تر ہے۔ عارف عالم ہوتا ہے اور عالم عارف نہیں ہوتا۔ یعنی ان تمام عالموں کو جو محاط کے درجہ پر ہیں، محیط کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے اور محیط ان پر لطافت کے رو سے غالب ہے۔ محیط کی قدرت محاط پر ہر لحاظ سے ممکن ہے، لیکن محاط محیط پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے محیط کا فعل کسی محاط کی مثل نہیں ہو سکتا۔

گو اس بے مثل کے لیے کوئی مثال درست نہیں آ سکتی تاہم فہید کے لیے اس سے چارہ نہیں۔ بموجب ارشاد اللہ جلّ شانہٗ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ غور کرنا لازم ہے کہ ہمارے نفوس یا ضمیر یا وجود میں سوائے رُوح کے کوئی چیز نہیں ہے۔ سب قدرت اور طاقت وجود میں روح ہی سے ہے۔ ہر قسم کی حرکات و سکنات اور افعال اسی سے سرزد ہو رہے ہیں۔ عالمِ شہود کی زندگی سے موت تک بحکم خدا رُوح ہی رب الوجود ہے۔ یعنی تمام نشو و نما اسی سے ہے۔ جسمانیت کا محافظ و رہنما، اس کشتی بے حس کا ناخدا، تمام اثرات کا حامل، روحانیت کے

میلان کا شجر، وجود میں داخل ہونے سے باعث زندگی، اور خارج ہونے کی صورت میں موجب موت اور عفونت و پراگندگی ہے۔ باوجود وجود میں بمنزلہ فاعل حقیقی ہونے کے اس کو وجود سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وجود سے بدرجہا لطیف تر ہے۔ وجود مثل جامہ کے ہے اور یہ صاحب جامہ۔ سوائے اُن افعال کے جو محض روحانیت سے مناسبت رکھتے ہیں، وجودی افعال مثلاً کھانا، پینا، سونا اور مباشرت وغیرہ جن سے اثبات وجود ہے، گو رُوح کے بغیر ان کا تصرف وجود میں مطلق ناممکن ہے تاہم رُوح کو ان افعال سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا ان کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی افعال وجودی کا سوائے وجود کے ظہور رہونا اس کی ذات سے محال ہے۔ باوجود قدرت رکھنے کے ایسے افعال کا وقوع اس کے احاطۂ امکان سے باہر ہے۔

رُوح کلام الٰہی کے لحاظ سے امرِ الٰہی ہے جو قبل از ظہور متحقق بالذّات اور بعدہٗ عالم روحانیت میں مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے رو سے امر اور اب محل و مقام کی وجہ پر مخلوق کا حکم رکھتا ہے۔ جب مخلوق کا اپنی سرشت میں یہ حال ہے تو خالق کائنات بے مثل و بے مثال جس کی نسبت سوائے صفت بالفعل کے مخلوق کے ساتھ روا نہیں ہو سکتی کیا گمان ہو سکتا ہے؟ بمصداق

جو کچھ کہ قیاس اور گمان وہم میں آئے
اس سے بھی ورا بلکہ ورا سے بھی ورا ہے

جو گمان بھی ہم کریں گے، ہم خود ہی ہوں گے، نہ کہ خدا جلّ و علیٰ۔

انسان ماخذ فی الضمیر کے سوا معرفت الٰہی میں مطلق جاہل ہے، اور ان صاحبان کی

غلطی کا سبب بھی یہی ہے۔ اس لیے سوائے قرآن الحکیم کی دلیل کے چارہ نہیں ہے۔ دیکھ اور فکر کر، تاکہ حقیقت تجھ پر ظاہر ہو کہ اللہ جل شانہٗ نے ہر مقام و محل کے مطابق اپنے فعل کی کس طرح تصریح فرمائی ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (پ ۳۰۔ ۳۰) (سورۃ الفیل)

کیا نہ دیکھا تو نے کیونکر کیا پروردگار تیرے نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ، کیا نہ کر دیا مکر ان کا بیچ گمراہی کے۔ اور بھیجے اوپر ان کے پرند جانور جماعت جماعت۔ پھینکتے تھے ان پر پتھر کنکر سے۔ پس کر دیا اُن کو مانند بھوسے کھائے ہوئے کے۔

یعنی فعل کو فاعل حقیقی نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اور مقام و محل کے رو سے ابابیل کو ملازم کیا ہے۔ کیونکہ عالم اسباب میں سنت اللہ اسی طرح جاری ہے، اور تا قیامت اسی طرح جاری و ساری رہے گی۔ دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ (پ ۱۹)

بھلا تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کس طرح دراز کر کے پھیلاتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھیرا رکھتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل ٹھیرایا۔ پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچ لیا۔

یہ پہلی دلیل سے بھی زیادہ روشن اور صاف ہے کہ سایہ کا بڑھانا، ٹھیرانا اور سمیٹنا سب اپنے

فعل کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ اس کا رہنما ہم نے سورج کو بنایا ہے۔ یعنی بظاہر دیکھنے میں تو سایہ کی حرکات وسکنات آفتاب کی حرکت کے تابع ہیں لیکن فاعلِ حقیقی اللہ جلّ شانہٗ ہیں۔ اب یہ مسلمہ امر ہے کہ سایہ سورج کی ضیا کے سامنے اوٹ کے باعث ہے۔ اگر آفتاب نہ ہوتا تو سایہ کا وجود ہونا ناممکن تھا۔ آج اگر سورج (جو مخلوق ہے) بحکم خدا فنا ہو جائے تو کہاں کا سایہ اور کیسی حرکات وسکنات ؛ تو سمجھنا چاہیے کہ مولیٰ کریم کا ہر فعل مقام ومحل کے رو سے اسی کے موافق ہوا کرتا ہے۔ رُوح کے مرسل کرنے اور واپس لیجانے کے لیے اسی کے موافق ملک مؤکل کیے ہیں اور عالم شہود میں اپنے تصرفات اور فعل کے لیے موجودات ہی میں برگزیدہ فرمائے ہیں۔ اور ہر قسم کے تصرفات اس فاعل حقیقی ہی کی طرف سے متصرف ہیں۔ خصوصًا انسان کے ذکر میں جس کا بیان قرآن الحکیم میں اظہر من الشمس ہے۔ خواہ توفیق یعنی سرشتی وجہ پر ہو یا اضافیہ، ہر فعل کے موجد اللہ جلّ شانہٗ ہی ہیں۔ سرشتی توفیق وہ ہے جو انسان کی سرشت میں مرسل کی گئی ہے۔ مطابق :

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ٭ قَدْ	پس جی میں ڈالی اس کے بدکاری اس کی اور پرہیزگاری
اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٭ وَقَدْ خَابَ مَنْ	اس کی۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے پاک کیا اس کو اور
دَسّٰهَا ٭ (پ۳۰۔ ع۱۶)	بیشک نامراد ہوا جس نے گاڑ دیا اس کو۔

یہ آزمائش کے میدان میں امر ونواہی کی وجہ پر اعمال کے رُو سے ہے۔ اور اضافیہ صورت وہ ہے کہ آزمائش اور فیصلہ ہو جانے کے بعد تصرف الٰہی (خواہ غیرت کی رو سے ہو، خواہ رحمت کی وجہ پر) انسان کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ :

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ	پس جس کو ارادہ کرتا ہے اللہ یہ کہ ہدایت کرے اس کو
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ	کھول دیتا ہے سینہ اس کا واسطے اسلام کے۔ اور جس
اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا	کو ارادہ کرتا ہے یہ کہ گمراہ کرے اس کو کرتا ہے سینہ
حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ	اس کے کو تنگ، بند۔ گویا کہ زور سے چڑھتا ہے بیچ
كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى	آسمان کے۔ اسی طرح کرتا ہے اللہ ناپاکی اوپر ان
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٭ وَهٰذَا	لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے۔ اور یہ ہے راستہ
صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ٭ (پ۸۔ ع۲)	پروردگار تیرے کا سیدھا۔

جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک تو بندہ سے خداوند کریم کی طرف، اور دوسرا خداوند عزّ وجلّ کی طرف سے بندہ کی جانب۔ بندہ سے رب العزّۃ کی طرف سوائے فرماں برداری اور مجاہدہ کے نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بندہ کی طرف تصرفات عنایت، رحمت اور ہدایت ہے۔ جیسا کہ آیت شریف میں بیان فرمایا ہے کہ جس کے لیے ہم ہدایت کا ارادہ کرتے ہیں، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں، اور جس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتے ہیں۔ تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ سرشتی توفیق میں تو فضل خداوندی توفیق کی وجہ پر ہے اور اضافیہ صورت کی رو سے تصرف الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ خواہ مقامؔ حال کی وجہ سے کسی صورت پر ہو، اس خالق کائنات، موجد موجودات کے تصرفات ہی سے ہے۔ اس سے یہ مفاد حاصل کرنا سراسر موجب ہدایت ہوگا کہ سرشتی توفیق جس کے آزمائش کے میدان میں دو رُخ ہیں: فرماں برداری اور نافرمانی۔ اور کلام پاک سے اس کا فیصلہ

یوں فرمایا ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۚ (پ۔ ۵)

جو کچھ پہنچتا ہے تجھ کو بھلائی سے پس خدا کی طرف سے ہے، اور جو کچھ پہنچتا ہے تجھ کو بُرائی سے پس وہ نفس تیرے سے ہے۔

چونکہ سیئات میں (جن کو انسان کی طرف منسوب فرمایا ہے) کسی قدر انسان کو مختار کیا ہے، اس لیے اس کی نسبت خلاف کلام اللہ مولیٰ کریم کے فعل کی طرف کرنا ظلم عظیم ہے۔ ایسا ہی اُن افعال کی نسبت جو عیب ہیں، اللہ تعالیٰ کے فعل کی طرف منسوب کرنا کفر ہے۔ کیونکہ سبحانہٗ تعالیٰ کی تعریف مَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ ہے، اور قادریت کے میدان میں ایسی نسبت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا قدوسی صفت کی ضد ہے۔ اور وہ ذات معلیٰ ضدوں سے پاک ہے۔ ہاں غیرت کے رُو سے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ کی وجہ پر فعل خداوندی کا تصرف مسلّم ہے، جس کی نسبت قادریت کے میدان میں سنت اللہ کے موافق ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تمام تصرفات ہمارے حال کی وجہ پر صفت بالفعل سے وابستہ ہیں۔ گو صفت بالفعل کا واسطہ صفت بالذات کے ساتھ ہے لیکن صفت بالفعل کے سوا ذات سے ان اوصاف کو کوئی نسبت نہیں ہے ــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ــــ اور اس کی نمائش کے لیے اوپر رُوح اور جسم کی مثال گزر چکی ہے۔ یعنی وجودی افعال (کھانا، پینا، سونا وغیرہ) کوئی فعل رُوح کے سوا نہیں ہے لیکن باایں ہمہ رُوح ان تمام عوارضات سے مبرا و منزہ ہے۔ تو مقام غور ہے کہ اس لم یزل ولایزال، بے شل و بے مثال کے لیے مخلوق کی سی نسبت کرنا

کونسی قادریت کو ثابت کرنے کے لیے روا ہوگی؟ اب اس امر سے خوف کرنا چاہیے کہ ان افعال کی نفی جو ذات سبحانہٗ وتعالیٰ کے ہرگز لائق نہیں ہوسکتی، قدرت اور طاقت کی نفی پر قیاس کی جا رہی ہے ــــ ہیہات۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ میں بغیر معرفت الٰہی کے کلام جہالت کے سوا نہیں ہے۔ اور یہاں معرفت تو درکنار، معلوم ہوتا ہے کہ علم ذات باری تعالیٰ کے نہ ہونے کی وجہ سے قادرِ مطلق کی قادریت کو اپنی ہی قدرت اور طاقت پر قیاس کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلف وعید کی قدرت کے قائل ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ عیب ہے جو اس قدوس کی شان کے لائق نہیں۔ نہ معلوم کہ عیب تو درکنار، جو مخلوق کے نزدیک کار ثواب اور روحانیت کا ثمر اور اعلیٰ مقصود ہے وہ بھی ذات باری تعالیٰ کے لیے مطلق روا نہیں ہے۔ مثلاً عبادت کرنا، عاجز ہونا، ثواب کا طالب ہونا، مجاہدہ کرنا، فقر و الی اللہ کے راستہ صراط المستقیم پر چلنا، قرب خداوندی کے لیے سعی کرنا، ذکر اور فکر کرنا، ندامت کے ساتھ توبہ کرنا۔

اب ذرا گوش ہوش سے پنبۂ غفلت کو ہٹا اور چشم بصیرت کو کھول، اور طالب حق کے قدموں کو ادب کی بساط پر رکھ کر تحقیق کے ترازو میں نور ایمانی کے اوزان سے موازنہ کر کے دیکھ کہ جس کی شان میں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کا فرمان ہے اس کے لیے کسی فعل کی مناسبت و مماثلت کسی مخلوق سے روا ہوسکتی ہے؟

انسان ازلی سعید ہے

سوال: قرآن حکیم میں فرمان مولیٰ کریم ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (پ ۹ - ع ۱۲)

اور البتہ بیشک پیدا کیے ہم نے واسطے دوزخ کے بہت جنوں سے اور آدمیوں سے۔ واسطے ان کے دل ہیں کہ نہیں سمجھتے ساتھ ان کے اور واسطے ان کے آنکھیں ہیں کہ نہیں دیکھتے ساتھ ان کے اور واسطے ان کے کان ہیں کہ نہیں سنتے ساتھ ان کے۔ یہ لوگ مانند چارپایوں کے ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ تر گمراہ ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں غافل۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اس خالق موجودات نے اکثر آدمیوں اور جنوں کو جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس آیت سے لازم آتا ہے کہ یہ رنگ آمیزی ازل ہی سے مشیت ایزد متعال کے موافق قدرت کی بساط پر گل کاری کی مقتضی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ چون وچرا کرے۔

جواب: مَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔ اس مسئلہ کا انحصار ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ پر ہے یعنی پیدا کیا ہے ہم نے واسطے جہنم کے۔ اس میں کلام نہیں کہ لغت کے لحاظ سے ذَرَأْنَا کے معنی سوائے آفرینش یعنی پیدائش کے نہیں ہیں۔ اسی لیے سب مفسرین اسی پر ہیں اور یہ بالکل بجا و درست

ہے۔ لیکن ذَرَأْنَا اور خَلَقْنَا میں بڑا فرق ہے۔ ہر خَلَقْنَا عدم سے ہستی کی طرف ظہور کے لیے منسوب ہوا ہے جب اس خالق کائنات نے انسان کی تخلیق کا ارادہ کیا تو فرمایا: إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ (میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں) اور اس کو خلقت اول سے نامزد کیا ہے۔ بعدہٗ جب جنس سے جنس کی تخلیق منظور ہوئی تو یوں ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ (پ ۱۸ ع ۱)

اور تحقیق پیدا کیا ہم نے آدمی کو ستی ہوئی یعنی بچی مٹی سے پھر پیدا کیا ہم نے اس کو ایک قطرہ منی کا بیچ جگہ مضبوط کے۔ پھر پیدا کیا ہم نے منی کو لہو جما ہوا۔ پس پیدا کیا ہم نے لہو جمے ہوئے کو بوٹی گوشت کی۔ پس پیدا کیا ہم نے بوٹی کو ہڈیاں، پھر پہنایا ہم نے ہڈیوں کو گوشت پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش اور۔ پس برکت والا ہے اللہ بہتر پیدا کرنے والوں کا۔

اس تخلیق کو خَلْقًا آخَرَ سے موسوم فرمایا ہے۔ خواہ خلق اول ہو یا خلق آخر، بہرکیف اس خالق یکتا کے فعل حقیقی کے سوا نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو تخلیق عدم سے ظہور کی طرف پیدا ہوئی ہے وہ بلا تصرف و دخل ماسوی اللہ واقع ہوئی ہے۔ وہ خلق اول ہے۔ اس پر ذُرِّيَّة کا لفظ مطلق نہیں آ سکتا۔ اور نہ ہی وہ کسی کی ذُرِّيَّة (اولاد) ہے۔ اور جو تخلیق کسی جنس سے بحکم خدا ظہور میں آئی ہے یہ خلق آخر ہے۔ گو مشیت ایزد متعال کی قدرت کاملہ کے ضمن میں یہ بھی مخلوق ہے۔ لیکن اس کے لیے ذُرِّيَّة ہی کا حکم بجا و درست ہے۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ — اور جب لیا پروردگار تیرے نے بیٹوں آدم کے سے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (پ ۹) — پیٹھوں ان کی سے اولاد ان کی کا یعنی عہد۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ ذریّۃ بمنزلہ فرع کے ہے اور خلقت اوّل بمنزلہ اصل۔ ذریّۃ بمعنی اولاد کے ہے اور ہر خلقت اوّل اس سے مبرا ہے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر چیز جس کا ظہور ہو چکا ہے، اور جو کچھ ظاہر ہونے والا ہے اس ذات پاک کے علم میں متحقق بالذات ہے جب ظہور چاہا تو عالم امر کی طرف مرید ہوئے یعنی عالم امر میں ظہور اول کا ارادہ فرمایا اور وہاں سے عالم شہود میں ظہورِ اتم کر دیا۔ اب ان ہر دو تخلیق یعنی رُوحی و اجسادی کا ذکر قرآن کریم میں اظہر من الشمس ہے جس سے ازلی بدبخت اور شقی تو درکنار ایک لفظ بھی اس قسم کا نہیں پایا جاتا جو یہ ثابت کرے کہ ہم نے روزِ ازل ہی سے کچھ جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے خلقت کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تمام بنی نوع انسان کا ازلی مومن ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی عہد الست کے متعلق فرمایا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ — اور کیا ہے واسطے تمہارے کہ نہیں ایمان لاتے ساتھ اللہ
يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ — کے اور رسول پکارتا ہے تم کو تو کہ ایمان لاؤ ساتھ رب
مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۰ (پ ۲۷) — اپنے کے اور تحقیق لیا ہے قول تمہارا اگر ہو تم ماننے والے

صاف ظاہر ہے کہ اگر تم باور کرنے والے ہو تو یہ حق ہے کہ عالم ارواح میں ہم تم سب میثاق لے چکے ہیں۔ اور یہ تاسف اور تعجب کے رُو سے ارشادِ مبارک ہو رہا ہے کہ "تم کو کیا ہو گیا ہے جبکہ تم روزِ میثاق میں میری وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار کر چکے ہو تو پھر کیوں ایمان نہیں لاتے ہو؟" تو اب نورِ ایمانی سے دیکھنے سے صاف نظر آئے گا کہ اس آیت سے تمام بنی آدم کا ازلی بدبخت

نہیں بلکہ ازلی سعید ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ رہا تخلیق اجسادی یعنی عالم دنیا میں کا ظہور، سو ذرا گوشِ ہوش سے پنبۂ غفلت کو وا کر کے کلام الٰہی کا ارشاد سُن تا کہ یہ عقدہ کماحقہٗ حل ہو جائے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا — پیدائش خدا کی کہ جو پیدا کیا لوگوں کو اوپر اس کے نہیں
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (پ ۲۱) — بدلنا ہے واسطے پیدائش خدا کی کے۔

گو موقع و محل کے رو سے اس خلقت کو میدان دنیا ہی کا شجر کہا جاتا ہے۔ لیکن دراصل یہ فطرتِ انسانیہ عالمِ ارواح ہی سے انسان کے لیے ودیعت کی گئی ہے جو روح اور اس کے اصل کے سوا نہیں ہے۔ یہ وجود محض لباس کی مانند ہے۔ خلقت رُوحی ہو یا جسدی، ہر چند آفرینش میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اصل اور فرع کا سا حال ہے۔ فرع تغیر کا محل ہو سکتا ہے لیکن اصل میں تغیر روا نہیں ہے۔ حدیث شریف اس پر گواہ ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وَ — ہر ایک بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور ماں باپ ہی
اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ — اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں، یا
يُمَجِّسَانِهٖ۔ — مجوسی بنا لیتے ہیں۔

مولیٰ کریم نے انسان کی فطرت اور سرشت کو اپنی صفت سے نسبت دی ہے، اور اس کی خلقت کو دِيْنُ الْقَيِّمُ فرمایا ہے جو مطابق لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ہرگز تبدیل نہ ہوگی۔ اب نورِ ایمانی کی روشنی میں معائنہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس عزیز الحکیم نے انسان کی خلقت کو عین دین بنایا ہے۔ یا اس کی فطرت کو عین دین پہ بنایا ہے۔ تو پھر ازلی بدبخت ہونے کا الزام فطرت، سرشت اور خلقت کی وجہ پر ذوالجلال والاکرام کی طرف منسوب کرنا سوائے خطا

کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور وہ اس لیے کہ آفرینش انسان کی ابتدا عالمِ امر سے ہوئی ہے۔ اور تمام سرشت کا حامل روح ہی ہے جو حیاتی کا اصل ہے۔ عالمِ روحانیت میں میثاق کی رُو سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کی تعلیم وارد ہوئی جس کے جواب میں قَالُوْا بَلٰی کی صدا اقرار کی وجہ پر بلند ہوئی۔ پھر ہر چیز کے روبرو امانت پیش کی گئی۔ سب ڈر گئے لیکن مشیت ایزدمتعال کی یاوری نے اسے اس کے حامل ہونے کی توفیق دی اور یہ بے بہا دولت اسی کے نصیب میں ہوئی۔ بعدہٗ میدان دنیا میں تعلیم وتلقین کے لیے دین الحق کے سمجھانے، صراط المستقیم پر چلانے، ضلالت سے بچانے اور اصل مقصود کو پانے کے واسطے پیغمبروں اور نبیوں کو مرسل کرنے کی سنت جاری کر دی۔ بتوسل ان پاک ہستیوں کے اپنے کلام پاک کا یوں ارشاد فرمایا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ	پس اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت
اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَ	پس جس نے پیروی کی ہدایت میری کی پس نہ گمراہ ہوگا
مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ	اور نہ ایذا کھینچے گا۔ اور جس نے منہ پھیرا یاد میری سے
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	پس تحقیق واسطے اس کے معیشت ہے تنگ اور اٹھائیں گے
اَعْمٰى ۝ (پ ۱۶ ۔ ر ۱۶)	ہم اس کو دن قیامت کے اندھا۔

سب سے پہلے آدم اور بنی آدم کے لیے یہی وحی ہوئی ہے۔ اب غور و فکر سے معلوم کرنا چاہیے کہ جس کی ابتدا ایقان و اقرار اور تصدیق و ایمان پر ہو، اور فطرت و سرشت اس کی دین پر، اور آزمائش کے میدان میں تعلیم اپنے کلام پاک اور صدور اطہر انبیاء سے ہو، اس کے لیے اس تمام سلسلہ کے برعکس بلاوجہ و بلاحجت ازلی بدبختی اور شقی کی نوشت بھی تقدیر کی بساط پر تحریر ہو چکی ہو؟ کتنا

ہی پڑے گا کہ یہ بالکل محال ہے کیونکہ یہ سارے قرآن شریف میں ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کے سوا ایک آیت تو درکنار ایک لفظ بھی بلاحجت کہیں پایا نہیں جاتا۔ اور اس آیت کو بھی ان معنوں پر محمول کرنا مفہوم کی غلطی ہے ورنہ کلام الٰہی میں اختلاف واقع ہوگا جو مطابق فرمان مطلق روا نہیں ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ	کیا قرآن مجید کو غور سے نہیں سمجھتے؟ اور اگر یہ خدا
مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ	کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بے حد
اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (پ ۵ ۔ ر ۸)	اختلاف پاتے۔

قرآن حکیم کے معانی تطبیق کے معیار پر ہی صحیح ہو سکتے ہیں۔ اور یہ معجز نمائی قرآن حکیم ہے اس لیے نفس آیت مبارک میں تحقیق کی بساط پر غور و تعمق سے معائنہ کرنا ازحد ضروری ہے۔

عزیزا! جاننا چاہیے کہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کی علت اور حجت لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا پر ہے۔ اور وہ اس طرح پر کہ جس جگہ لَكُمْ یا لَهُمْ کی ضمیر آتی ہے صلہ اس کا منفعت ہوا کرتا ہے جیسے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا یعنی جو کچھ زمین میں ہے تمہارے لیے ہے۔ یعنی تمہارے نفع کے لیے ہے۔ یا تمہاری خاطر ہے۔ اسی طرح لَهُمْ قُلُوْبٌ ہے کہ واسطے ان کے دل تو ہیں تاکہ ان سے سمجھیں، فائدہ اٹھائیں، ہدایت حاصل کریں لیکن لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وہ اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ اسی طرح لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ہے کہ آنکھیں تو مرحمت فرمائیں لیکن وہ دیکھتے نہیں۔ اور لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا کہ ہم نے ان کو قوت سماعت تو عنایت کی تھی کہ اس سے سنیں لیکن وہ سنتے نہیں۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ وہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ۔ پس ثابت ہوا کہ خلقت اور سرشت

ہیں (روحانی ہو یا جسمانی) ہر فطرت کو ان اوصاف سے مزین فرمایا ہے، ان انعامات سے سرفراز کیا ہے لیکن وہ بمصداق قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ باوجود ان تمام عنایات کے ناشکری میں گرفتار ہو گئے۔ دل رکھتے تھے مگر نہ سوچا۔ آنکھوں والے تھے مگر اندھا رہنا پسند کیا۔ ان کے کان تو تھے مگر جان بوجھ کر نہ سُنا۔ تو مطابق أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ اس غفلت کے باعث از روئے عزت بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ کی وجہ پر نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ کے رُو سے تصرف اضافیہ کے تحت میں ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ کے مستحق ہوئے:

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (پ ۱۱) — اسی طرح ثابت ہوئی بات پروردگار تیرے کی اوپر ان لوگوں کے جو فاسق ہوئے۔ یہ کہ وہ نہیں ایمان لائیں گے۔

بات ان پر ختم ہو گئی، حجت اپنے اتمام کو پہنچی، ہمیشہ کے لیے دوزخ ان کے نصیب کر دی گئی، لیکن یہ الزام اس ذات پاک پر کہ ازل ہی سے وہ جہنم کے لیے پیدا کیے گئے، مطلق روا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ذَرَأْنَا اور خَلَقْنَا میں بہت بڑا فرق ہے۔ جس کا کسی قدر ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ اب (وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ) اس کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ وضاحت کی جاتی ہے تاکہ یہ اشکال کماحقہٗ حل ہو جائے۔

اے عزیز! اوپر گذر چکا ہے کہ کسی چیز کا عدم سے ظہور خلق کی تعریف ہے اور باوجود خلق ہونے کے ذُرِّيَّة کی تعریف اولاد ہے۔ جیسے فرمایا: مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ۔ جو خَلْقًا آخَرَ کے مترادف ہے۔ خلقت، سرشت اور فطرت میں تو مطلق فرق نہیں ہے۔ فرق اس خلقت اور ذریت میں صرف اتنا ہے

کہ ذریت جو بمنزلہ اولاد ہے، تمام اثرات (تخمی، صحبتی، کسبی، ملکی) سے از حد متاثر ہے۔ گو تمام اثرات کا حامل ہونا انسان اور اس کے اصل کے سوا نہیں ہے۔ یعنی اس کی خلقت اور سرشت اس عزیز الحکیم نے بیحد اثرات کے قبول کرنے والی بنائی ہے۔ تاہم یہ صورت ذاتیہ ہے۔ اور ذریت کے لیے ذاتیہ اور اس پر خارجی اثرات کا غلبہ از حد مسلمہ امر ہے۔ مثلاً ہندو کا بچہ اپنے والدین کے دین پر بلا ارادہ ہندو ہوا کرتا ہے، یہودی کا یہودی، نصرانی کا عیسائی اور بُدھ مذہب کا بدھو۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ گو یہ قاعدہ کلیہ نہیں تاہم اکثریت اسی پر ہے اور حکم اکثر پر ہوا کرتا ہے۔ بعض تو صحبت (نیک یا بد) سے متاثر ہو کر بالکل ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ بمصداق ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبتِ طالح ترا طالح کند

صحبت کا درک اس قدر غالب ہے کہ بعض اوقات تخمی اثرات پر بھی غلبہ پا جاتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

پسر نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد

سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے مرداں گرفت مردم شد

نیز ملکی اثرات کئی وجہ پر ہیں۔ لیکن اس جگہ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ مختلف زبانوں اور رنگوں کا فرق فی القرآن المجید:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ — اور نشانیوں اس کی سے ہے پیدا کرنا آسمانوں کا اور

وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۚ — زمین کا اور اختلاف بولیوں تمہاری کا اور رنگوں تمہارے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ ۝ (پ ۲۱۔ ۶) — کا تحقیق بیچ اس کے البتہ نشانیاں ہیں واسطے عالموں کے۔

بالکل عیاں ہے جو مختلف ملکوں کی بود و باش کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

رہا کسبی، تو یہ دراصل تخمی اور صحبتی اثرات ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جس کے بیان میں بہت طول ہے اور تفصیل کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے جو اس جگہ مقصود نہیں ہے۔ اس لیے یہاں صرف حصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان ما خذ فی الضمیر کے سوا کچھ کر نہیں سکتا اور جو فعل اس سے سرزد ہوتے ہیں انہی کا بندہ ہوا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ آہستہ آہستہ میدانِ آزمائش میں اس کی عادت ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے ـــــ آمدم برسرِ مطلب ـــــ بریں وجہ نیک ہو یا بد، مسلم ہو یا کافر، مومن ہو یا منافق، اس کی فطرت میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اگر اس کی فطرت راستی پر صراط المستقیم کو حاصل کر کے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ کی سعادت سے فائز ہوئی، اور اس رحیمؒ و دود نے اس کی یاوری کی تو وہ مقصود سے مسرور ہوئی اور قربِ خداوندی، مشاہدۂ الٰہی اور لقائے نامتناہی سے محظوظ کر دی گئی اور فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا کا مژدہ اس کے لیے مبارک باد دینے والا ہوا۔ اور جن بدبختوں کی سعی ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے مطابق دنیا میں گمراہ ہو گئی، بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے رو سے ان کو بُعد اور حجاب میں مبتلا کر دیا۔ یا دوسرے لفظوں میں انھوں نے وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ کے موافق خود یہ مقام حاصل کر لیا۔

یاد رہے کہ ان ہر دو مقامات (اعلیٰ اور اسفل) میں فطرت کی رُو سے کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی ہے۔ صرف بُعد و قُرب کا معاملہ ہے۔ حجاب اور مشاہدہ کا سا حال ہے۔

حجاب سراسر جہنم کا اصل ہے۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (پ۳۰۔ ع۷) — ہرگز نہیں یوں، یقیناً وہ اپنے پروردگار سے اس دن البتہ حجاب میں ہوں گے۔

سب عذابوں کا اصل، سب نعمتوں سے محرومی اور سب مصائب کی جڑ ہے۔ اور قُربِ الٰہی مشاہدۂ لامتناہی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ اور وہ اس لیے کہ انسان کا معاملہ اپنے رب کریم کے ساتھ محبت کا ہے۔ کلام الٰہی اس پر شاہد ہے۔ اور محب کے لیے اپنے محبوب کے حجاب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہوتا۔

اس سارے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ خلقتِ انسانیہ بمنزلہ جبریہ کے ہے۔ یعنی اس میں کسب کو کسی قسم کا مطلق دخل نہیں ہے۔ اور ذَرَاْنَا انسانی تصرف کے سوا نہیں ہے۔ اور ذَرَاْنَا صرف اولاد کے لیے مخصوص نہیں بلکہ زراعت وغیرہ بھی اس میں شامل ہے چنانچہ قرآن مبین میں فرمایا ہے:

(۱) وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا (پ۸۔ ع۳)

(۲) وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (پ۱۴۔ ع۸)

(۳) وَهُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (پ۱۸۔ ع۵)

تو اس سے یہ مقصود حاصل کرنا ضروری ہے کہ جس طرح زمین میں بیج بونے سے بحکم خدا اور تصرف و قدرت خداوندی سے اگتا اور بار آور ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ انسانیہ یعنی زمین قلب میں بھی جو تخم بویا جاتا ہے وہی نشو و نما پاتا ہوا ثمر تک پہنچ جاتا ہے۔ بمصداق ؎

از مکافاتِ عمل غافل مشو — گندم از گندم بروید جو ز جو

تو خواہ زمین قلب ہو جو عالم مثال کے مترادف ہے یا ارض الدنیا ہو جو عالم شہود یعنی موجودات میں سے ہے، ہر دو کی خلقت میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ ہاں تجربہ سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اچھی اور شیریں زمین جب کسی عارضہ (مثلاً سیم وغیرہ یا کسی اور وجہ) سے کڑوی ہو جاتی ہے تو اس میں خود بخود بلا تخم ایسی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ کڑوی اور نمکین جڑیاں مثلاً لانی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عالم مثال کے میدان میں یا مملکت انسانیہ کی زمین قلب میں بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کے عمل نیک یا بد کی وجہ سے ایمان یا کفر کا شجر پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے ثمر تک پہنچ جاتا ہے۔ بایں ہمہ غور و تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خلقت یا فطرت میں تو کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا، محض کسب کی رو سے قُرب اور بُعد کا باعث ہو گیا جس سے ایمان اور کفر کے ماتحت مومن اور کافر بن کر جنتی اور جہنمی ہونے کا مستحق ہوا جس کی علت سراسر کسب اور عمل ہی ہے۔

سوال: اس میں کلام نہیں کہ ظہور کے میدان میں علت عمل نیک و بد ہی ہے لیکن ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ یعنی پیدا کیا ہم نے اکثر جنوں اور انسانوں کو واسطے جہنم کے کسب اور عمل سے مبرا ہے۔ بلکہ نا کی ضمیر سے مولیٰ کریم نے اسے اپنے فعل کی طرف منسوب فرمایا ہے

جواب: اوپر گذر چکا ہے کہ خَلَقْنَا اور ذَرَأْنَا میں بڑا فرق ہے۔ خَلَقْنَا محض تصرف الٰہی سے ہے اور ذَرَأْنَا کسب انسانی سے۔ رہا یہ کہ اس کی نسبت اس خالق حقیقی نے اپنی ذات کی طرف رکھی ہے اور یہ بالکل بجا و درست بلکہ حق ہے لیکن

یہ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کے مطابق بلا حجت نہیں ہے۔ جیسے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کی نسبت تو فاعل حقیقی کی طرف ہے اور حجت اس کی اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے۔ اسی طرح لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کی نسبت تو قادر مطلق کی طرف ہے۔ لیکن بموجب وعدہ روز ازل پیروی ابلیس کما قال اللہ تعالیٰ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ حجۃ بالغۃ اظہر مِنَ الشَّمْس ہے۔ نیز نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ دست قدرت کے تصرف کے سوا نہیں جو سراسر فاعل حقیقی کے فعل کے مترادف ہے لیکن حجت اس کی مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ ہے جو بالکل عیاں ہے۔

خبردار ہونا چاہیے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ اس بات پر شاہد ہے کہ مولیٰ کریم نے انسان کو دین القیم پر خلقت فرمایا ہے کسی کو ازلی بدبخت نہیں بنایا ہے۔ ورنہ اس آیت کریمہ کا فائدہ نہیں رہتا ہے۔ گو سنت الٰہی کے مطابق نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کی بساط پر غضبی صورت کا تصرف ظہور پذیر ہے جو سراسر غیرت کی بنا پر بُعد و قرب کا باعث ہے تاہم فطرت یعنی خلقت لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کے موافق تغیر و تبدل کا متقضی نہیں ہے۔ اسی طرح لَقَدْ ذَرَأْنَا بھی ہے جس کی علت لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا اور لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ہے۔ قُلُوْب وَاَعْيُن اور آذان خلقت کے مترادف مذکور ہے اور غفلت بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ کی وجہ پر اس سے محروم رہنا ذَرَأْنَا کے موافق ہے جو سراسر کسب اور عمل بد کے مطابق ہے۔ گو نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کی زیر دست سنت کے موافق اس فاعل حقیقی کے سوا نہیں ہے لیکن فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کے مطابق یہ سراسر کسب ہی کا نتیجہ ہے۔ اور جو حدیث

شریف میں دو کتابوں کا ذکر ہے جن میں اہل دوزخ اور اہل جنت کے نام درج تھے۔ اس کا بیان پہلے "تقدیر انسان" اور "قضا و قدر" کے عنوانوں کے تحت میں گزر چکا ہے۔

حَلف بالقرآن

یہ امر مسلمہ ہے کہ سوائے ذات ذوالجلال والاکرام کے کسی مخلوق کی قسم اُٹھانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی ایسی قسم کا کفارہ ہے۔ کیونکہ حلف جو بمنزلہ ضمانت، ہیبت اور شہادت کے ہوا کرتی ہے بغیر اللہ جلّ شانہٗ کے کوئی اس لائق نہیں ہے۔ وہی خالق موجودات مالک کائنات، وارث زمین و آسمان ہے۔ جس کے یدِ قدرت میں ہر مخلوق کا نفع و زیان ہے۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کی شان اسی کو زیبا ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو یہ طاقت اور قدرت نہیں اس لیے کوئی مِنْ دُوْنِ اللّٰہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی حلف اُٹھائی جائے۔ لیکن سوال حلف بالقرآن کا ہے جس کے غیر مخلوق ہونے پر اتفاق ہے۔

بعض اس کے مخلوق ہونے کے قائل ہوئے اور خلیفہ مامون رشید کے وقت میں یہ مسئلہ کافی سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ بلکہ غیر مخلوق کہنے والوں کو سخت سزاؤں کا متحمل ہونا پڑا گو یہ مسئلہ غیر ضروری اور عمل کے میدان میں بے معنی خیال کیا جاتا ہے جس کی تفصیل لاحاصل اور عوام الناس کے لیے فائدہ سے زیادہ نقصان کے خطرے کا باعث ہے۔ لیکن علمائے دین اس بنا پر کہ اعتقاد کے تالاب میں یہ تھوڑی تھوڑی [illegible] ایک دن اسے متعفن کر دے گی جو

سے یہ مخلوق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب کلام کا ظہور نہ تھا تو وہ ذات باری تعالیٰ کے علم میں متحقق تھا جب ظہور کا ارادہ فرمایا اور اپنے علم کو کلام پاک کا لباس پہنانا چاہا، تو اس کو لوح محفوظ کی طرف منسوب فرمایا۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ عالم امر کے متعلق ہے جو موجودات فی السموات والارض سے بدرجہا بالاتر ہے۔ لوح لغت میں پین یا تختی کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ پین یا تختی عقل کے تصور اور احاطہ میں ہرگز نہیں آسکتی۔ کیونکہ عقل کا ادراک عالم محسوسات و معلومات تک ہے، عالم معروفات جو عالم امر سے وابستہ ہے، عقل و ادراک اس سے جاہل ہے۔ اس لیے عالم معلومات میں اس کو صرف مثالی صورت سے سمجھ لینے کے سوا چارہ نہیں۔ اور وہ اس طرح پر ہے کہ انسان کا قلب جو روح کا مرکز ہے (جس کو امر الٰہی سے تعبیر کرنے میں کلام نہیں) اس کے ارادہ سے کلام الٰہیہ کو اخذ کر کے قوت حافظہ کے سپرد کر لینا بمنزلہ لوح محفوظ کے ہوتا ہے۔ اب وہ حافظ قرآن جو الٓمٓ سے وَالنَّاس تک کا حامل ہے، جس کے سینے میں تمام قرآن مجید محفوظ و مصئون ہے، جہاں سے چاہے اس لوح محفوظ سے بغیر ان ظاہری آنکھوں کے بصارت روحی سے پڑھ کر سنا سکتا ہے، اور اس کے لیے حروف و الفاظ اور شکل و صورت عبارت کی احتیاج نہیں ہوتی۔

لیکن اس مثال سے یہ بیّن فرق معلوم کرنا لازمی ہے کہ وہ لوح محفوظ کسی دل، دماغ یا حفظ کی محتاج نہیں۔ محض عالم امر میں جو اس قادر مطلق کے ارادہ پر منحصر ہے، بلا کسی قیود و حدود کے نوری لباس میں کلام نفسی کے مدارج و مراتب پر متعین ہوتی ہے۔

پھر جب اُس لم یزل ولایزال نے اپنے کلام پاک کو عوام کی فہمائش کے لیے ظاہری لباس میں مزیّن فرمانے کا قصد فرمایا تو رُوح الامین کے توسّل سے قلب اطہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نازل فرمایا۔ تب وہ کلام اللہ لحن وصَوت کے تغیّر و تبدّل سے قرات کے مدارج پر حروف والفاظ کی شکلیں اختیار کرتا ہوا عبارت کی صُورت میں الواح وقرطاس یا چمڑے وغیرہ پر منقوش ہو کر قرآن مجید کے اسم سے موسوم ہوا۔ اب اس قرآن مجید کو محض مصحف یا مخلوق تصور کرنے والے کو ذرا نور ایمانی سے موازنہ کرنا لازم ہے کہ گو لوح محفوظ پر یا وہاں سے قلب اطہر انبیا پر بحکم خدا القا ہوتا رہا، الفاظ وعبارت سے مبرا ومنزّہ ہے لیکن کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (خواہ نوری ہو یا بشری) کا ارشاد اظہر من الشمس ہے۔ خواہ وجود نوری ہو خواہ اجسادی، قرأت وکتاب کی نفی کسی حالت یا صورت میں نہیں ہوسکتی۔ دیکھو ارشاد مولیٰ کریم:

وَالطُّوْرِ ۙ وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ (پ ۲۷ ۔ ع ۲) — قسم ہے طور کی، اور کتاب لکھی ہوئی کی۔ بیچ جھلی کھُلی ہوئی کے۔

اس کتاب اور سطروں کے متعلق (جسے قرات کا محل ہی کہا جائے گا) فرمان ہو رہا ہے:

سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی ۙ (پ ۳۰ ۔ ع ۱۱) — شتاب پڑھائیں گے ہم تمہیں کہ تم کبھی نہ بھولو گے۔

تو یہ کلام اللہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، علیم خبیر ذوالجلال والاکرام کے علم کل سے لوح محفوظ کی طرف اور وہاں سے قلب اطہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا ہوا حروف والفاظ کی شکل اختیار کر کے میدان قرطاس میں قرآن کے اسم سے موجودہ صورت میں آج ہمارے روبرو ظاہر ہے۔ جس کے لیے ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ کی

ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے، دین حق کی آواز کو بلند کرتے ہوئے تحقیق کے میدان میں اُتر آئے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ اعلائے کلمۃ اللہ کے "جرم" کی سزا میں سخت ترین تکالیف کو آب حیات سمجھتے ہوئے سختی کے پیمانہ میں صبر واستقلال کے ساتھ پی گئے۔

آج یہ مسئلہ غیر ضروری کا پہلو بدلتا ہوا سخت اشکال کو اپنے دامن میں اُٹھائے ہوئے بحث کے میدان میں حق کا طالب ہے۔ گو اس میں نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ کلام کرنا غیر مفید نہیں لیکن جس مرض کے علاج میں نمک اجوائن ہی کفائت کر سکے اس کے لیے مرواریدحل کرنا لایعنی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس بیان میں میرا مذہب نہایت اختصار کے ساتھ ہے۔

تعریف مخلوق: مخلوق وہ ہے جو ارادہ الٰہی کے امر سے ہویدا ہو۔ یعنی کُنْ سے فَیَکُوْنُ کا لباس پہنے اور حدث کا وجود اس پر ثابت ہو۔ اور یہ صفات قدیمہ کے فعل کا ظہور ہے جیسے کُنْ امر، فَیَکُوْنُ فعل۔ اور یہ صفت بالفعل مولیٰ کریم ہے جس کا ثبات امر کے تابع ہے۔

تعریف غیر مخلوق: غیر مخلوق وہ ہے جو حُدوث سے پاک ہو، وجود کی قیود سے مبرا ومنزّہ ہو اور کسی امر الٰہی کے فعل کے ظہور کا مظہر نہ ہو۔ یعنی کُنْ سے فَیَکُوْنُ کے محل کا مترادف نہ ہو — تو یہ صفات بالذات مولیٰ کریم ہی ہیں، جو سوائے ذات ذوالجلال والاکرام کے کوئی مبدا نہیں رکھتیں۔ بلاواسطہ کسی تحریک کے صفات بالذات ہیں۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک خالق اور ایک مخلوق، اب یہ ایک تیسری چیز کا اثبات کن معنوں میں ہے؛ کیونکہ یہ محال ہے۔ شرح عقائد نسفی میں ہے کہ:

لِاَنَّ الصِّفَاتِ لَیْسَتْ عَیْنًا وَّلَا غَیْرًا — یہ صفات نہ غیر ذات ہیں اور نہ عین

دراصل نصاریٰ کے عقائد کے خلاف یعنی تثلیث کو رد کرنے کے لیے اور صفات کو عین ذات قرار دینے اور تعدد کے خوف سے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمیز کے میدان میں بلاوجود اس برزخ کو روا رکھا ہے جس سے مقصود اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ کی ذات احد کے ان صفات کو متصف کے معنوں پر بیان کرنا ہے۔ اسی لیے فرمایا ہے کہ یہ اس کے غیر نہیں ہیں۔ گویا عین ذات ہی ہیں جو بلا تقسیم و تقطیع ذات سے متصف ہیں۔ اور وہ سات ہیں: حیّ، قدیر، مرید، کلیم، سمیع، بصیر، علیم۔ ان صفات ذاتیہ کا فعل سرزد ہو یا نہ ہو کسی حال اور کسی صورت میں یہ ذات بابرکات سے منفصل اور معدوم نہیں ہو سکتیں۔ جیسے حیات کو حی سے، قدرت کو قدیر سے، ارادہ کو مرید سے، کلام کو کلیم سے، سماعت کو سمیع اور بصارت کو بصیر سے ایسا تعلق ہے جو کسی زمانہ میں نہ منفک ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ان صفات ذاتیہ کو ذات سے ایسا واسطہ ہے کہ گویا یہ عین ذات ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ قرآن شریف کے کاغذ، قلم، دوات، کاتب، سب کے سب مخلوق ہیں۔ اور یہ کلام اللہ کی صحت اور ظہور کے اسباب ہیں نہ کہ کلام۔ کیونکہ اسباب بمنزلہ فرع کے ہیں اور کلام اصل۔ ہر فرع اصل کی طرف راجع ہوا کرتا ہے جو اصل کے سوا نہیں ہے، اور اصل فرع کے سوا ہو سکتا ہے۔ فرع اختلاف کا محل ہے اور اصل میں اختلاف روا نہیں ہے۔ جیسے ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ (پ ۱۹ ع ۱۵) اترا ہے ساتھ اس کے روح الامین (جبرئیل) تیرے دل پر

اور اس نزول کے ظہور کے اسباب مختلف ہیں۔ مثلاً عربی، عبرانی اور سریانی مختلف زبانیں۔

گو مثالیں یہاں بیگانگی ہیں اور اس بے مثال لم یزل ولا یزال کی ذات اور صفات کے لیے کوئی مثال درست نہیں آ سکتی لیکن فہمائش کے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے۔

چنانچہ ارشاد مولیٰ کریم:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (پ ۲۶ ع ۱۸) اور بیچ زمین کے نشانیاں واسطے یقین کرنے والوں کے۔ اور بیچ جانوں تمہاری کے کیا پس نہیں دیکھتے تم؟

اظہر من الشمس ہے جس میں نشانات الہیہ کو خداوند کریم نے دو حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ حصہ اول موجودات فی الارض میں، اور دوسرا خود انسان کی ذات میں۔

(۱) دیکھو، پانی ایک اصل ہے۔ عربی میں مآء کہلاتا ہے، فارسی میں آب، انگریزی واٹر، اور پنجابی پانی، علیٰ ہذا القیاس۔ یہ اصل کے مختلف لباس اور وجود ہیں جو علم و عرف کے لیے پہنائے گئے ہیں۔ ہر ایک کی شکل و صورت مختلف ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتی لیکن اصل ایک ہے جس میں اس اختلاف سے کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کا کسی عارضہ کی وجہ سے شکل تبدیل کرنا مثلاً حرارت پہنچنے کے سبب سے بھاپ بن جانا اور بخارات کا آسمان کی طرف چڑھ کر بادل کی شکل اختیار کرنا اور پھر سردی پہنچنے سے مینہ بن کر اپنی اصلی حالت پر لوٹنا، یہ تمام منازل و مدارج اصل معانی کے خلاف کے مقتضی نہیں ہو سکتے۔

(۲) اسی طرح نشانات الہیہ سے فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ کے مطابق جو صفات ذات انسان میں موجود ہیں، ان سب صفتوں اور طاقتوں کا اصل روح ہی ہے۔ اسی کی طاقت سے سماعت و بصارت، حیات و تکلم، علم و ارادے اور قدرت رکھتا ہے۔ جو اپنے اپنے محل پر كُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ کی صفت پر کام کرتے ہیں۔ جب بحکم خدا روح پرواز کر جاتی ہے تو یہ تمام افعال فوت ہو جاتے ہیں، آلات جتنی رہ جاتے ہیں جو وجود میں بمنزلہ فرع کے تھے۔ لیکن اصل جو

رُوح تھی، اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کی صفات (سماعت و بصارت وغیرہ) کی تقسیم و تقطیع باقی رہ جاتی ہے۔ گو دوسرے وجود یعنی عالم روحانیت میں تقسیم و منازل درست ہیں لیکن اس مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔ تاہم ہر وجود اجسادی و روحی کے مدارج و منازل کا محل فرع ہی ہے، نہ کہ اصل۔ اصل کے لیے صفات کی تقسیم محال ہے۔ ورنہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے جواب میں قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا فرمان صادر نہ ہوتا۔ ان تمام مدارج روحی و اجسادی پر انسان ہی کا لفظ بولا جاتا ہے جو ہر وجہ اصل کے تابع ہے۔ یعنی وجود کو رُوح سے، فرع کو اصل سے، عرض کو جوہر سے، مفصل کو مجمل سے، اسم کو مسمّٰی سے، تلفظ کو معنٰی سے، ظہور کو بِسِرّ سے، اور دائرہ کو مرکز سے ایسا اتحاد ہے جس کی تمیز کسی حالت میں انفصال اور انقطاع نہیں رکھتی۔

عام فہمائش کے لیے جہان بھر میں بے شمار مثالیں موجود ہیں صرف گوش ہوش اور چشم بینا درکار ہے۔ مثلاً ہر ایک پودے کا اصل اس کا تخم ہے، جو وجود اور روح رکھتا ہے۔ اور اس میں پودا اپنی ہر شکل رکھتا ہوا نظروں سے مستور ہے۔ جب بحکم خدا تعلق ارضی سے نشوونما کے تغیر سے ظہور کی طرف مبذول ہوتا ہے تو اپنے برگ ٹہنیوں، پھول اور پھل کا حامل ہو جاتا ہے۔ جڑ سے لے کر پھل تک روح اور اس کے ہر وجود کا تعلق ایسا بلا فصل ہوتا ہے جس کی تمیز محال ہے۔

اسی طرح کلام الٰہی جو بلا واسطہ محض صفات ذاتیہ ذوالجلال والاکرام سے ہے اور وجود کلام یعنی قرآن شریف میں تفریق محال ہے۔ اور نہ ہی کسی صورت اور شکل اختیار کرنے

شہادت اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا کافی ہے۔ مزید تصدیق کے لیے دوسری جگہ مفصل ارشاد کس کر و فر سے حق کا اظہار فرما رہا ہے:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ — اور اگر قرآن ہوتا کہ چلائے جاتے ساتھ اس کے پہاڑ
اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ — یا کاٹی جاتی ساتھ اس کے زمین یا بلائے جاتے ساتھ
الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ — اس کے مُردے تو بھی ایمان نہ لاتے۔ بلکہ واسطے اللہ
(پ۱۳ - ع۱) — کے ہے حکم سب۔

تو جو شخص حلف بالقرآن اُٹھاتا ہے اس کا مدعا ان تختیوں، کاغذوں اور حروف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اصل کلام اللہ کی حلف دیتا ہے نہ کہ محض فرع کی۔ اگر اس حلف سے الفاظ و حروف یا اسباب ظہور قرآن شریف کے وجود کی قید لازم آتی ہے تو جو شخص اللہ جل شانہٗ کی حلف اُٹھائے، اندریں صورت چاہیے کہ اس کا مدعا بھی اسی اسم معلّٰی کے حروف تک محدود تصور کیا جائے جو الف، لام اور ہا کے حروف سے مرکب ہو کر لفظ کا لباس پہنے ہوئے صفحہ قرطاس پر منقوش ہے۔ جو عین ذات ذوالجلال والاکرام نے عرف اور ظہور اسم ذات کے لیے اسباب مرتب فرمائے ہیں اور جن میں مدعا صرف صحت صوت اور ثبات اسم ذات ہے۔ کہ سب مخلوق ہی ہیں۔ اور اگر اسم اور عبارت کی تخلیق محض ثبات ذات بابرکات کے لیے سمجھی جائے تو اختلاف اُٹھ جاتا ہے۔

سوائے اسم ذات کے صفاتی اسماء مثلاً رحمٰن، رحیم، کریم بلکہ تمام اسماء الحسنیٰ جو ہر ایک صفت فعلیہ سے موصوف ہیں، سب صفات ذاتیہ مثلاً قدرت اور ارادہ کے ظل کا ظہور ہیں۔

جو اصل ذات ہی ہیں اور اسی کے تابع امر ہیں۔ گو صفات فعلیہ کا تعلق بھی صفات ذاتیہ سے اتصال عینی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ صفات فعلیہ کا مبدا صفات ذاتیہ سے وابستہ ہے۔ اور صفات ذاتیہ کا ذات سے ایسا اتصال ہے جو کسی واسطہ کا محتاج نہیں۔ لہٰذا کلام اللہ تعالیٰ کو ذات پاک سے ایسی معیت ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ۔ اس لیے حلف بالقرآن یعنی حلف بالکلام (جو عین صفات ذاتیہ کے ساتھ متصف ہے) حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی حلف ہے۔ جس میں شک کرنا یا کلام اللہ کو مخلوق جاننا سراسر نادانی ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ سُوْٓءِ الْاِعْتِقَادِ۔ بقول شخصے ؎

صفات را بہر ذات می جویم ذات را بہر صفات می جویم

جو شخص کلام ذوالجلال والاکرام کو ماسوی اللہ جانتا ہے وہ کلام اللہ کے مخلوق ہونے کا قائل ہوتا ہے۔ صفات ذاتیہ اور ان کے اصل کو نہیں پہچانتا اور محض اسباب ظہور پر نظر رکھتا ہوا اصل ذات سے جاہل ہوتا ہے۔ وہ ذات تعلّی ان حدوث سے پاک ہے مع اپنی تمام صفات کے جن کی صفتیں کسی کی مانند نہیں ہیں۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ اور جو کچھ کوئی کم فہمی کی وجہ سے اپنی عقل و سمجھ کے ترازو سے موازنہ کرتا ہے، وہ ذوالجلال والاکرام اس سے پاک اور بلند و برتر ہے۔ سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۔

کتبہٗ العبد المذنب، راجی الرحمۃ محمد یوسف کاتب، کان اللہ لہٗ

ساکن حضرت کیلیانوالہ۔ ضلع گوجرانوالہ۔ ۲۱ مارچ ۱۹۵۳ء

خاتمہ

الحمد للہ والمنۃ کہ آج "الانسان فی القرآن" کی کتابت کو ختم کر کے اپنے اس اہم فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں ——— !

عام قاعدہ کے مطابق مقدمہ اور خاتمہ مصنف خود ہی لکھتا ہے، لیکن اس متبرک کتاب کی یہ سعادت بھی میرے ہی حصہ میں آئی ہے ——— جیسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں لکھا کیا جاتا ہے۔ بہر کیف کتاب کو آپ نے پڑھ لیا اور تمام مضامین آپ کی نظر سے گذر چکے، اور جو اثر انہوں نے آپ کے دل پر چھوڑا اسے آپ ہی خوب جانتے ہیں ——— "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ——— تاہم امید ہے کہ غور و تعمق سے مطالعہ کرنے والے صاحب ایمان احباب کے لیے بہت حد تک باعث رشد و ہدایت ثابت ہوں گے۔ ورنہ کلام الٰہی کے فیصلہ کے مطابق فاسق طبیعتیں اور زیغ رکھنے والے دل تو قرآن مجید کی آیات سے بھی بجائے فائدہ اور ہدایت کے اُلٹا نقصان اور گمراہی حاصل کرتے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا ۭ وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۔

اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس مرض سے محفوظ رکھ کر نیک سمجھ عطا فرمائے، اور اپنے ارادہ خیر سے صراط المستقیم پر چلنے کے لیے سب کا سینہ کھول دے ——— آمین

میں نہیں کہہ سکتا کہ مضامین کی ترتیب میں میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔ بہرحال اپنی طرف سے میں نے ان میں ربط اور تسلسل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور آخری حصہ جس کو الٰہیات کا عنوان دیا گیا ہے، اگر حضور رحمۃ اللہ علیہ اپنے دست مبارک سے ان کی ترتیب و تدوین فرماتے تو شاید کسی طریقہ سے اس کو کتاب میں مدغم کر لیتے، لیکن مجھے اس کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا کہ ان کو الگ عنوان کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر ملحق کروں۔ اس لیے اگر اس بارہ میں مجھ سے کوئی سہو ہوئی ہو تو برادران طریقت اور اہل علم حضرات فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اس سے درگذر فرمائیں۔

شروع کتاب میں حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے فرمایا تھا کہ چند صفحات الحمد شریف کے لیے چھوڑ دیں۔ میں نے دس صفحے چھوڑ دیے اور اپنے خیال میں ان کو کافی سمجھا۔ لیکن مجھے مزید ۱۲ صفحات ان کے ساتھ شامل کرنے پڑے جن پر ا، ب، ج، د کے نمبر دیے گئے ہیں، اور یہ بھی ایک سہو ہے۔

آپؒ اپنے دنیا کے بالکل آخری ایام میں بستر علالت ہی پر انتہائی کرب و تکلیف کے باوجود مولوی غلام رسول صاحب کو الحمد شریف کی مختصر تفسیر لکھاتے رہے اور اس طرح سے اپنے آخری وقت تک حتی المقدور تبلیغ دین کے فرض کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ابھی آپؒ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پہنچے تھے کہ مالک الملک جلّ و علیٰ نے اپنے پاس بُلا لیا ـــــ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ـــــ لیکن آپؒ کی یہ تبلیغ دین ظاہراً و باطناً دونوں طریق سے جاری ہے اور یہ کتاب مبارک آپ کی تبلیغی مساعی کا ایک شعبہ ہے، جو ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا اور جویانِ حق کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ برادرانِ طریقت کے لیے یہ کتاب ایک بے بہا مشعل ہدایت ہے اور ایام گذشتہ کی بہترین یادگار۔

ایک خیال یہ تھا کہ الحمد شریف کو جہاں آپؒ نے چھوڑا ہے وہیں تک رہنے دیا جائے اور آپؒ کی تحریر میں کسی قسم کا تصرف نہ کیا جائے۔ اور بعض احباب کا خیال یہ تھا کہ یہ ایک نقص ہے جس کی تکمیل ضروری ہے ـــــ لیکن یہ اب کیسے ہو؟ ـــــ بالآخر برادر محترم سید منیر حسین شاہ صاحب نے (جو حضور رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے برادران طریقت میں سب سے زیادہ محظوظ ہوئے) کسی قلبی اشارے سے اس کو پورا کر دیا اور بقول ان کے یہ حضورؒ ہی کے تصرف رُوحانی کا نتیجہ ہے ـــــ دیکھ لیجیے! وہی طرز تکلم ہے اور وہی انداز بیان!

سید ممدوح نے حضور رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کا مسودہ بھی مکمل کر لیا ہے اور میں خدا کے فضل سے اُمید رکھتا ہوں کہ ۱۰ ربیع الاول یعنی حضورؒ کے ختم شریف کے موقعہ پر کتابی صورت میں برادران طریقت کی تسکین قلب کا سامان لیے ظہور میں آجائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

اخیر میں میں سب برادران طریقت کی طرف سے برادرم ابو فضل قادر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مالی اعانت نے یہ گوہر بے بہا اور رشد و ہدایت کا مرقع جلد از جلد ہمارے ہاتھوں میں پہنچایا اور اس معاملہ میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور اپنے مقصود پر پہنچائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار محمد یوسف گیلانی عفی عنہ